آپ کا اختر شیرانی

مرتّب
محمد اکرم سعید

Book Name: Aap Ka Akhtar Sherani
Compiled by: Muhammad Akram Saeed
Phone # 0335-4921473
Co-ordination : Rifat Saeed, Sadia Zafar
Arranged by: Waleed Ahmad. Waqar Ahasan, Abdullah
Composed by: Ashraf Naqvi, Phone # 0345-6352439
Publishing year: 2024

نام کتاب : آپ کا اختر شیرانی
مرتّب: محمد اکرم سعید
فون نمبر: 0335-4921473
معاونت: رفعت سعید، سعدیہ ظفر
اہتمام: ولید احمد، وقار احسن، عبداللہ
اشاعتِ اوّل: 2024ء
کمپوزنگ و سرورق: اشرف نقوی، فون نمبر: 0345-6352439
تعداد: 500
قیمت: 1200/- روپے

اختر شیرانی پر لکھے گئے خاکے

تحقیق، تجزیہ، متن

اپنے چھوٹے بھائی

خالد جاوید سلیمی

اور جواں سال بھتیجے

محمد طیب ایڈووکیٹ مرحوم

کے نام

تمہارے بغیر زندگی آہ وفغاں کے سوا

کچھ بھی نہیں

آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

میری داستانِ حیات

اختر شیرانی

ستاروں کی کہانی کہیے، خوابوں کا بیاں لکھیے
وہ کہتی ہیں کہ اپنی زندگی کی داستاں لکھیے
ہماری زندگی نیرنگیٔ عالم کا منظر ہے
کبھی آرامِ دل کہیے، کبھی آزارِ جاں لکھیے
چمن میں برگِ گل پر قطرۂ شبنم جو لرزاں ہے
اسے پیشِ نظر رکھیے، ہماری داستاں لکھیے
کبھی ہر سانس کو اِک نکہتِ آبِ بقا کہیے
کبھی ہر لمحے کو پیغامِ مرگِ ناگہاں لکھیے
کبھی خوابِ زُلیخا کہیے ہر شب کے نظارے کو
کبھی افسانۂ یوسف بدستِ کارواں لکھیے
کبھی پھولوں کی سیجوں کو ہمارا دردِ سر کہیے
کبھی جنگل کے کانٹوں کو ہمارا آشیاں لکھیے
کبھی ہر لمحۂ غم کو خلاصہ کہیے دوزخ کا
کبھی ہر فرصتِ رنگیں کو عمرِ جاوداں لکھیے
کبھی بیگانگیٔ دَیر و کعبہ کا بیاں کیجئے
کبھی افسانۂ رسوائی کُوئے بتاں لکھیے

کبھی شادابیٔ گُل ہائے نَو کا تذکرہ کیجئے
کبھی افسانۂ بربادیٔ برگِ خزاں لکھیے

کبھی پریوں کے سینوں کو ہمارا راز داں کہیے
کبھی حوروں کے ہونٹوں کو ہمارا ہم زباں لکھیے

کبھی سلمیٰ کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجئے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشقِ رائیگاں لکھیے

کبھی نسریں کی اُلفت کو گلے کا ہار کہہ لیجئے
کبھی ریحانہ کی بد دیتوں کو حرزِ جاں لکھیے

کبھی پرویں کی مرگِ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے
کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیے

کبھی حُسنِ ثریا کو ہمار آئینہ کہیے
کبھی ناہید کے دل کو ہمارا آشیاں لکھیے

کبھی شیریں کے مستانہ تبسم کا بیاں کیجئے
کبھی لیلیٰ کے خونیں آنسوؤں کی داستاں لکھیے

کبھی دہرائیے قصّہ جہانگیر اِبن اکبر کا
کبھی اپنے اَوَدھ کے جانِ عالم کا بیاں لکھیے

کبھی غالب کو اور مومن کو کہیے ہم صغیر اپنا
کبھی خیّام وحافظ کو ہمارا ہم زباں لکھیے

الف سے ی تلک ، القصّہ ، جو بھی نام دلکش ہو

ہر اِک سے بدگماں ہو کر، ہر اِک کی داستاں
لکھیے

کبھی ہر بے دلی کو غم کا اِک تحت الثریٰ کہیے
کبھی ہر آرزو کو ایک خوابِ کہکشاں لکھیے
کبھی فرطِ غم و آلام کو مُہرِ زباں کہیے
کبھی افکارِ شعر و عشق کو جُوئے رواں لکھیے
کبھی ہر صبح کو دردِ خمارِ ناگہاں کہیے
کبھی ہر شب کو طوفانِ نشاطِ نوجواں لکھیے
کبھی جنت کی حوروں کو گدائے در سمجھ لیجئے
کبھی مفلس گداؤں کو ہمارا ہم زباں لکھیے

غرض اختر کی ساری زندگی کا یہ خلاصہ ہے
کہ پھولوں کی کہانی کہیے، شعلوں کا بیاں لکھیے

حسنِ ترتیب

محمد اکرم سعید

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

زیرِنظر کتاب کسی ڈگری کے حصول کے لیے، کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے۔ یہ تو بزمِ ''شیرانی صاحب'' کی جانب سے ایک قرض اُتارنے کی کوشش ہے۔ یہ کتاب اختر شیرانی پر لکھے گئے ''خاکوں'' کا مجموعہ ہے اور اِن خاکوں کی روشنی میں اختر صاحب کی اصل شخصیت کی ایک جھلک دِکھانا بنیادی مقصد ہے۔ شخصیت کے سارے رُخ اور زاویے سامنے لانے کے لیے خاکوں کے ساتھ کچھ بنیادی کُتب سے بھی مدد لی گئی ہے۔ جس کا ذکر حواشی اور کتابیات میں کر دیا گیا ہے۔

کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے حصّے میں خاکوں اور کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اختر شیرانی کی شخصیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اختر شیرانی کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور انسانی خوبیوں کی حامل ہے۔ وہ ایک رجحان ساز شاعر، ایک صاحبِ طرز ادیب، بلند پایہ مترجم، زبان و بیان پر مکمّل عبور رکھنے والے، ہمدرد اور ''زمیندار'' جیسے اخبارات کے کالم نگار اور اپنے عہد کے تمام بڑے رسائل کے ایڈیٹر تھے۔

اُن کے علم و دانش کا مقام و مرتبہ یہ تھا کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی جیسے ثقہ محقق اور نقاد بھی اپنے مسوّدات پر نظرِ ثانی کے لیے اُن کا انتخاب کرتے تھے اور سعادت حسن منٹو جیسا افسانہ نگار بھی زبان کی اِصلاح کے لیے اپنا مسوّدہ لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اُس عہد کے تمام نمایاں ادیب اور شاعر بالواسطہ یا بلا واسطہ نہ صرف اُن سے متأثر تھے بلکہ اُن سے اِصلاح بھی لیتے تھے۔ ن۔م۔ راشد، شورش

کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید عدم، ناصر کاظمی، مرزا ادیب، ادا بدایونی (ادا جعفری)، کنیز فاطمہ حیا اور عزیز جہاں بیگم وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اِتنے بڑے ادبی قد کاٹھ کے علاوہ اُن کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف اور پہلو اِنسان دوستی اور نسوانی احترام ہے، جس کا اعتراف تمام خاکہ نگاروں نے کیا ہے۔ مگر ان کے یہ تمام حمیدہ اوصاف، شراب نوشی اور سلمیٰ کے آنچل نے چھپا رکھے ہیں۔ اور ہم نے اختر کو صرف سلمیٰ اور شراب میں بریکٹ کر رکھا ہے۔ ان سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے اختر کا دامن شراب سے تر ضرور ہے مگر سلمیٰ کے حوالے سے تو اُن کے دامن میں کوئی داغ دھبّا نہیں ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں اختر پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے کسی عطّار کے لونڈے کی بجائے سلمیٰ، ریحانہ اور عذرا کو شاعری کے ایوان میں جگہ دی ہے اور پہلی بار محبوب کے لیے صیغہ تانیث استعمال کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عورت کا احترام اور اُس کی عزت و آبرو کی پاسداری بھی کی ہے اور انتہائی جذبات انگیز ماحول اور حالات میں بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھے اور اپنے دامن کو جنسی آلودگی سے پاک رکھا ہے۔

اُردو اَدب میں وہ کون شاعر ہے جس نے قرض کی مے نہیں چکھی اور اگر کوئی مے کدہ سے بچ کر نکل بھی آیا ہے تو محبوب کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوبنے سے کون بچا ہے؟ اور اثاثے میں تصویرِ بُتاں اور حسینوں کے خطوط کے سوا کیا رکھا ہے؟

اور اُردو اَدب خاص کر شاعری (غزل) سے شراب اور عورت کو نکال دیا جائے تو باقی کیا بچے گا؟ اختر کا اثاثہ بھی یہی ہے۔ عورت، شراب، تصویرِ بُتاں اور حسینوں کے خطوط جن سے مٹکا بھرا ہوا ہے۔ مگر ان کے ہاں عورت کا احترام اور احساسِ آبرو ایک پختہ یقین اور ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ شراب نوشی میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے۔ گویہ ''کافر'' منہ کو لگی تو تمام عمر چُھٹی نہیں مگر وہ اسے گندہ اور بُرا سمجھتے ہیں اور شرم حیا کا یہ عالم ہے کہ عام لوگوں کے سامنے پینے سے اجتناب کرتے ہیں اور مدہوشی کی حالت میں بھی اِسلامی شعائر اور عقیدتِ رسولِ اکرم ﷺ کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر نعت کہتے ہیں اور اگر مُنہ بدبو دار ہو تو نعت پڑھنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ سلمیٰ سے عشق (جو ہر لحاظ سے

جنسی آلودگی سے مبرّا تھا) اور بادہ کشی سے قطع نظر اگر اختر شیرانی کی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ ایک ایسے اِنسان دِکھائی دیتے ہیں جن میں انسانی محاسن واخلاق کی تمام جملہ خوبیاں موجود تھیں۔

کتاب کے پہلے حصّہ میں عورت، شراب کے ساتھ اختر کی انھی خوبیوں اور محاسن کو دیکھا گیا ہے اور دوسرے حصّے میں اُن پر لکھے گئے خاکوں کا متن دیا گیا ہے۔ اس سے اختر کے معاصرین کی اُن کی شخصیت اور خامیوں، خوبیوں کی رائے اور نقطۂ نظر سامنے آتا ہے جنھیں پڑھ کر عام قاری بھی اختر کی شخصیت کو جان سکتا ہے اور اپنی رائے قائم کرسکتا ہے اور اُس اختر کو صحیح طور پر پہچان سکتا ہے جس بارے وہ خود کہہ رہا ہے:

؎ آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

محمد اکرم سعید
15، اپریل، 2022ء
رسول پور جٹاں، شیخوپورہ
0335-4921473

پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس وِرک

محمد اکرم سعید

المعروف

”بزمِ شیرانی صاحب“

1998ء کی بات ہے جب میں اپنی پہلی تقرری کے ایک سال بعد خوش گوار یادوں کی خوشبو اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کو ساتھ لیے گورنمنٹ کالج شاہ کوٹ سے ٹرانسفر ہو کر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ جائن کرنے آیا۔ ڈاکٹر اشفاق نے میرا پہلا تعارف صدرِ شعبہ پروفیسر محمد اکرم سعید سے کروایا۔ بطور شاعر اور ادیب ان کا نام میں نے سُن رکھا تھا اور چہرہ بھی شناسا تھا کیوں کہ اسی کالج میں جب مَیں بی اے کی طالب علمی کے آخری ایام بسر کر رہا تھا اُنھی دِنوں یہ لیکچرار تعینات ہوئے تھے اور یوں میری براہِ راست اُستادی سے بال بال بچے تھے۔

خوش شکل، خوش لباس، خوش اخلاق، خوش گفتار، ملنسار، متواضع اور منکسر المزاج پروفیسر محمد اکرم سعید عام شخص ہیں اور نہ ہی عام شاعر، ادیب، اُستاد اور رفیق کار۔ زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا اپنا ایک الگ زاویہ ہے۔ ان کی شخصیت کی تہذیب میں ان کے دیہاتی پس منظر کے ساتھ ساتھ کثیر الجہاتی وسیع مطالعہ کا بہت عمل دخل ہے۔ انھوں نے زندگی کو ہمیشہ کھُلی آنکھ سے دیکھا اور اس کی تمام حقیقتوں سمیت اس کو تسلیم کیا ہے۔ تسلیم و رضا کے اِس فلسفے کے اِدراک سے سراغِ زندگی ان پر منکشف ہو گیا ہے جس نے ان کی ذات میں ایک سکون اور ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے جو ایثار، خلوص اور محبّت کی صورت ان کے تمام معاملات میں یوں رچ بس گیا ہے کہ یہ محبت کا ایک استعارہ بن گئے ہیں۔ وطن، وطن کی مٹی، اِس کے لوگ، کھیت کھلیان، موسم، غرض فطرت کے تمام مظاہر اِسی محبت کے اظہاریے بن کر کبھی ان کے شعر و ادب میں راہ پاتے ہیں تو کبھی رویوں اور معاملات میں صورت گر ہوتے ہیں۔ کتاب اور کاوشِ پیہم کی محبّت تو گویا ان کا مسلکِ حیات بن گئے ہیں۔

مختار مسعود نے ''آوازِ دوست'' میں لکھا ہے کہ ''ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جائیں تو دل خود بخود منوّر ہو جاتا ہے۔'' پروفیسر محمد اکرم سعید بھی ایک ایسے ہی آدمی ہیں کہ جن کے قرب سے مقربین کے قلب و ذہن نور حاصل کرتے ہیں۔ آپ کلاس میں ہوں تو مکمل اُستاد، روشنی کا مینار جس سے طلبہ جادۂ حیات پر چلنے اور منزل تک رسائی کے لیے مکمل راہنمائی لے سکتے ہیں ہمہ وقت اور ہر جا۔ آپ سٹاف روم میں ہوں تو تمام رفقاء کی توجہ کا مرکز، ہنس رہے ہیں، بول رہے ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں، دکھ سُن رہے ہیں سُکھ بانٹ رہے ہیں۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کو تو خیر آپ نے ایک طرح کی تربیت گاہ ہی بنا رکھا تھا جہاں زندگی کی تربیت ہی نہیں، ترتیب پر بھی زور دیا جاتا گویا آپ نئے آنے والوں کے لیے ایک درس دھارا کی حیثیت اختیار کر لیتے۔

پروفیسر صاحب کی شخصیت کا تحرّک منصبی فرائض کی ادائیگی تک ہی محدود نہیں تھا بل کہ ذیلی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بھی خون پسینہ ایک کر دیتے۔

کالج میں علمی، ادبی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ذوق کی ترویج و فروغ کی غرض سے ایک بزم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا نام شیرانی خاندان کی شیخوپورہ اور پھر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ سے نسبت کی بنا پر ''بزمِ شیرانی'' رکھا گیا۔ پروفیسر محمد اکرم سعید اِس بزم کے انچارج تھے۔ ان کے کمرے کے باہر آویزاں تختی پر ''بزمِ شیرانی'' درج تھا۔ پروفیسر صاحب کی زندگی کا اصل اصول یہ ہے کہ کسی بھی کام کو اپنی خلقی صلاحیتوں کو پوری شدت کے ساتھ کام میں لاتے ہوئے بہترین انداز میں کیا جائے۔ ''بزمِ شیرانی'' سے متعلق امور میں بھی ان کی دلچسپی اور کارگزاری کا یہ عالم رہا کہ ''تو من شدی من تو شدم'' کے مصداق من و تو کا فرق مٹ چکا تھا۔ طلبا اِن کی ذات کو ہی ''بزمِ شیرانی'' سمجھنے لگے۔ امتحانی پرچہ میں جہاں اُستاد کا نام لکھنا ہوتا طلبا بڑے اہتمام سے ''بزمِ شیرانی صاحب'' لکھتے۔ بزم کا رکن بننے کے لیے دی جانے والی درخواست کا آغاز بھی ''بخدمت جناب بزمِ شیرانی صاحب'' سے ہوتا۔ کبھی جب ہم شعبے میں یا سٹاف روم میں بیٹھے ہوتے تو کوئی طالبِ علم آتا اور پوچھتا کہ سر! بزمِ شیرانی صاحب کہاں ہیں؟ نوبت یہاں تک آ چکی تھی کہ ہمیں وضاحت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ بیٹا کون بزمِ شیرانی صاحب؟ ہم بڑے آرام سے سمجھ جاتے اور بڑے پیار سے بتا دیتے کہ کلاس روم میں یا لائبریری میں دیکھ لو۔

شیرانی شیرانی کرتے آپ ''بزمِ شیرانی'' سے معنون ہونے والے پروفیسر محمد اکرم سعید کا آغاز سے ہی شیرانی خاندان سے یک گونہ عقیدت، احترام اور پسندیدگی کا تعلق رہا ہے۔ وہ حافظ صاحب کے تحقیقی مزاج اور انداز کے گرویدہ ہیں تو اختر شیرانی کی رومانیت کے مدح سرا اور پھر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی خاکہ نگاری، علمیت اور مجلسی مزاج کے تو وہ براہِ راست باصرہ سامع اور ستائش کناں رہے ہیں۔

اختر شیرانی خاص طور پر ان کی دلچسپی کا موضوع اور محبّتوں کا مرکز رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اختر شیرانی کو تمام مؤرخین اور ناقدین نے ایک ہی عینک سے دیکھا اور ان کی ذات کے ایک ہی پہلو کو نمایاں کیا جب کہ اُن کی شخصیت کے بہت سے دیگر خوب صورت، توانا، قابلِ توجہ اور قابل تعریف گوشے بھی موجود تھے جنھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔

اختر شیرانی کے حوالے سے لکھے گئے خاکوں کے اِس مجموعے اور اِس ضمن میں لکھے گئے تفصیلی تحقیقی وتنقیدی مقالے کی اشاعت کا بنیادی مقصد بھی شاید یہی ہو کہ پروفیسر محمد اکرم سعید اُس مشترکہ عینک کی تبدیلی چاہتے ہیں جسے ہر کوئی بوقتِ ضرورت اپنے استعمال میں لے آتا ہے۔ ''بزمِ شیرانی صاحب'' ہونے کے ناطے، انھوں نے یہ فرض ادا کرنے اور یہ قرض چکانے کی کوشش کی ہے کہ اختر شیرانی صرف شراب اور ''سلمیٰ'' تک محدود نہیں ہے بلکہ اُس کی زندگی تو کلیوں اور پھولوں کی کہانی ہے اور

''وہ ایسا شخص ہے جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔''

❀❀❀❀❀❀

محمد اکرم سعید

اختر شیرانی

خاکوں کے پس منظر میں شخصی تجزیاتی مطالعہ

اختر شیرانی نے اپنے خود نوشت ''خاکے''(1) (جسے صحیح معنوں میں خاکہ تو نہیں مختصر تعارف کہنا چاہیے) میں اپنی نجی زندگی کے کچھ واقعات تحریر کیے ہیں۔ اپنے تعارف میں لکھتے ہیں کہ:

''1905ء (2) کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں غالباً میرے دادا مولوی محمد اسمٰعیل خاں (3) تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ (4) میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اُن کے نام سے علمی دُنیا اچھی طرح واقف ہے۔''(5)

اختر شیرانی مزید لکھتے ہیں:

''1919ء (6) میں والیٔ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احسان فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والد کی معیت میں لاہور جیسی متمدّن، مہذّب اور شاندار دُنیا میں آنا پڑا۔''(7)

لاہور میں اپنی آمد اور تعلیم کے بارے میں اختر شیرانی لکھتے ہیں:

''1921ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ دو چار مہینے مُنشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہو گیا۔۔۔۔۔ پھر جنونِ عشق و شباب کے سبب تعلیم چھوٹ گئی۔۔۔ چند سال گزرنے کے بعد از سرِ نو تعلیم کی دھن سوار ہوئی۔ اپنے پرانے کالج (اورینٹل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے بعد صحافت کی وحشت ہیولا بن کر کرم فرما ہوئی۔'' (8)

''حافظ صاحب مارچ 1913ء میں لندن سے ٹونک واپس آئے۔ اُس وقت اختر تقریباً نو برس کے ہو چکے تھے۔ اب حافظ صاحب نے اختر کی تعلیم کی جانب توجہ فرمائی۔''

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''حافظ صاحب بیٹے کو بحر العلوم بنانا چاہتے تھے چنانچہ متعدد اساتذہ اختر کی تدریس اور تربیت کے لیے مقرر

کیے گئے۔ ایک وقت تو اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔ اُردو، فارسی، دینیات، ریاضی کے علاوہ خوش خطی‘‘، ورزش اور پیراکی کے الگ الگ اُستاد تھے۔ اُن کی مساعی کے نتیجے میں اختر کی علمی استعداد بہت اچھی، خط بڑا پاکیزہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اسی دور میں اختر اپنے ایک اُستاد مولوی محمد صابر شاکر کی تشویق سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے ۔۔۔۔۔۔ اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے بعد رسمی تعلیم چھوڑ کر شعر و ادب اور صحافت کو پیشہ بنا لیا۔ حافظ صاحب کو بیٹے کی تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔‘‘ (9)

اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں اختر صاحب نے لکھا ہے:

’’ہمایوں‘‘ کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے ’’بہارستان‘‘ کی ادارت کا بار اُٹھانا پڑا۔ میں نے ’’خیالستان‘‘ کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا۔ ’’بہارستان‘‘ کی زندگی میں جب کہ مرحوم مولانا محمد علی (جوہر) نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا، میرے ایک مضمون نے جو مولانا مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا، مولانا محمد علی کو اِتنا متأثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے اِدارہ کے توسط سے مجھے مجبور کیا میں ’’ہمدرد‘‘ کے لیے فکاہی کالم کے لیے کم از کم ہفتے میں ایک بار کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔ چنانچہ اِس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔‘‘ (10)

اُن کی ادبی صحافت کے بارے جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

1۔ ’’ہمایوں‘‘ (لاہور) شریک مدیر اختر شیرانی (1922ء)

2۔ ’’انتخاب‘‘ (لاہور) شریک مدیر اختر شیرانی (1926ء)

3۔ ’’بہارستان (لاہور) مدیر اختر شیرانی (مئی 1926ء)

4۔ ’’خیالستان‘‘ (لاہور) مدیر اختر شیرانی (1930ء)

5۔ ’’رومان (لاہور) مدیر اختر شیرانی (1935ء)

اختر شیرانی ان کے علاوہ ’’نوبہار‘‘ (لاہور)، ’’مخزن‘‘ (لاہور) اور ’’شاہکار‘‘ (لاہور) کے ادارتی عملے سے بھی متعلق رہے۔‘‘ (11)

اختر شیرانی لکھتے ہیں:

’’1935ء میں ’’رومان‘‘ کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا جو بوجوہ بند ہو گیا۔‘‘

اختر شیرانی نے تو ''رومان'' کے بارے صرف یہی لکھا ہے کہ بوجوہ بند ہو گیا'' مگر ''رومان'' کے اجراء اور بندش کی کہانی عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور حکیم نیّر واسطی نے تفصیل سے بیان کی ہے۔((12)

رومان کا اجراء اور بندش: عاشق حسین بٹالوی صاحب کا بیان ہے کہ:

''1935ء کے اوائل میں ایک روز میں نے اور اختر نے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی تجویز سوچی۔ اختر گزشتہ آٹھ سال میں یکے بعد دیگرے تین رسالے ''انتخاب''، ''بہارستان''، ''خیالستان'' نکال کر بند کر چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ اُن سے بدظن ہو چکے ہیں اِس لیے اُن کی خواہش تھی کہ اگر ہم نے نیا رسالہ جاری کیا تو سرورق پر صرف میرا یعنی راقم التحریر کا نام بطور ایڈیٹر درج ہونا چاہیے۔ مجھے اُن کی اِس رائے سے اختلاف تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سرورق پر ہم دونوں کے نام درج ہوں گے۔ مارچ 1935ء میں ''رومان'' کا پہلا پرچہ نکلا۔''(13)

عاشق حسین بٹالوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''میر نور بخش مائر جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے، خوش حال آدمی تھے۔ شعر بھی اچھے خاصے کہتے تھے۔ اُنھوں نے ''رومان'' کے لیے کلکتہ سے ایک نظم بھیجی جس میں علامہ اقبال کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ بٹالوی صاحب نے تو بغیر دیکھے ہی کہہ دیا کہ اِس قسم کی چیزیں ''رومان'' میں ہرگز شائع نہیں ہوں گی، مگر اختر نے جولائی کے پرچہ میں اسے شائع کر دیا۔ اور بقول بٹالوی صاحب: ''جب میں نے پوری نظم پڑھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری اور اختر کی خیر نہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جائے گا۔''(14)

اِس نظم کی اشاعت پر دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ بٹالوی صاحب نے علّامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بے گناہی ثابت کر دی۔ دوسرے لفظوں میں سارا الزام اختر کے سر لگا دیا۔

''رومان تقریباً تین سال جاری رہا۔ اس کی بندش کے حوالے سے بٹالوی صاحب نے لکھا ہے کہ ''مجھے آہستہ آہستہ سیاسی مصروفیتوں نے اپنی طرف کھینچ لینا شروع کر دیا اور اختر کی شراب نوشی میں اضافہ ہونا شروع ہوا، چنانچہ سارا نظام بگڑ کے رہ گیا۔۔۔۔۔ چنانچہ تین سال کی مختصر سی زندگی کے بعد ''رومان'' نے بھی عدم کی راہ لی۔''(15)

''رومان'' کی کہانی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی یوں بیان کرتے ہیں:

''اختر شیرانی نے اپنا ذاتی رسالہ ''رومان'' لاہور سے جاری کیا تھا جو ۱۸ فلیمنگ روڈ سے شائع ہوتا تھا۔ عاشق حسین بٹالوی کو اُنھوں نے اپنا معاون مدیر بنایا۔ رسالے کا ڈیکلریشن ایک دوست کے نام سے لیا تھا۔ جب رسالہ چل نکلا تو اُس ناشر دوست کی نیت میں فتور آ گیا۔ اُس نے رسالے پر قبضہ جمانا چاہا۔ اِس معاملے میں عاشق بٹالوی صاحب کی ہمدردی اور غالباً مشورہ بھی اُن کو حاصل ہوا۔ اختر کو عاشق صاحب کے اِس رویّے سے صدمہ ہوا۔ اور اِس کا ذکر اُنھوں نے بعض دوستوں سے کیا۔ بالآخر اُن کی جگہ خلیل احمد صاحب کو نائب مدیر مقرر کرنا پڑا۔ عاشق بٹالوی صاحب نے اِس مخاصمت کا بالواسطہ اظہار اختر پر اپنے مضمون میں کیا۔ عاشق بٹالوی صاحب نے اختر سے اپنے اختلاف کی توجیہہ ایک نظم کی اشاعت سے کی ہے اور اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے تحریکِ پاکستان کا سہارا لیا ہے۔''(16)

اِس حوالے سے تابش صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

''جب اُنھوں نے ''رومان'' نکالا تو اُس کا ڈیکلریشن ایک دوست کے نام سے لیا۔ جب رسالہ خوب چل نکلا تو دوست اس پر قبضہ کرنے بیٹھ گئے۔ دوستوں نے اُس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض احباب نے مقدمہ کی پیروی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں لیکن اختر مرحوم اپنے ایک پرانے دوست کو عدالت میں ذلیل کرنے پر رضا مند نہ ہوئے اور آمدنی کے ایک معقول ذریعے سے محروم ہو کر زندگی کے دن تنگی و تُرشی میں گزار دیے۔''(16_A)

اِس واقعہ کو حکیم نیّر واسطی یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلہ میں اُنھیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اُس سے کبھی نہیں ملیں گے لیکن ایک دن جب وہ اُن کے سامنے سے گزرا تو اُس سے لپٹ گئے اور اُلٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔''(17)

حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

''اختر نے اپنے مخالف معاصرین سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا، اُسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے اُنھیں دُنیاوی امور میں کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ یہی اُن کی عالی ظرفی تھی جس کا اعتراف سب دوستوں نے کیا ہے۔(18)

اختر شیرانی صاحب نے اپنے ایک مکتوب بنام اعجاز سکندر نازش، ''رومان'' کے بارے یہ لکھا ہے:

''رومان'' کے سلسلہ میں غداری کرنے والے، امیرا مینجر شیخ محمد نواب مالک ''زیب النساء'' ۲ خلیل احمد رومان بی۔اے میرا جائنٹ ایڈیٹر تھے، جو اَب ''احسان'' میں ملازم اور رسالہ ''داستان'' کا ایڈیٹر ہے۔''(19)

''رومان'' کے اجراء اور بندش کے تذکرے کے بعد دوبارہ اختر شیرانی کے خودنوشت خاکے کی طرف آتے ہیں۔اختر شیرانی نے اپنی حیاتِ معاشقہ کا ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے اور صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے:

''رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ، جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں، اس کے متعلق لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے علم کے بعد نہ کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو۔''(20)

اِس جملے سے اختر صاحب کی نہ جانے کیا مراد ہے؟ عزیزوں یا دوستوں کو اُن کی زندگی سے کیوں دلچسپی نہیں رہے گی؟ دوست تو اُن کی حیاتِ معاشقہ کے لمحے لمحے سے واقف ہیں اور انھوں نے چسکے لے کر آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

اُن کی ''حیاتِ معاشقہ'' کا آغاز ٹونک سے ہوتا ہے۔جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

''اختر کو ایک عشق پرست دل ملا تھا۔لڑکپن سے اُن کا مزاج عاشقانہ تھا۔1919ء تک (جب اختر کی عمر ابھی 14 برس تھی)، اختر دو عشق کر چکے تھے۔ پہلا ٹونک کے حکمران خاندان کی ایک خاتون سے اور دوسرا عشق طبقۂ امراء کی ایک خاتون سے کیا تھا اور ''دیس سے آنے والے بتا'' میں جس ''جانِ وطن'' کی خیریت دریافت کی گئی ہے وہ یہی دوسری خاتون ہیں۔''(21)

مگر یہ دونوں عشق اختر کی آئندہ زندگی پر گہرے اثرات مرتّب نہیں کر سکے۔اختر کی اصل ''حیاتِ معاشقہ'' تو لاہور آ کر شروع ہوتی ہے اور سلمیٰ سے لے کر عذرا اور ریحانہ، زہرہ، پروین، ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رُخ، شمسہ، لیلیٰ، زلیخا، نوبہار ناز، ماہ لقا وغیرہ تک پھیلی ہوئی ہے۔مگر اس داستان کو زیادہ تر سلمیٰ ہی سے منسوب کیا جاتا ہے اور تقریباََ تمام خاکہ نگاروں نے کسی نہ کسی انداز سے اِس کا ذکر کیا ہے۔کسی نے اِس کردار کو فرضی اور اختر کے تخیّل کی اختراع قرار دیا ہے اور کسی نے نام فرضی مگر کردار کو حقیقی قرار دے کر اپنی چشم دید گواہی دی ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے سوال اُٹھایا ہے کہ:

''اختر نے کسی ایک کا نام تو نہیں لیا، عذرا، ریحانہ کے علاوہ نسرین، پروین، شمسہ، ثریا، ناہید وغیرہ کے بھی نام لیے ہیں۔ پھر سلمیٰ ہی کو اختر سے نتھی کیوں کیا جاتا ہے؟ باقی خواتین کو نظرانداز کرنے کا سبب کیا ہے؟''(22)

حکیم نیرّ واسطی کا خیال ہے کہ:

''عذرا ہو، زلیخا ہو یا دیگر۔۔۔۔۔ان سب میں سلمیٰ ہی کے حُسن و جمال کی بہاریں ڈھونڈتے اور ان پر نثار ہوتے تھے۔ وہ سلمیٰ کے سچے عاشق تھے اور وہ چاہتے تھے کہ کہیں وہی جلوہ اُنھیں ایک بار پھر نظر آ جائے۔''(23)

یعنی وہ سلمیٰ کے حسن و جمال ہی کو ان حسیناؤں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

''اُنھوں نے جوانی میں بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھائے اور کئی دروازوں پر دستک دے کر لوٹ آئے لیکن سلمیٰ سے اُن کا لگاؤ کبھی ختم نہیں ہوا۔ وہ سلمیٰ کے لیے جیتے تھے اور سلمیٰ کے لیے ہی اجل کو لبّیک کہہ گئے۔''(24)

ایک عاشق صادق کا یہ رویّہ کہاں تک درست ہے کہ وہ بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھاتے اور جگہ جگہ دروازوں پر دستک دیتے پھریں؟ اور دعویٰ پھر یہی ہو کہ وہ سلمیٰ کے لیے جیئے اور اُسی کے لیے داعیٔ اجل کو لبّیک کہا۔ اِس دعوے کی بجائے شورش کاشمیری صاحب کی یہ بات قابلِ غور ہے کہ:

''اختر کو موت نے نہیں مارا بلکہ وہ خود مرے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں زندگی کے بخیئے اُدھیڑ ڈالے۔''(25)

یعنی اختر کو اُس کی مے نوشی نے مار ڈالا (اور مے نوشی کا آغاز سلمیٰ سے عشق سے پہلے ہو چکا تھا)۔ اس کے بعد یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے کہ وہ سلمیٰ کے لیے داعیٔ اجل کو لبّیک کہہ گئے۔ سلمیٰ کے بعد اور بہت سی خواتین سے اختر کی مراسلت رہی۔ حکیم نیرّ واسطی کے بقول:

''بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں، بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لیے خطوط لکھتی تھیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض کو اختر سے کچھ ''دِلی لگاؤ'' بھی رہا ہو لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حُسن اور نسائیت کے لیے اُس کے احساسات اور بے پناہ طوفانِ جذبات کو دیکھ کر اُس کی قدردان اور اُس کے ہُنر کی دلدادہ تھیں اور بعض کا معمول یہ تھا کہ اُس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اُس کو

اُس کو خطوط لکھتیں اور تفریحاً چھیڑتی تھیں، اور اختر کی ''سادگیٔ تمنّا''، تھی وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبّت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔''(26)

محمد طفیل صاحب نے بھی اختر کی اِس سادگی اور بھولپن کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں اِسے اختر صاحب کی سادگی اور بھولپن ہی کہوں گا کہ اُنھیں اگر کوئی لڑکی خط لکھ دیتی تھی کہ ...... مجھے آپ کی فلاں نظم پسند آئی ہے یا مجھے آپ کی شاعری بڑی عزیز ہے، تو یہ فوراً اُس لڑکی کا نام محبوباؤں والے رجسٹر پر چڑھا دیتے تھے پھر دوستوں میں تذکرے ہوتے تھے۔۔۔۔ خط و کتابت ہوتی تھی۔''(27)

کیا ایسی لڑکیاں واقعی معشوقائیں ہوتی ہیں؟ محبوباؤں والے رجسٹر میں نام چڑھا لینے سے وہ محبوبائیں بن جاتی ہیں؟ یہ اختر کی ''سادگیٔ تمنّا'' یا بھولپن ہے، جس سے یار لوگوں نے کیا کیا افسانے تراش لیے اور یہ کہہ کر سارا الزام اختر پر ٹھونک دیا کہ اختر نے ہر مہکتے دروازے پر دستک دی اور ہر مہکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ:

''اختر عورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحسّ واقع ہوئے تھے۔ جب کوئی حسین عورت دیکھتے، خود سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین عورت کا سامنا ہو جانا اُن کے لیے مصیبت تھا جس کا اِظہار اُن کے چہرے سے ہونے لگتا۔''(28)

یہ اُس عشق پرست آدمی کا حال ہے جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ لڑکپن ہی سے مزاج عاشقانہ تھا، مگر حسین عورت کا سامنا اُس کے لیے ایک مصیبت تھا۔

نصر اللہ خاں، اختر کے عشق سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ وغیرہ کی حقیقت کے بارے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اختر عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے، لیکن اُن میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یہ فُل ٹائم جاب ہے اور اختر کا مزاج سیمابی تھا۔ وہ بلا کے شرمیلے تھے۔۔۔۔۔ ہاں اگر دُور سے کسی لڑکی کو دیکھ لیتے تو تڑپ اُٹھتے۔ اگر کسی مکان کی کھڑکی میں سے کسی کی جھلک دیکھ لیتے تو دل پکڑ کر بیٹھ جاتے اور پھر اُن کے عشق کا فسانہ شروع ہو جاتا۔ یہ جو اختر کی شاعری میں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ وغیرہ ہیں، وہ حقیقی شخصیتیں نہیں ہیں۔ جس نے ایک جھلک دِکھا کر دل موہ لیا بس اُسی کا اچھا سا نام رکھ دیا اور اُس پر نظم ہوگئی۔ البتہ لڑکی کی نشان دہی اُس کی رُسوائی کی وجہ سے نہ کرتے۔ رومانی شاعری کی وجہ سے ''بہت سی لڑکیاں'' اُن پر مرنے لگی تھیں۔ اُن کو محبت بھرے خطوط بھی موصول ہوتے لیکن اختر کا جواب بڑا عصمت مآب ہوتا۔ اُن کا حال یہ

تھا کہ اگر لڑکی اُن کے قریب آ کر بیٹھ جاتی تو اُن کی نظریں زمین سے نہ اُٹھتیں اور سوچتے کہ کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائیں۔"(29)

دُور دُور سے دیکھ کر تڑپنے، عشق کرنے اور دل پکڑ کر بیٹھ جانے والے شخص کا حال یہ ہے کہ لڑکی کے قرب سے گھبراتے اور کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگنے کا سوچتے ہیں اور نظریں زمیں سے نہیں اُٹھاتے۔

عورت کا احترام اور ملنے سے جھجک اور گریز کے حوالے سے محمد طفیل لکھتے ہیں:

"دِلّی میں 'ہز ماسٹرز وائس' کے دفتر میں کسی نے مشہور مغنّیہ مُنّی بائی سے اُن کا تعارف کرایا۔ اختر صاحب مارے شرم اور جھجک کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ مُنّی بائی نے شرارتاً کہا "شاعرِ شباب تو کانپ رہا ہے۔"(30)

کانپنے کا سبب کوئی خوف نہیں بلکہ عورت سے حجاب، شرم اور جھجک ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی لکھتے ہیں:

"اختر میں حیا اور معصومیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اِس کا اندازہ اِس طرح لگائیے کہ سلمیٰ اور اُس کے بعد تقریباً ایک درجن لڑکیوں کے نام اُن کی محبوباؤں کی فہرست میں شامل ہیں لیکن اُن کی زندگی یا جوانی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب اُنھوں نے ہوا و ہوس سے اپنے عشق کو مکدّر کیا ہو۔ محبّت کے معاملے میں وہ پاکیزگی اور معصومیت کے قائل تھے۔ شباب اُن کے ہاں گناہ کی آلودگی سے بچے رہنے کا نام تھا۔ جسمانی قربت کو محبّت اور شباب کے لیے موت خیال کرتے تھے۔"(31)

اختر کی زندگی اور شاعری کا محور عورت تھی لیکن اختر نے عورت کو محض ایک محبوبہ ہی نہیں سمجھا، اُن کے ہاں وہ بیوی، بیٹی اور بہن کے روپ میں بھی جلوہ گر ہے۔ اُنھوں نے اس کی مامتا کو بھی دیکھا ہے۔ اس کا ہر روپ ہی سُندر اور خوب صورت ہے۔ اختر نے عورت کی مجبوری اور لاچاری پر بھی آنسو بہائے ہیں اور اس کی عظمتوں کی بھی تعریف کی ہے۔ "نغمۂ حرم" صرف اُن نظموں پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے عورتوں کے لیے لکھی ہیں۔ اِن نظموں میں وہ ایک دردمند شاعر اور انسان کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔

حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

"اختر بے حد ہمدرد بنی نوعِ انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا، تلمِلا اُٹھتے اور اکثر رو پڑتے اور عورت ذات کو تو مصیبت میں کبھی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ انارکلی میں تانگے پر سوار تھے کہ

ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اسے فوراً دے دو۔ میں عورت کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔"(32)

عورت اور عورت کے احترام اور اختر شیرانی کے شرم و حیا اور معصومیت کی باتیں تو ضمناً آ گئی ہیں، اصل موضوع سلمیٰ ہے۔ اُس کی جانب دوبارہ پلٹتے اور خاکہ نگاروں کی رائے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کا خیال ہے کہ سلمیٰ، اختر کے ذہن کی اختراع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی۔ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو، مگر جو سلمیٰ ہمیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے۔ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پوست کی زندہ عورت ہوتی تو شاعر اُس سے اِتنی والہانہ محبّت کبھی نہ کرتا، مگر چونکہ وہ اُس کی اپنی تخلیق تھی اِس لیے وہ اُس سے بے پناہ محبّت کرتا تھا۔"(33)

سعادت حسن منٹو نے اپنی رائے کی تائید میں جو دلیل دی ہے اُس سے تو یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ سلمیٰ، اختر کے ذہن کی اِختراع ہے۔ اختر کو سلمیٰ (یہ نام اصلی نہیں) کے خطوط بھی آئے جیسے دیگر خواتین کے، مگر اِس میں رنگ آمیزی ساری اختر کی ہے۔

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

"اختر کی منظومات میں لائے جانے والے اسماء "سلمیٰ"، "ریحانہ"، "عذرا" وغیرہ میرے علم کی حد تک فرضی نام ہیں۔ صرف تخیّل کی کارفرمائیاں ہیں۔ یہ سب اُن کی ذہنی تخلیق ہیں۔ آب و گل کی دُنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں۔"(34)

اِس حوالے سے اُنھوں نے یہ دلیل دی ہے کہ:

"اختر صاحب نے ابتدائی عمر میں عربوں کی تاریخ اور شاعری کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی کئی نظموں میں عربی ماحول جھلکتا ہے۔ یہ نام بھی عربی ادب سے اخذ کیے گئے تھے۔"(35)

اِس بات کو اختر کے دوست تسلیم کرتے ہیں کہ اختر کو لڑکیوں کے خطوط آتے تھے، اُن پر وہ نظمیں بھی لکھتے تھے مگر نام بدل دیتے تھے تاکہ اُن کی رُسوائی نہ ہو۔ اِس طرح ممکن ہے یہ نام اُنھوں نے عربی ادب ہی سے اخذ کیے ہوں۔ یعنی یہ بات مسلّمہ ہے کہ یہ نام اصل نہیں ہیں۔ حقیقت جو بھی ہے، اختر کا یہ قدم جرأت

مندانہ اور قابلِ تعریف ہے کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کی تاریخ میں محبوب کے لیے صیغۂ تانیث استعمال کر کے امرد پرستی کی نفی کی اور یہ کوئی معمولی قدم نہیں کہ عطار کے لونڈوں کی بجائے سلمیٰ اور عذرا کی جھلک دِکھائی دینے لگی۔

عاشق حسین بٹالوی نے سلمیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''اِس نام (سلمیٰ) نے اختر کی ذات اور اُن کے کلام کے ساتھ بہت سی حکایتیں ، روایتیں اور داستانیں وابستہ کر دی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اِس نام کی آڑ میں اپنا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور بعض ستم ظریف تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اختر صاحب جب رات کو سلمیٰ سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔''(36)

اِس اِقتباس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اِس نام کی آڑ میں یار لوگوں نے کیا کیا دعوے کیے اور اپنا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کی ہے۔ عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں:

''وہ لوگ جنھوں نے اختر و سلمیٰ کے عشق کی فرضی تفصیلات مرتّب کر ڈالی ہیں جو اختر کی شاعری کے خود ساختہ نقاد بن کر اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ فلاں نظم اختر نے اُس وقت لکھی جب سلمیٰ کا پہلا خط اُنھیں ملا تھا، ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کا اِرتکاب کرتے ہیں۔''(37)

اور حقیقت یہ ہے کہ اِس ''اخلاقی جرم'' کا آغاز، عاشق حسین بٹالوی صاحب کے اپنے گھر یا دفتر ہی سے ہوا۔ اور سب سے پہلے خادم حسین بٹالوی صاحب نے قدم اُٹھایا، پھر حکیم نیّر واسطی نے ''سلمیٰ و اختر'' کی حیاتِ معاشقہ کو بیان کرنا ضروری سمجھا اور آخر میں ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِن دونوں کتابوں سے فائدہ اُٹھایا اور اپنی تحقیق کے لیے اُنھیں بطور سند استعمال کیا۔

خادم حسین بٹالوی صاحب نے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' نامی کتاب مرتّب فرمائی ہے۔ اِس کا مسوّدہ اُنھوں نے کس طرح چُرایا؟ وہ کتاب کے پیشِ لفظ میں خود ہی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالباً 1934ء کا زمانہ تھا۔ ماہنامہ ''رومان'' اختر شیرانی مرحوم اور برادرِ محترم عاشق حسین بٹالوی کی مشترکہ اِدارت میں نکل رہا تھا۔ (''رومان'' کا آغاز 1935ء میں ہوا۔ راقم) میں اُن دِنوں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ لاہور میں عمر گزارنے کے بعد منٹگمری کی زندگی بے کیف اور خشک

تھی۔ چنانچہ جب کبھی موقع ملتا، بھاگ کر لاہور آجاتا۔ اِسی دروان مَیں ایک دن ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ہاں گیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ میں استحقاقِ برادرانہ کو کام میں لاتے ہوئے اُن کی چیزوں کو اُلٹنے پُلٹنے لگ گیا۔ میز کی دراز کھول کر دیکھی تو ایک کاپی پر نظر پڑی جس کے سرورق پر لکھا تھا ''شاعر کا خواب''۔ اُسے کھولا تو تحریر اختر مرحوم کی تھی اور یہ مسودہ مجموعہ تھا ''اختر وسلمیٰ کے خطوط'' کا جس کو کتابی صورت دے دی گئی تھی۔ عاشق صاحب کی اطلاع یا اجازت کے بغیر وہ مسوّدہ لے کر منٹگمری چلا گیا۔

دو دِن اور ایک رات کی مسلسل محنت کے بعد یہ مسوّدہ نقل ہوگیا۔ اس کے بعد میں لاہور آیا اور کاپی چُپکے سے اُسی دراز میں رکھ دی۔ وقت گزرتا گیا اور مسوّدہ میرے پاس محفوظ رہا۔

1947ء کے پُرآشوب زمانے میں جب ہر چیز درہم برہم ہوگئی تو یہ قیمتی متاع بھی کہیں گُم ہوگئی۔ ایک سال بعد اختر مرحوم بھی اس دُنیا سے رُخصت ہوگئے۔

دو سال کی مسلسل جستجو کے بعد وہ کاپی صحیح سالم مل گئی۔ (یہ قیمتی متاع کہاں گم ہوئی اور دو سال مسلسل اسے کہاں تلاش کرتے رہے اور کہاں سے ملی، اِس کی تفصیل موصوف نے نہیں لکھی۔ راقم)

اس کے بعد میں نے متعدد بار اس کی اشاعت کا ارادہ کیا لیکن زندگی کی کش مکش نے مُہلت نہ دی۔۔۔۔۔ اب یہ ''مسروقہ مجموعہ'' آپ کے پیشِ نظر ہے۔ زندگی میں سرقہ کا مُرتکب تو کئی بار ہوا ہوں مگر اِس حسین سرقہ پر جو خوشی مجھے محسوس ہوتی ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔'' (38)

یہ اقتباس طویل ہوگیا ہے، مگر اِس کے بغیر اِس کتاب کی اشاعت کی کہانی ادُھوری اور نامکمّل رہتی۔ خادم حسین بٹالوی صاحب، جو زندگی میں ''سرقہ'' کے عادی ہیں، اُنھوں نے یہ ''مسروقہ مجموعہ'' شائع کیا ہے اور اپنے اِس عمل پر شرمندہ ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔

''کوکب'' (اختر) نے اِسے مرتّب کرتے ہوئے اِس کا نام ''شاعر کا خواب'' رکھا تھا۔ یہ ''شاعر کا خواب'' تھا اور وہ بھی شاعرِ رومان، اختر شیرانی کا۔ یہ بڑا رنگین اور حسین خواب ہے مگر جب خادم حسین بٹالوی صاحب نے اسے ''اختر وسلمیٰ کے خطوط'' کا نام دیا تو پھر قاری اسے خواب کی بجائے حقیقت سمجھ بیٹھا۔ مزید کرم نوازی حکیم نیّر واسطی صاحب نے کی اور ''سلمیٰ و اختر'' کے نام سے اختر کی حیاتِ معاشقہ بیان کر دی۔ گویا حکیم نیّر واسطی صاحب اور خادم حسین بٹالوی صاحب نے ایک خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا اور ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِن مذکورہ کتابوں کو اپنی تحقیق کی بُنیاد بنالیا اور انھیں بنیادی

ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ یوں کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی۔ خطوط کے بارے خادم حسین بٹالوی کا کہنا ہے کہ:

''ان کے متعلق مختلف آراء ہیں۔

1۔ بعض لوگ سرے سے سلمیٰ کے وجود ہی سے مُنکر ہیں اور اُن کی رائے میں اِن خطوط کی اِسی قدر حقیقت ہے کہ:

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

2۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ سلمیٰ واقعی ایک حقیقت تھی اور اختر مرحوم کے ساتھ اُس کا معاشقہ بھی مسلّم تھا لیکن وہ کوئی ادیبہ نہ تھی کہ اِس قسم کی بلند پایہ عبارات لکھ سکتی، لہٰذا یہ خطوط اختر مرحوم نے خود ہی لکھے تھے۔

3۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اِن خطوط کو واقعی اصلی خیال کرتے ہیں۔''(39)

اِن تین گروہوں میں بٹے ہوئے لوگ کون ہیں اور ان کی یہ رائے کب اور کہاں سامنے آئی، جناب خادم حسین بٹالوی صاحب نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور اپنی طرف سے خطوط کے اصل ہونے کے یہ دلائل خود دیے ہیں۔

1۔ خطوط پڑھنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ سب خود فریبی تھی جس میں اختر مُبتلا تھے، بہت مشکل ہے۔ اِس قدر طویل خود فریبی ممکن نہیں۔

2۔ خطوط میں اکثر مقامات پر بعض گھریلو اور دیگر واقعات کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط اصلی ہیں۔''(40)

یہ دونوں دلائل اِتنے مضبوط نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خود فریبی نہیں بلکہ خواب ہے اور ایک رنگین خواب ہے اور پھر اِن خطوط میں گھریلو واقعات کی رنگ آمیزی سے حقیقت کے قریب ہو گئے ہیں۔ یعنی ایسا خواب جس میں حقیقت کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اور پھر خادم حسین بٹالوی صاحب خود بھی کہہ رہے ہیں:

''اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ادبی شہ پارے اختر و سلمیٰ کے اصل یا فرضی'' محبّت کے ان مٹ نقوش ہیں جن کو ادب میں بلند جگہ ملنی چاہیے۔''(41)

یعنی مؤلّف کو خود بھی علم نہیں کہ محبّت اصل ہے یا فرضی، مگر اُن کی یہ رائے درست ہے کہ یہ خطوط بلا شبہ ادبی شہ پارے ہیں۔

عاشق حسین بٹالوی صاحب نے اپنے ''خاکے'' میں اُس ''کاپی'' کا (جسے خادم حسین بٹالوی نے اُن کے دفتر سے چرایا تھا) ذکر کیا ہے جو اختر شیرانی نے عاشق حسین بٹالوی کو ملاحظہ کے لیے دی جو اُنھوں نے ''شاعر کا خواب'' کے نام سے مرتّب کر رکھی تھی، اور اُسے اپنی ''حیاتِ معاشقہ'' کی مکمّل داستان کہتے تھے۔ بہ قول اختر شیرانی:

''اِس میں میرے اور سلمیٰ کے تمام خطوط موجود ہیں۔ اخفائے راز کے لیے میں نے اپنا نام ''کوکب'' رکھا ہے۔''(42)

اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ کی داستان جو اُنھوں نے ''شاعر کا خواب'' کے نام سے مرتب کی تھی اُس بارے عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ:

''میں نے بمشکل چند صفحے پڑھے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ ''کوکب'' اور سلمیٰ کے خطوط لکھنے والی ایک ہی ہستی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجّب ہوا کہ جو خط سلمیٰ سے منسوب کیے گئے تھے وہ تمام تر اختر کے اپنے لکھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ''شاعر کا خواب'' سراسر اختر کے اپنے قلم کا مرہونِ منت ہے۔''(43)

عاشق حسین بٹالوی صاحب کے اِس بیان کے باوجود یہ بات ابھی تک اُلجھی ہوئی ہے کہ خطوط سلمیٰ کے ہیں یا اختر کے اپنے لکھے ہوئے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کا مطالعہ ضروری ہے (جسے خادم حسین بٹالوی صاحب نے ''شاعر کا خواب'' کا مسودّہ چرا کر اِس نام سے مرتّب کیا ہے)۔ کتاب کا آغاز سلمیٰ کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں جو پہلا خط سلمیٰ کی طرف سے موصول ہوا ہے اُس کا عُنوان تجویز کیا گیا ہے: ''بہارستان'' کی ڈاک میں ایک گمنام تحریر۔''

خط کا آغاز اِن اشعار سے ہوتا ہے:

عشق ہے اور ابتدائے آہ ہوتی ہے　　　مبارک آج طِفل دل کی بسم اللہ ہوتی ہے
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی　　　ہم تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

اِن اشعار کے بعد محبّت کا ذکر کچھ اِس طرح سے ہے:

''اگر محبّت واقعی نام ہے ایک قوتِ جاذبہ کا۔۔۔۔۔۔ اگر فریفتگیٔ عشق سچ مُچ کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اک کشش

پنہاں کو! اگر شگفتگیٔ نیازعنوان ہے حقیقتاً ایک فوری اثر انگیزی کا! تو۔۔۔۔۔۔اے صرفِ تغافل، اے محوِ بے نیازیٔ مطلق، تیری نگاہِ التفات نے اب تک درسِ بیداری کیوں نہ لیا، تیری روح کے خوابیدہ اثرات نے اب تک کیوں انگڑائی نہ لی۔ تیرے افکارِ روحی کی رنگینیوں میں اب تک کیوں نہ محبّت کی گُدگُدی پیدا ہوئی؟''

آپ کے رسالے کے ہزار ہا خریدار ہوں گے مگر اِس ہجوم میں۔۔۔۔۔۔صرف میں ہی وہ خریدار ہوں جو اپنی نادانیٔ جذبات کی بدولت اپنے آپ کو آپ کا خریدار سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔۔آہ۔

ایک مدت تک دلِ غمگین کو سمجھاتے رہے
الغرض سو سو طرح سے دل کو بہلاتے رہے
اب مگر چلتا نہیں دل پر فریبِ آرزو
یوں تو ہم کھایا کیے ، اکثر فریبِ آرزو

بذریعہ''بہارستان''، جواب دیجئے۔۔۔۔۔۔۔۔راز داری کی تاکید۔

والسّلام
ایک پردہ نشین۔۔۔۔۔مگر
مجبور

دوشیزہ''(44)

محترمہ کا یہ پہلا خط ہے جو گمنام ہے، مگر اظہارِ عشق ہے مگر فریق ثانی سے خوابیدہ اثرات کے اب تک انگڑائی نہ لینے کا شکوہ بھی۔ اِس کے ساتھ مرصّع عبارت کی دلکشی بھی دامن دل کو کھینچتی ہے۔کتاب میں اِس خط کے بعد''بہارستان'' کے شمارہ نومبر 1926ء میں اِس گمنام خط پر تبصرے سے اقتباس ہے:

''اِس تحریر کو بھی ایک خاتون کے نقوشِ قلم سے فیض یاب ہونے کا دعویٰ ہے۔لیکن درحقیقت اِس کے پردہ میں ایک''ریشائل'' چہرہ جلوہ فرما ہے۔ اِظہارِ غُصّہ بُری چیز ہے ورنہ ہمیں صاف کہنا چاہیے کہ اگر ہمارے سامنے ہوتو ہم سے بے اختیارانہ''مُنہ نوچنے'' کا جرم سرزد ہو جائے۔''

اقتباس از''بہارستان''نومبر 1926ء(45)

یعنی اختر کو شبہ ہی نہیں، یقین ہے کہ عورت کے پردے میں کوئی مرد یہ خط لکھ رہا ہے۔ اِس سے آگے

نذر سجاد حیدر کے ایک مضمون کا اِقتباس ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے نوجوان باہمت بھائی اختر صاحب شیرانی نے اپنے رسالہ ''بہارستان'' میں یہ باریک پردہ اُلٹا دیا اور ان ادبی مضامین نگارِ بُرقعہ پوش حضرات کے نقاب اُلٹ دیے۔ انھوں نے کسی تازہ اشاعتِ ''بہارستان'' میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ ہم پر یہ جادو نہ چلے گا۔ ہم نے بخوبی جان لیا ہے کہ اِس زنانہ شاعرانہ نام کے برقعہ کے اندر کون ہے۔''

(ہندوستان کی کم علم مضامین نویس خواتین)

از نذر سجاد حیدر

مرقع ماہِ دسمبر 1926ء (46)

کتاب میں موجود نہیں ہے مگر لگتا ہے کہ سلمیٰ کا کوئی اور خط آیا ہے جس کے جواب میں کوکب کا خط ہے، جس میں اُنھوں نے صاف اپنی بے یقینی اور بے اعتباری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آپ کو مجھ سے میری ''نا آشنائی رحم'' کا شکوہ ہے۔۔۔۔۔ مگر جب مجھے سرے سے اس ''تھیٹر'' کی سی فریب آرایانہ اور محض ستم ظریفانہ تناظر پر اعتماد نہ ہو تو آپ ہی انصاف کیجئے! میں اِن گلے شکوؤں کا کیا جواب دوں؟'' (47)

اختر کو ابھی تک اِس فریب آرایانہ اور ستم ظریفانہ مناظر پر اعتماد ہی نہیں۔ یہ خطوط 1926ء کے اواخر کے ہیں۔ اختر صاحب کو اِن خطوط پر نہ اعتماد ہے اور نہ یقین کہ یہ کسی خاتون کے ہیں (خاتون ابھی تک گمنام ہے، اپنا نام اور پتا ظاہر نہیں کیا)۔ اختر صاحب اِن خطوط کو عورت کی بجائے مرد کے سمجھ رہے ہیں اور اِسی اثنا میں اختر صاحب کی شادی ہو جاتی ہے۔ مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''دسمبر 1926ء کی کرسمس کی تعطیلات میں وہ (حافظ محمود شیرانی) اپنے بیٹے محمد داؤد خاں (اختر شیرانی) کی شادی کے لیے مارواڑ گئے۔ اختر صاحب کی نسبت حافظ صاحب کے چھوٹے چچا یعقوب خاں کی نواسی سے ہوئی تھی جو محمد احمد خاں شیرانی کی دُختر تھیں۔ حُرمت بانو نام تھا۔'' (48)

مگر حکیم نیّر واسطی صاحب جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ:

''اختر کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے اکثر لمحات میرے ساتھ بسر ہوئے اور وہ بیشتر سوانح اور حوادث جو سلمیٰ کے عشق اور اُن کی رومانی زندگی میں اُن کی نظموں کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں

میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔"(49)

وہ اختر کی حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اختر کے عشق کی ابتداء سلمیٰ کے ایک مکتوبِ محبّت سے ہوئی جو اُنھوں نے اُن کے ''خیالستان'' (خیالستان نہیں، ''بہارستان'') میں اُن کی تصویر سے متأثر ہو کر لکھا تھا جس میں اختر فکرِ شعر میں ایک عجیب عالمِ محویت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔اختر کے نام سلمیٰ نے اپنا یہ سب سے پہلا مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے قصداً اپنا مکمل پتہ نہیں لکھا تھا۔مگر اِس خط کو پڑھ کر وہ دیوانہ ہو گئے اور نتیجہ اب اس کا یہ تھا کہ اپنے محبوبِ لامکاں کے عرش کا پتہ معلوم نہ ہونے کے باوجود ایک دیوانگی تھی جو اختر کو اُس کی تلاش میں کشاں کشاں لیے پھرتی تھی۔ چنانچہ شاعر کا مشغلۂ حیات اب یہ تھا کہ وہ نامۂ محبوب کو سینے سے لگائے دن بھر اُس کی تلاش میں اپنے خیالوں میں مست دُنیا اور دُنیا والوں کے طعن ہائے رُسوائی سے بے نیاز شہر کے ہر کوچہ و برزن کی خاک چھانتا تھا۔وہ شہرِ جاناں میں درِ جاناں پر جبیں سائی کے لیے ہر سنگِ آستاں پر جھکتا اور ہر در و بام کو حیرت و حسرت سے دیکھتا۔"(50)

نیّر واسطی صاحب نے اِس پہلے نامعلوم اور گمنام خط کے بعد اختر کے اس نادیدہ محبوب سے عشق اور عشق میں جنوں کی کیفیت اور حالت پر ایک طویل مضمون باندھا ہے اور یہ مضمون بڑا اجذ باتی ہے اور اِس کے ایک ایک لفظ سے اختر کی حالتِ جنوں اور کیفیت عیاں ہے اور حکیم نیّر واسطی کے حُسنِ بیان کا اعجاز ہے۔ یہ واقعات 1926ء کے اواخر اور 1927ء کے شروع سے تعلق رکھتے ہیں۔ستم یہ ہے کہ اُس وقت تک حکیم صاحب سے اختر کی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔اُن کی باقاعدہ ملاقات اپریل 1932ء میں ہوئی۔ اِس ملاقات بارے عاشق حسین بٹالوی بیان کرتے ہیں:

''اپریل 1932ء کا ذکر ہے ایک روز اختر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ ''میرا بچّہ بیمار ہے اور بیوی کا اصرار ہے کہ حکیم نیّر واسطی اُسے آ کر دیکھیں۔آپ حکیم صاحب کے بہت دوست ہیں چل کر حکیم صاحب کو لائیے۔میں نے سنا ہے وہ کسی مریض کو دیکھنے اُس کے مکان پر نہیں جاتے۔''

میں نے پوچھا ''آپ کی حکیم صاحب سے شناسائی نہیں ہے کیا؟''

بولے ''میں صرف ایک بار اُن سے ملا ہوں۔۔۔۔۔''

میں اور اختر اُس شام حکیم صاحب کے دولت کدے پر چونے منڈی میں حاضر ہوئے۔۔۔۔

اس کے بعد اختر اور حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے جو روز بروز استوار ہوتے گئے۔" (51)

اِس اِقتباس سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اختر اور حکیم صاحب کا تعلق اپریل 1932ء میں قائم ہوا اور پھر جس طرح حکیم صاحب نے اختر کا ساتھ دیا اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں مگر تعجّب محض اِس بات پر ہے کہ وہ 1927,1926ء کے واقعات بھی اِس طرح بیان کر رہے جیسے وہ اختر کے پاس ہوں، کیفیت خود دیکھ رہے اور محرم راز ہوں۔ حکیم صاحب مزید لکھتے ہیں:

"اِسی طرح بہت سی راتیں بسر ہو چکی تھیں اور اب مہینے گزر چکے تھے کہ سلمیٰ کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔۔۔آخر حُسن کو عشق کی بے بسی اور بے چارگی پر اَب رحم آ گیا۔یعنی سلمیٰ نے بارِ دِگر اختر کو اپنے محبّت نامہ سے نوازا۔۔۔ یہ خط ایک رنگین اور عطر بیز لفافے میں مستور تھا۔ایک معصوم اور ننھا قاصد اس کو لایا تھا۔۔۔۔۔ اِس مرتبہ اس محبّت نامۂ شمامہ میں منزلِ جاناں کا پورا پتہ زینتِ سرِ قرطاس تھا۔آہ وہ منزلِ جاناں اور وہ۔۔۔۔۔حریمِ ناز جس میں ایک شمع بے پروانہ جل رہی تھی۔" (52)

اپنے اِس پہلے باقاعدہ خط میں سلمیٰ نے جہاں اپنی محبّت کا اِظہار کیا وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"میرے خط نہ لکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں خدانخواستہ کسی اور خیال میں محو تھی بلکہ اِس کا باعث یہ تھا کہ میں "آپ کی نو عروسانہ خلوت وجلوت" میں مخل ہونا نہیں چاہتی تھی۔" (53)

یعنی پہلا باقاعدہ خط جس میں اپنا نام اور پتہ بتایا گیا ہے، اُس وقت لکھا جب اختر کی شادی ہو چکی تھی اور نادیدہ محبوب کو اس کی خبر بھی تھی۔اپنی محبّت کے بارے یوں لکھتی ہیں:

"دو سال کی طویل اور رُوح فرسا مُدت سے غم ہائے محبّت سہتے سہتے میری حالت یہ ہوگئی ہے کہ

صورت میں خیال رہ گئی ہوں (54)

اِس کے بعد سلمیٰ کا دوسرا خط ہے جس میں اُس نے یہ تحریر کیا ہے کہ:

""آپ کی "دل خراش طنزوں" سے متأثر ہو کر میں نے آپ کے اِس قول پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیا ہے کہ "محبّت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ محبّت ہے۔خواہ اس کا علم فریق ثانی کو ہو یا نہ ہو" اور یہ کہ سچی محبّت کو جوابی محبت سے بے نیاز ہونا چاہیے۔" (54-A)

اِس تمہید کے بعد اپنے عریضہ کا جواب عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے اور کچھ سوالات کے جوابات بھی

مانگے گئے ہیں۔جن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ:

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو میری ''غیر فانی اور بے غرض محبّت'' کا اب تک یقین نہیں آیا اور آپ اِسے محض ایک فریب سمجھتے ہیں۔''(55)

اِس کے جواب میں کوکب نے جو خط لکھا ہے اُس میں دل کھول کر رکھ دیا ہے۔اس میں احساسات و جذبات کا اِظہار بھی ہے اور اعترافِ محبّت بھی۔اور اپنی شادی (اختر کی) ہو جانے کے باعث سلمیٰ کو حاصل نہ کرنے کا ملال بھی۔اور اِس سلسلے میں والدین کا جو کردار اور اختیار ہے سخت ترین الفاظ میں اس کا شکوہ بھی۔اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جذباتِ لطیفہ کی غارت گری،محبّت پرست روحوں کی یہ بربادی سب سے زیادہ جس چیز کی گلہ مند ہے وہ ہمارے والدین کی حماقتیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔ہماری معاشرت کے دامن پر سب سے زیادہ نمایاں جو ہماری بدنصیبیوں کی تکمیل کی مُہر بنا ہوا ہے،والدین کا وہ ناجائز اختیار ہے جو اُن کو اپنی ہوش مند اولاد کے ازدواجی معاملات میں حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔کتنے رقیق وصمیم جذبات ہیں جو والدین کے ظالمانہ اختیار کی اُلٹی چُھری سے چُپ چاپ ذبح ہو جاتے ہیں اور دم نہیں مارتے۔کس درجہ لطیف و نازک افکار ہیں جو والدین کے اِس ملعون،اِس وحشیانہ،اِس شیطانی اختیار کے مذبح میں،مقتل میں ہر وقت،ہر لمحہ ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔''(56)

والدین کے اِن غیر آئینی،غیر اصولی،غیر شرعی اور شیطانی اختیار کا تذکرہ اپنی شادی کے جواز یا مجبوری کی وضاحت کے لیے ہے۔اس کے بعد شدید غم کا اِظہار ہے کہ اب سلمیٰ کا حصول ناممکن ہو گیا ہے۔اور آخر میں پہلی اور آخری ملاقات کی اِلتجا ہے۔لکھتے ہیں:

''کیا میری محبّت کو اِتنا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ عمر بھر میں پہلی اور آخری مرتبہ تمھارے چند روحی لمحے طلب کر سکے۔۔۔۔۔۔چند لمحے،اِتنی مُہلت،آہ!بس اِتنی مُہلت کہ میں تمھارے قدموں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں مل کر اپنے دل کو تسکین دے سکوں۔''(57)

اِس فسانۂ دردوغم اور داستانِ حسرت واَلَم کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہے کہ:

''میں تم سے ملنے کی پہلی اور آخری مرتبہ ملنے کی کوشش کروں گی۔''مگر ساتھ ہی یہ بتانا بھی ضروری سمجھتی ہے کہ ''میری عمر کے ان 16 سالوں میں یقین جانیے کہ یہ سب سے پہلی مرتبہ،سب سے پہلا

اتفاق ہے کہ میں آپ سے اور صرف آپ سے ملنے کا وعدہ کر رہی ہوں، اِس حال میں کہ ''ناجائز ملاقات'' کے لیے میرا ضمیر مجھ پر لعنت کر رہا ہے ۔۔۔۔۔ اِس کشمکش انگیز حالت میں بھی اپنی اور آپ کی ایک طویل عرصہ کی بے تاب آرزوؤں، بے صبر ارمانوں اور بے قرار حسرتوں کی خاطر اپنے ایفائے عہد میں ثابت قدم رہوں گی۔۔۔۔۔۔ پرسوں 27 جنوری (غالباً 1927ء) جمعہ کے دن ٹھیک ایک بجے شب کو میں آپ کی قدم بوسی کے اِشتیاق میں مضطرب و بے تاب ہوں گی۔''(58)

یہ خط پا کر اختر پر کیا گزری، اِس رنگین داستان کو حکیم نیرّ واسطی نے بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاقات سے پہلے کی کیفیت، ملاقات اور ملاقات میں حُسن و عشق کا والہانہ انداز اور شبِ وصل کے بعد اختر کی کیفیت اور حالت، یہ ساری کہانی حکیم صاحب نے بڑے چسکے لے کر بیان کی ہے اور اختر کی شادی اور نظموں کے حوالے اور پس منظر بیان کیا ہے۔ اپنے اسی خط میں سلمیٰ نے یہ بھی گِلہ کیا ہے کہ:

''اگر آپ چاہتے، اِک ذرا سی کوشش کرتے تو میں آپ کو مل جاتی یا دوسرے لفظوں میں آپ مجھے پا لیتے۔ آہ! نہایت آسانی کے ساتھ پا سکتے تھے مگر آپ نے تو۔۔۔۔۔ لیکن میں بے وقوف ہوں۔''(59)

حکیم نیرّ واسطی صاحب نے بھی اِسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جا سکتا تھا لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا۔''(60)

رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہونے کی وجہ حکیم نیرّ واسطی صاحب نے نہیں لکھی البتہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب بیان کرتے ہیں:

''اختر شادی شدہ تھے۔ محمود صاحب (حافظ محمود شیرانی) کی بھانجی حُرمت بانو سے اُن کی شادی ہو چکی تھی اور اب محمود صاحب اس کو کسی طرح گوارا نہ کرتے کہ اُن کے ہوتے ہوئے اختر کو دوسری شادی کی اجازت دیں۔ اختر اپنی تمام بے راہ رویوں کے باوجود اپنے والد کا بڑا احترام کرتے تھے، اُن سے ڈرتے تھے اور کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے جو اُن کے مزاج کے خلاف ہو۔''(61)

اختر شیرانی والدین کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے بھی محبّت اور شادی بارے اپنا ایک واضح مؤقف رکھتے ہیں۔ وہ (کوکب) اِس حوالے سے اپنے خیالات اور جذبات کا اِظہار یوں کرتے ہیں:

''محبّت حقیقتاً جذبات شباب کی دراز دستیوں سے بلند، ایک غیر مرئی احساس ہے، ایک ملکوتی جذبہ ہے، ایک فردوسی شگفتگی ہے، ایک آسمانی نغمہ ہے، جو کبھی نفسانی اغراض کے پیکر میں نہیں سما سکتا۔ الحمدللہ کہ میرا دل مطمئن ہے، میری روح ایک بچے کی طرح شاد، ایک نو شگفتہ کلی کی طرح شاداب ہے اور میرے جذبات پُرسکون۔ ایک ملکوتی خواب کی طرح پُرسکون، سلمیٰ کی معصومیت۔ آہ، اُس کی معصوم رعنائی یوسف کا دامن نہیں بن سکتی، میرے شباب کے طوفانی ولولے زلیخا کا ہاتھ نہیں بنیں گے۔ فرشتوں کے تقدّس کی، حوروں کی پارسائی کی، کلیوں کی معصومیت کی، نغموں کی دوشیزگی کی، بچوں کی مسکراہٹ کی قسم مجھے اُس کا بھول کر بھی خیال نہیں آیا۔''(62)

سلیم احمد کو اِس ملکوتی جذبے پر سخت اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر کے نزدیک فطرت ایک سچ ہے جس پر آدھے دھڑ کی عورت کے ساتھ لپٹ کر وہ ملاقات کرتا ہے مگر اِس شرط کے ساتھ کہ اس کی تقدیس ملکوتیت اور پاکیزگی پر آنچ نہ آنے پائے، دراصل ایک مخصوص تناظر میں اُن کے کسری آدمی (ادھورا آدمی) کے تصوّر کی نمائندگی کرتا ہے۔''

سلیم احمد کے اِس اعتراض کا بڑا مدلّل جواب ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سلیم احمد نے اِس نکتے کو نظر انداز کر دیا کہ اختر فطرت کے تقدّس کا قائل ہے اور عورت اُس کے ہاں فطرت کا ایک مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں عورت کی سراپا نگاری اور رومان پرور جذبات کے بیان میں جنسیت اور شہوت منہا ہو جاتی ہے۔ اختر کے ہاں مرد/ انسان فاعل ہے اور عورت/فطرت مفعول ہے۔ یعنی محبّت کیے جانے کے قابل ایک معروض۔ یہاں مرد یا انسان عورت یا فطرت کا اِستحصال نہیں کرتا، اس سے محبّت کرتا ہے۔ یہ مرد اور عورت یا انسان اور فطرت کے رِشتے کی ایک مثالی تعبیر ہے۔''(63)

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کی اِس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ:

''رومانی طرزِ فکر نے اُن کی قوتِ عمل مفقود کر دی تھی۔ وہ صرف خیال کی دُنیا میں رہتے تھے، عمل سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ویسے بھی وہ شادی کو شباب کے لیے غارت گر اور اس کی معصومیت کے لیے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔''(64)

اِن باتوں کو مدِّ نظر رکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سلمیٰ کو حاصل کرنا، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا، اختر کی ترجیح میں شامل ہی نہیں تھا۔ حُسن کی غارت گری اُسے قبول ہی نہیں تھی۔ اس کی

محبت تو انسان اور فطرت کے رِشتے کی ایک مثالی تعبیر ہے۔ اور اِس کہانی کو ''شاعر کا خواب'' قرار دے کر رنگین بھی بنایا ہے اور مثالی تھی۔

شبِ وصل کے بعد کوکب صاحب نے جو خط لکھا ہے، اُس میں اپنے دردِ فراق اور دل کی بے تابی کے بڑھ جانے کا ذکر ہے اور وصل کے لمحوں میں محبّت کے نشوں میں سرشار ہونے کی کہانی بھی تحریر کی ہے۔ کوکب صاحب لکھتے ہیں:

''میں سوچتا ہوں کہ اُس رات جو موجِ رنگ و بُو میرے سر سے گزری وہ کوئی پُر فریب خواب نہ ہو؟ مگر میرے گستاخ ہونٹوں کی حلاوت، وہ حلاوت جو انھوں نے تمھارے گلاب کی سی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں سے چھینی تھی، مجھے کہتی ہے کہ یہ خواب نہ تھا۔''(65)

اپنی اِس زیادتی یا گستاخی اور سلمیٰ کی خفگی کا ذکر بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے کچھ بدگمان یا خفا ہوگئی ہیں۔ خفگی کی تو میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا سوائے اُس رات میرے ہونٹوں نے دو ایک گستاخیاں کرنے کی جسارت ضرور کی تھی! اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے ہزار بار معافی چاہتا ہوں اور آئندہ ملاقات میں آپ دیکھ لیں گی کہ میں اِس معاملہ میں کس قدر ضبط کرسکتا ہوں۔۔۔۔۔۔لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں نے فضائی ''جذبات انگیز'' حالت کے باوجود اس سے آگے بڑھنے کی جُراَت نہ کی، تو کیا آپ میری محبّت، محبّت کی معصومیت، اِس کی ملکوتی اور مقدّس حیثیت کی داد نہیں دیں گی؟ کیا اب بھی مجھ سے شکایت ہوگی کہ مجھے آپ کی ناموس کا پاس نہیں۔''

اِس خط کی پشت پر سلمیٰ نے لکھا ہے:

''میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ آپ اِنسان نہیں ایک ''دیوتا'' ہیں اور آپ کی اِس دیویت کی شان نے مجھے خرید لیا ہے۔''(66)

خط میں اِس بات کا بھی انکشاف ہے کہ کوکب صاحب نے سلمیٰ سے اپنے خطوط واپس طلب کیے ہیں اور سلمیٰ نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کے خطوط بھی واپس کیے جائیں۔ کوکب خطوط کی ایسی واپسی کو ''بنیے پن'' سے تعبیر کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے خطوط ''ناول'' کے لیے طلب کیے ہیں۔ یعنی وہ ان خطوط سے کوئی ناول لکھنے کا اِرادہ رکھتے ہیں اور ''شاعر کا خواب'' کے نام پر منظرِ

عام پر لانا چاہتے ہیں۔ سلمیٰ اِس پر اپنے سخت ردِّ عمل کا اِظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''آپ کو کون سا حق حاصل ہے کہ آپ میری بے اختیارانہ اُفتادگیوں اور اپنے بے رحمانہ طرزِ عمل کو ''ایک شاعر کا خواب'' بنا کر منظرِ عام پر لائیں اور فضائے عالم میں مجھے جی کھول کر رُسوا کریں۔۔۔۔۔۔ میں التجا کرتی ہوں کہ مہربانی کر کے ''شاعر کے خواب'' میں میرے خطوط نہ نقل کیجئے۔ خواہ وہ سلمیٰ ہی کے نام سے کیوں نہ ہوں۔ میں آپ کی منتیں کرتی ہوں کہ ہرگز نقل نہ کیجیے۔ علاوہ بریں ''فسانہ'' اِس انداز میں لکھیے کہ ناظرین پر حقیقت منکشف نہ ہونے پائے۔''(67)

اِس کے بعد ایک اور خط میں اِس بات کا اِظہار کرتی ہیں:

''یقین فرمائیے کہ مجھے اپنے خطوط کے بارے میں آپ سے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔۔۔۔۔ بخدا مجھے آپ پر، آپ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ آپ کی شرافت و نجابت پر اعتماد ہے۔ یقیناً آپ میری عزت و آبرو کا اِتنا ہی پاس و لحاظ رکھیں گے جتنا ایک بھائی اپنی بہن کا رکھ سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری محبّت (جو مجھے آپ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی) عام محبّتوں سے بالکل علیحدہ ہے''(68)

ایک اور خط میں سلمیٰ نے اپنے خدشے کا اِظہار یوں کیا ہے:

''زبانی جمع خرچ اور لفّاظی سے احتراز کیجیے اور کوئی عملی ثبوت دیجئے۔ ہاں میں عملی ثبوت چاہتی ہوں اور وہ۔۔۔۔۔ وہ صرف یہ ہے کہ اپنی سلمیٰ کو آنے والی رُسوائیوں اور بدنامیوں سے بچائیے کہ کہیں غریب گنہگار، گناہِ بے لذّت کی مصداق بن کر نہ رہ جائے۔ اِس خیال نے مجھے اندیشوں کے بحرِ عمیق میں غرق کر رکھا ہے۔ آپ، نہیں، توبہ۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ آپ کی وہ راز داں ہستیاں عنقریب کوئی فتنہ برپا کرنے والی ہیں۔''(69)

سلمیٰ کے یہ خدشات صحیح ثابت ہوئے اور ''شاعر کے خواب'' کی کیا کیا تعبیریں ہوتی رہیں اور یار لوگوں نے کیا کیا کہانیاں گھڑ لیں۔

بہرحال ''ملکوتی معصومیت'' سے مملو ملاقاتیں بھی جاری رہیں۔ خط و کتابت بھی ہوتی رہی، حالِ دل بھی بیان ہوتا رہا اور گلے شِکوے بھی۔ آخر کار 1933ء کو اِس محبّت کا ڈراپ سین ہوا۔ سلمیٰ کی شادی ہو گئی۔ شادی کی خبر، شادی کا دِن اور پھر شادی کے بعد ملاقات اور اُس کے بعد اختر کی زندگی کے شب و روز، اِس کی تفصیل نیّر واسطی صاحب نے بیان کرتے ہوئے زورِ قلم صَرف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر کو جب خبر ہوئی کہ سلمیٰ طوعاً و کرہاً کہیں سلسلۂ ازدواج میں منسلک کی جارہی ہیں تو اُن دِنوں اُن کی حالت اِس قدر غیر ہوگئی تھی کہ وہ غم سے نڈھال ۔۔۔۔۔دیوانہ وار دن بھر اِدھر اُدھر پھرتے اور رات بھر تڑپ تڑپ کر صبح کرتے ۔۔۔۔۔اور اِس اثنا میں کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ اُنھوں نے مختلف ذرائع سے خودکشی کی کوشش کی۔ایک مرتبہ چھت کی بلندی سے گر کر مرنے کی سعی کی۔۔۔۔۔سلمیٰ کو جب اِن حالات کا پتہ چلا کہ میرا ''شاعر'' مرنے کی تیاری کر رہا ہے تو اُنھوں نے ضروری سمجھا کہ اختر کو خودکشی سے باز رکھا جائے۔چنانچہ اُنھوں نے ان کو بلایا۔۔۔۔۔۔سلمیٰ سراپا سوز وگداز بن کر زار زار رونے لگیں اور ادھر اختر بھی سلمیٰ کے قدموں پر سر رکھ کر کچھ اِس طرح روئے کہ بے تاب ہوگئے۔دونوں پر دیر تک یہ حالت طاری رہی۔۔۔۔۔اس کے بعد سلمیٰ نے اختر کو گلے سے لگایا۔دیر تک اُن کا مُنہ دیکھا اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے ایک حسرت ناک آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر کہا ''اختر! جاؤ اب تم اور ہم حشر کے دن ملیں گے۔''اختر پر یہ آواز برقِ بلا بن کر گری۔وہ بے چین اور بے قرار ہو کر فرشِ خاک پر گر پڑے۔۔۔۔۔''(70)

''سلمیٰ کی شادی کی رات اختر کے لیے ایک قیامت کا دن تھا۔اُس رات اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔وہ کبھی اُٹھتے اور دیوار سے سر پھوڑنے لگتے،کبھی بھاگتے اور چھت سے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتے۔''(71)

سلمیٰ کی شادی ہوئے اب مُدّت ہو چکی تھی اور وہ اب اپنے گھر بار کی ہو چکی تھی اور اُس سے ملنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، مگر اختر ہر وقت سلمیٰ کو یاد کرتے، رات بھر اُس کی یاد میں روتے اور دن بھر اُن کے حسین تصوّر کی رنگینیوں میں محو رہتے۔بس اُس کی یاد ہی میں تڑپتے تھے۔سلمیٰ کو جب اختر کی اِن لیل ونہار کی جان کاہ بے قراریوں کا علم ہوا اور اُنھوں نے سنا کہ اختر اِس طرح جلد از جلد اپنی زندگی ختم کرنے کا اِرادہ کر چکے ہیں تو اُنھوں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار اور اختر کو بلا کر اِس سلسلے میں اُن سے گفتگو کی جائے۔چنانچہ اُنھوں نے اختر کو گجرات کی ایک وادی میں پھر ملاقات کی دعوت دی۔ اِس ملاقات کا حال حکیم نیّر واسطی نے یوں بیان کیا ہے:

''سلمیٰ نے اختر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''اختر! مجھے تمھاری بے تابیوں اور بے قراریوں اور اِس زندگی سے بے زاری کا حال معلوم ہے۔اور تم یقین کرو میں بھی تمھاری طرح مضطر و بے قرار ہوں۔

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اِس دُنیا میں اِس دُنیا کی چند روزہ زندگی گزارنے کے لیے جبراً اِن حالات میں اسیر کر دی گئی ہوں اور اب میرے نسبی ننگ و ناموس کا تقاضا یہ ہے کہ میں جس آزمائش میں مبتلا کر دی گئی ہوں پوری ذمہ داری اور صبر و اِستقامت کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہو جاؤں اور جس طرح ہو سکے یہ وقت گزار دوں۔ پس تم یقین کرو کہ یہ دُنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ اِس کے بعد تم اور ہم ان شاء اللہ حشر میں ملیں گے۔۔۔۔۔۔ اُس وقت کا انتظار کرو جب تم اور ہم ایک جگہ بہشت کی وادیوں میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس کے بعد اختر و سلمیٰ دونوں دیر تک روتے رہے اور اِس قدر روئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اور پھر اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اِس طرح جدا ہوئے کہ پھر جیتے جی نہ مل سکے۔" (72)

حکیم صاحب نے اختر و سلمیٰ کی یہ داستانِ عشق اور میل ملاقاتوں کی رُوداد اِس طرح لکھی ہے جیسے وہ چشم دید گواہ ہوں اور آنکھوں دیکھا حال لکھ رہے ہوں۔ اور اِس ساری داستان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "سلمیٰ کے حصول میں ناکامی کے بعد (حالانکہ حصول کی بالکل کوشش ہی نہیں کی گئی) اختر نے اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لیے رِندی و مستی اور ہوس ناکی و حُسن پرستی کو آہستہ آہستہ اپنا شیوہ بنا لیا۔۔۔۔ حالات نے اُنھیں اِس راہ پر ڈال دیا تھا اِس لیے وہ اِس پر چلتے گئے تا آنکہ وہ دل پر سلمیٰ کی محبّت کا داغ لیے اِس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔

اِدھر نیّر صاحب یہ رنگین داستان اور اِس کے الم ناک انجام کے قصّے بیان کر رہے ہیں اور دُوسری طرف کوکب نے اِس افسانے کو ایک خوب صورت موڑ دے کر "شاعر کے خواب" کی تعبیر بیان کی۔ سلمیٰ کے آخری دو خط ایک اور ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔

سلمیٰ کی شادی کے بعد بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا مگر دونوں اِس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ایک دوسرے کا حصول ممکن نہیں اِس لیے ایک دوسرے کو بھول جانے کے مشورے دے رہے ہیں۔ اِس لیے سلمیٰ ایک خط میں اِس بات کا ذکر کرتی ہیں:

"آپ اب ماضی کی تلخ یاد کو بھول جائیے۔۔۔۔۔ میں آپ کی محبّت کے قابل نہیں رہی۔ اور نہ آپ اس

کی بے پایاں اور بے لوث محبّت کے لائق رہے۔'' (73)

اِس کے جواب میں کوکب صاحب بھی لکھتے ہیں:

''یقیناً میں تمھاری محبّت کے لائق نہیں رہا۔ بہر حال اِس قصّے کو چھوڑ دیئے اور چونکہ اب حقیقتاً ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانا چاہیے۔ اسے بھول جائیے۔ بھلا دیجیے۔'' (74)

مگر کوکب صاحب اِس افسانۂ محبّت کو اِن خطوط کے ذریعے ایک ''شاعر کا خواب'' کی صورت مرتّب کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں، اِس لیے سلمیٰ سے اپنے تمام خطوط کی واپسی کا مطالبہ بھی کر رہے اور سلمیٰ کی راہ نمائی بھی چاہتے ہیں۔ اِس سلسلے میں سلمیٰ لکھتی ہے:

''میں ''ایک شاعر کا خواب'' کے لیے اپنے بعض حالات ایک کہانی کی شکل میں قلم بند کر رہی تھی کیونکہ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ فسانہ لکھنے میں میری راہ نمائی کرو۔''(75)

اور مذکورہ کتاب میں ''ہلاکِ تلوّن'' (میری غم ناک زندگی کے درد انگیز حالات) ایک افسانہ کی تمہید از سلمیٰ بھی شامل ہے۔ اور کوکب صاحب نے بھی اپنی ڈائری کا ایک ورق شامل کیا ہے۔ کوکب صاحب ''ایک شاعر کا خواب'' خطوط کی شکل میں مرتّب کرنے کے خواہاں ہیں اور سلمیٰ کو اِس حوالے سے تحفّظات ہیں۔ اُسے اپنی رُسوائی کا خوف ہے اِس لیے وہ اپنے خطوط واپس کرنے کا بار بار مطالبہ کر رہی ہے، مگر کوکب صاحب کا اِس سلسلے میں رویّہ اتنا مثبت نہیں۔ وہ اپنا ناول یا افسانہ یعنی اپنی کتاب ''ایک شاعر کا خواب'' خطوط ہی سے مرتّب کرنا چاہتے ہیں۔ سلمیٰ کے آخری دو خط، خطوط کی واپسی کا مطالبہ کوکب کے سرد مہر رویّے کے خلاف شدید احتجاج اور اُن کی بے وفائیوں کا تذکرہ ہے۔ سلمیٰ لکھتی ہے:

''میں آپ کے تمام مکتوبات واپس کر چکی ہوں، اب آپ کو بھی ایسا کرنا چاہیے تاکہ میں بھی آپ کی طرح اُس طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔ مطمئن ہوسکوں، مگر آپ سے ایسی اُمید کہاں؟ آپ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ میں کم بخت ہمیشہ پریشانِ خاطر اور محرومِ تسکین ہی رہوں۔ معلوم نہیں آپ کو مجھ سے اِتنی عداوت کیوں ہے؟ یا اب ہوگئی ہے۔'' (سلمیٰ نے لفظ ''عداوت'' استعمال کیا ہے جو اِس داستانِ عشق کی بہت سی پرتیں کھول رہا ہے) خط میں آگے لب ولہجہ مزید سخت ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''یقیناً میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ کی ہر بات جھوٹ، فریب اور دغا تھی۔ آپ

نے اپنے خطوط بھی اِس لیے واپس مانگے تھے کہ اِس طرح آپ کی غلط بخشیوں یا فریب آرائیوں کے ثبوت میرے پاس نہ رہیں۔آہ آپ کو مجھ سے ذرا بھی اُنس نہ تھا۔" (کوکب صاحب توسلمیٰ کی محبّت اور پھر فراق میں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور سلمیٰ کو اُن کی محبّت ہی کا یقین نہیں ہے)وہ مزید لکھتی ہیں:

"آپ کے وہ تمام داعیاتِ محبت تصنّع اور بناوٹ پر مبنی نکلے اور مجھے، مجھ عقل کی اندھی، نادان لڑکی کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے ایک پُر مذاق سین اور بس۔سوچیے اور شرما جائیے۔آپ نے کس بے دردی کے ساتھ مجھ سے میری زندگی اور زندگی کی تمام حسرتوں کو چھین لیا ہے۔غارت کر دیا ہے۔آہ! تباہ کر دیا ہے۔کس سنگ دلی سے میری امیدوں اور آرزوؤں کو پامال کر دیا ہے۔مسل دیا ہے۔" (77)

خط میں صرف کوکب کی سنگ دلی اور اپنی زندگی کی مسرتوں کے چھن جانے اور امیدوں، آرزوؤں کی پامالی ہی کا ذکر نہیں بلکہ کوکب کے کردار وعمل کو بھی واضح کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

"مجھے رنج ہے، کہہ نہیں سکتی کس درجہ رنج ہے کہ میں اب تک آپ کے سے ظاہر دار، ریا کار، محبت فراموش، بے رحم، مغرور، وفا دشمن، جفا طراز، دل آزار اور ظالم آدمی کو دیوتا کیوں کہتی رہی اور کیوں اِتنی مدت تک اِس طرح نیاز مندی کے ساتھ آپ کی پرستش اپنے لیے جائز اور روا خیال کرتی رہی۔"(78)

سلمیٰ کے اِس خط کا جواب تو مذکورہ کتاب میں درج نہیں ہے مگر سلمیٰ کے اگلے اور آخری خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوکب صاحب نے کوئی خط لکھا تھا اور سلمیٰ کو عجلت پسند اور ضدّی گردانتے ہوئے ان تمام باتوں کو الزام قرار دے کر اُن کی تردید کی تھی۔سلمیٰ اپنے خط میں لکھتی ہے:

"میرے الزامات کا جواب دینے کی آپ میں کیوں ہمت ہو؟ جب کہ وہ الزامات ہیں ہی نہیں۔جب کوئی بن نہ پڑا تو یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا۔۔۔۔۔۔۔"میں نے اب اِس پہیلی کو حل کر لیا ہے۔" مجھ سے آپ کو عداوت نہیں نفرت تھی اور ہے اور یہ محض میری بے وقوفی تھی کہ میں اب تک اِس حقیقت کو نہ جان سکی۔"(79)

یہ کتاب میں سلمیٰ کا آخری خط ہے جس میں اُس نے خود کو فریب خوردہ کہا ہے۔ایک طرف کوکب صاحب ہیں جو سلمیٰ کی محبّت اور فراق میں زندگی تباہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف سلمیٰ جسے کوکب کی

محبّت کا یقین ہی نہیں بلکہ وہ اسے عداوت، نفرت اور فریب قرار دے رہی ہے۔

اختر شیرانی نے کوکب کے فرضی نام سے یہ کتاب ''ایک شاعر کا خواب'' کے نام سے مرتّب کی تھی اور اُسے خطوط کے ذریعے ترتیب دیا تھا۔ سلمیٰ کے خطوط بھی آتے رہے ہوں گے مگر اُنھوں نے اِن خطوط کی روشنی میں ایک خوب صورت افسانہ یا ناول تخلیق کیا اور اُسے خوب صورت موڑ دے کر شاعر کے خوف ناک خواب کی خوف ناک تعبیر پیش کی۔ عبارت کی رنگینی اور جذبات کی بھرپور عکاسی نے اِس افسانے یا ناول کو بہت دل کش بنا دیا اور اِس انداز سے پیش کیا کہ ایک خواب، ایک طرح کی حقیقت معلوم ہونے لگا۔

خادم حسین بٹالوی نے دو اخلاقی جرم کیے۔ پہلے تو اس مسوّدے کو چوری کیا، اور پھر کتاب کا نام بدل دیا۔ ''ایک شاعر کا خواب'' کی بجائے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کر دیا۔ اِس طرح اُنھوں نے ایک خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کی کوشش کی کہ یہ اختر و سلمیٰ کے اصل خطوط ہیں۔

''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کے بارے حسنی صاحب کی رائے ہے کہ:

''سلمیٰ کی جانب سے لکھے گئے خطوط کے بارے اچھے خاصے شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

1۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سلمیٰ کا وجود ہی نہیں اِس لیے خطوط بھی افسانہ طرازی سے زیادہ وقعت کے حامل نہیں۔

2۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سلمیٰ کا وجود تسلیم لیکن اِس قدر ادیبانہ تحریر کسی نوجوان اور نومشق خاتون (عمر ابھی 16 سال) کے بس کی بات نہیں۔ اختر نے خود ہی سلمیٰ کی طرف سے خطوط لکھ لیے ہیں۔

3۔ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ یہ خطوط سلمیٰ نے خود ہی لکھے ہیں۔ اور ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کے بقول اِس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔'' (80)

یہ کون سے لوگ ہیں اور ان میں کون کون افراد شامل ہیں؟ یونس حسنی صاحب نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ اُن کے یہ فرمودات اُنھوں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟ البتہ یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہے کہ:

'خطوط کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم مندرجہ بالا کسی گروہ سے کامل اتفاق نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔خادم

حسین صاحب نے جو مسوّدہ دیکھا تھا وہ اختر کے ہاتھ کا تیار کردہ تھا۔سلمیٰ و اختر کے اصل خطوط اس میں موجود نہیں تھے۔بلکہ ان کی نقول یا مرتّب شدہ مواد ہی بٹالوی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔'' (81)

یہ خطوط اصل نہیں بلکہ خطوط کی وہ نقل ہے جو اختر شیرانی نے کوکب کے نام سے مرتّب کیے۔وہ انھیں ''شاعر کا خواب'' کے نام سے ایک افسانے کی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول:

''جو چیز دُشواری پیدا کرتی ہے وہ اِن خطوط کا اسلوب ہے۔۔۔۔۔''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' میں اسلوب کی یکسانی کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

سلمیٰ کے خطوط میں بھی اسلوب وطرزِ نگارش کی وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو اختر اور صرف اختر سے مخصوص ہیں اور کوئی ادب شناس نگاہ دونوں کی یکسانی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرے گی اور اِس یکسانیت کے پیشِ نظر اگر کچھ لوگ ان خطوط کو بھی اختر ہی کی نگارشاتِ جمیل قرار دیتے ہیں تو اُن کے اِس شُبہ کو بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔'' (82)

مگر پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سُرا صاحب کا کہنا ہے کہ:

''سلمیٰ اور کوکب کے خطوط کے اسلوب میں بھی اور انداز میں بھی فرق نظر آتا ہے اِس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلمیٰ و اختر کے خطوط فرضی نہیں ہیں۔'' (83)

دونوں قابلِ احترام شخصیات کا زاویۂ نظر اپنا ہے مگر حقیقت یہ ہی نظر آتی ہے کہ سلمیٰ کے اسلوب پر اختر کا اسلوب حاوی ہو گیا ہے۔اور ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول:

''اختر نے عبارت میں ادبی چاشنی پیدا کرنے،زیبِ داستاں اور افسانے کو رنگین وخوش گوار بنانے اور ادبی آہنگ دینے کے لیے زبان و بیان میں خاصی تبدیلیاں کر دی ہیں۔۔۔۔۔۔اِصلاح اختر کی عادت میں شامل تھی اِس لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اختر نے سلمیٰ کی عبارت کی آرائش کے لیے اس میں کافی قلم کاریاں کی ہیں۔'' (84)

اب یہ بات تو ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے طے کر دی ہے کہ:

'افسانے'' کو رنگین بنانے کے لیے اختر نے سلمیٰ کی عبارت کی آرائش کا کام کیا ہے اور اُس کی قلم کاریاں نمایاں ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ جب کوکب نے یہ خطوط مرتّب فرمائے تو ان خطوط میں سلمیٰ کا افسانہ''ہلاکِ

"تلوّن"(مطبوعہ"کیف"،اجمیر،ستمبر1928ء،حسنی۔ص377)درج کرنے کی ضرورت کیا تھی؟اور پھر" اپنی ڈائری کے اوراق"کس مقصد کے لیے دیے ہیں؟کتاب میں تمام خطوط بھی موجود نہیں ہیں جس سے تسلسل بھی برقرار نہیں رہتا۔حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب (کوکب) کوئی خطوط کی"تدوین" کا کام نہیں کر رہے تھے۔وہ تو اِن خطوط کی روشنی میں"رنگین افسانہ"لکھ رہے تھے۔اور اسے مکمّل کرنے کے لیے جن خطوط کی ضرورت تھی صرف وہ شامل کیے ہیں۔تمام خطوط شامل کرنا ضروری نہیں تھا۔کتاب کے آخری دو خط جو سلمیٰ کے ہیں،جن میں اختر پر سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں،اختر نے اُنھیں شامل کیوں کیا ہے؟یہ شاعر کے خواب کی خوفناک تعبیر ہے جو اختر نے پیش کر کے افسانے کو خوب صورت موڑ دیا ہے، ورنہ ایک آدمی خود ہی کتاب مرتّب کر رہا ہے اور خود ہی اپنے اوپر الزامات لگا رہا ہے،کیوں؟اگر یہ خط سلمیٰ کے بھی ہیں اور وہ اِس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ"محبت کے نام پر اختر اُسے فریب دیتا رہا ہے"تو اِس کا ذکر کرنا اختر نے ضروری کیوں سمجھا ہے؟اگر یہ خطوط شامل نہ ہوتے تو کہانی کیا تھی؟محبّت،جذباتی خطوط،راتوں کو تنہائی میں ملاقاتیں،آخر الگ الگ شادی اور اپنا اپنا گھر،قصّہ ختم۔ایسے میں"شاعر کا خواب" کدھر جاتا؟اسے"شاعر کا خواب"جیسا اُردو ادب کا شاہکار"افسانہ"ہی رہنا چاہیے تھا،جسے خادم حسین بٹالوی صاحب نے"اختر و سلمیٰ کے خطوط"کا نام دے کر انتہائی زیادتی کی ہے۔یہ افسانہ اپنی جگہ بہت مکمّل اور ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے،مگر اِس حوالے سے جو احباب نے کہانیاں گھڑی ہیں،وہ دل چسپ بھی ہیں اور فتنہ انگیز بھی۔اِس بات پر تو سب متفق ہیں کہ اختر کا معاشقہ جنسی آلودگی سے قطعاً مبرّا رہا اور اختر جسمانی قربت کو محبّت اور شباب کے لیے موت خیال کرتے تھے۔پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ"سلمیٰ کی شادی اختر کی زندگی کا ایک عظیم سانحہ تھا۔۔۔۔اختر کی باقی زندگی ماتمِ سلمیٰ بن کر رہ گئی۔"(85)

1926ء میں اختر کی شادی ہوئی۔1933ء میں سلمیٰ کی شادی ہوئی،اس کے بعد بہت سی خواتین سے مراسلت رہی۔1935ء میں"رومان"جاری کیا۔1941ء میں سلمیٰ کا شہر چھوڑ کر ٹونک چلے گئے،اور کوئی ایک بھی شہادت نہیں ملتی کہ ٹونک میں اُن پر عاشقی یا دیوانگی کے دورے پڑے ہوں۔ حکیم نیّر واسطی صاحب کہتے ہیں:

"سلمیٰ سے جدا ہونے کے بعد چند برسوں تک جو کچھ ہوتا رہا،زندگی سے خوش گوار انتقام تھا یا زندگی گزارنے کا ایک شاعرانہ طریقہ اور یا پھر حُسن و جمال کی جستجو کا ایک دل فریب مشغلہ اور بس۔"(86)

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِس پر تبصرہ فرمایا ہے کہ:

''بے پناہ سگریٹ نوشی اور بغیر پانی یا سوڈا ملائے ہوئے دیسی شراب پینا، خودکشی کا ایک طریقہ ہی تو تھا۔ مرمر کے جینے کا ایک ڈھنگ۔'' (87)

کیا یہ سگریٹ اور شراب نوشی اختر نے سلمیٰ سے جدائی کے بعد شروع کی یا اس کے آثار اِس سے پہلے بھی ملتے ہیں؟ خودکشی کے اِس طریقے کو سلمیٰ سے جدائی سے جوڑنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''سلمیٰ سے جدائی کے بعد اختر کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اُنھیں بُھلا سکیں۔ اُنھوں نے سلمیٰ کو بھلانے کی کوشش میں ہر اُس آستانۂ ناز پر جبین نیاز جھکا دی جہاں اُنھیں ذرا بھی گنجائش میسّر آسکی۔ چنانچہ سلمیٰ کے بعد عذرا، اور عذرا کے بعد سندھ کی زلیخا، لکھنؤ کی مہ لقا، امرت سر کی ایک نوبہار ناز، ریحانہ، زہرہ، پروین ثریّا، نسرین، ناہید، لالہ رُخ، شمسہ، لیلیٰ اور سب سے آخر میں شیریں اُن کے بُت کدۂ تصوّرات اور اُن کی منظوم داستانوں کی زینت بنی رہیں۔'' (88)

یہ خواتین جو اختر کے بُت کدۂ تصوّر اور منظوم داستانوں کی زینت بنی ہیں، کیا اِس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اختر اِن سب سے عشق فرما کر سلمیٰ کو بھولنے یا اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟

محمد طفیل صاحب ٹونک تشریف لے گئے اور اختر شیرانی کے مٹکے سے ایسے خطوط جن میں جوانیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں، حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بہ قول اُن کے:

''مقصد یہ تھا کہ اُن لوگوں کو دِکھا سکوں جو یہ کہتے تھے کہ اختر پر کوئی بھی لڑکی نہیں مرتی اور ساری نظمیں فرضی ہیں۔'' (89)

یہ لڑکیوں کے خطوط ہیں اور محمد طفیل صاحب لوگوں کو دکھا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ''لڑکیاں اختر پر مرتی ہیں''، یعنی اِن خطوط میں عشق کا اِظہار لڑکیوں کی جانب سے ہے۔ خطوط حاصل کرنے کے بعد محمد طفیل صاحب اِن خطوط کو یہ کہہ کر ناقابلِ اشاعت قرار دے رہے ہیں کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے۔ اختر صاحب نے تو ان خواتین کے فرضی نام رکھ کر منظوم داستانیں لکھیں اور اُن کا پردہ رکھا ہے، مگر محمد طفیل صاحب کے ہاتھ جو خطوط لگے اُن میں تو اصلی نام ہوں گے۔ تبھی تو اشاعت پر ہنگامے کا خطرہ ہے۔

اگر خواتین کو اپنے اصل نام لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ یا خطرہ نہیں تھا تو محمد طفیل صاحب کو کیا مجبوری تھی؟ وہ تو خط لائے ہی اِس مقصد کے لیے تھے کہ لوگوں کو دِکھا سکیں۔ محمد طفیل صاحب نے لکھا اور یونس حسنی صاحب نے اس کی تائید کی تو بات درست ہی ہوگی کہ ''لڑکیاں اختر پر مرتی تھیں، کیا اختر بھی اُن پر مرتے تھے؟'' اِس بات کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو صرف اِتنا کہ ''دوستوں سے تذکرے ہوتے تھے اور خط وکتابت ہوتی تھی۔'' اِس سے کیا نتیجہ اخذ ہوا اختر کی ان گنت عشقیہ داستانوں کا؟

حکیم نیّر واسطی صاحب کا کہنا ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے سب کا تعلّق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔'' (90)

اِس کے باوجود یونس حسنی صاحب کا اصرار ہے کہ:

''اختر کے معاملاتِ عشق کو فرضی قرار دینا ہٹ دھرمی ہی ہوسکتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ خواتین کون تھیں اور اب کہاں ہیں؟ تو اِس کا تعلق انسان کے اس ذوقِ تجسس سے ہے جو دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کے لیے روا رکھتا ہے۔ ادبی اعتبار سے ان باتوں کی خاص اہمیت نہیں ہے اِس لیے اِس تلاش میں پڑنا لاحاصل ہے۔'' (91)

اگر یہ دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کا عمل ہے اور اس کی تلاش میں پڑنا بھی لاحاصل ہے تو پھر ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کا یہ عمل کہاں تک درست ہے کہ:

''راقم الحروف (حسنی صاحب) نے طفیل صاحب سے ان ''باقیات الصّالحات میں سے کچھ طلب کیا تھا۔'' (92)

یعنی محمد طفیل صاحب ٹونک سے جو خطوط لائے تھے، اُن میں سے کچھ طلب فرما رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد یونس حسنی صاحب نے اختر کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔

''پہلا دور سلمیٰ کے عشق سے پہلے کا زمانہ ہے، دوسرا دور سلمیٰ سے عشق کا زمانہ ہے۔ یہ دور مختصر لیکن حاصل زندگی ہے اور تیسرا دور سلمیٰ کے عشق میں ناکامی کے ردِّعمل کا نام ہے۔'' (93)

سوال یہ ہے کہ اختر شیرانی کے نزدیک عشق میں کامیابی یا ناکامی کا معیار کیا ہے؟ محبّت کو وہ ایک آسمانی نغمہ کہتے ہیں جو کبھی نفسانی اغراض کے پیکر میں نہیں سماتا۔ یعنی جسمانی قربت کو محبّت کی موت خیال کرتے

ہیں۔شادی کو محبّت اور حُسن کی غارت گری سمجھتے ہیں۔پھر معیار کیا ہے؟ سلمیٰ سمیت نہ جانے کتنی لڑکیاں اُن پر مرتی ہیں پھر اُن کا عشق ناکام کدھر سے ہے؟ عام تصوّر تو یہی ہے کہ عشق کی کامیابی شادی کی صورت ہی میں ظاہر ہوتی ہے جس کے وہ قائل نہیں اور پھر تو ناکامی ہی ناکامی ہے اور ناکامی کے بعد زندگی میں مرمر کے جینے کا ایک ڈھنگ ہے۔اِتنے عشق اور ہر ایک میں ناکامی، آہ! بے چارے اختر کی زندگی! اختر صاحب کے اِس المیے کو ڈاکٹر یونس حسنی صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک شاعرِ آشفتہ حال کو عشق ہوا۔یاروں کو سامانِ ارائش گفتار بہم پہنچا۔اختر کی اِن عشقیہ داستانوں نے اُن کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ہر شخص نے حسبِ توفیق اِن معاملات میں دلچسپی لی ہے اور ان کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔کسی نے اختر کی زندگی میں سرے سے کسی لڑکی کے وجود سے انکار کیا ہے، کسی نے ان سب امور کو افسانہ طرازی یا تقریبِ شعرگوئی قرار دیا ہے۔کوئی شہرت پسند اُٹھا ہے تو اُس نے بہ زعمِ دعویٰ محترمی داستان سرائی شروع کر دی ہے اور پھر زیبِ داستان کے لیے کچھ نہ کچھ بڑھا دینا ضروری سمجھا ہے۔چنانچہ ایک غلط مبحث سا پیدا ہو کر رہ گیا ہے۔'' (94)

یہاں تو ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے ایک بڑا اہم سوال بنتا ہے کہ اگر زیرِ تحقیق موضوع میں کچھ غلط مبحث پیدا ہو جائیں تو محقق کی ذمہ داری کیا ہے؟ اُسے غلط باتوں کو غلط ثابت کر کے، صحیح باتوں کو سامنے لا کر قارئین کی راہ نمائی فرمانی چاہیے کہ نہیں؟ یا صرف اِتنا لکھ کر ''غلط مبحث سا پیدا ہو کر رہ گیا ہے'' اُس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟ اور وہ بھی دوسروں کی طرح خاک اُڑا کر اور قارئین کو مزید اُلجھنوں میں ڈال کر اور یہ تلقین کر کے کہ دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانا بداخلاقی ہے اور خود ''ڈگری'' لے کر الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے؟ کیا تحقیق اِسی کو کہتے ہیں اور محقق کا یہی منصب ہے؟

اگر اختر شیرانی کے مزاج، خواتین کے حوالے سے اُن کے رویّے اور اُن کے فلسفۂ عشق کو مدِنظر رکھا جائے تو اختر شیرانی کی اس ساری حیاتِ معاشقہ کی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔نصر اللہ خاں نے چند جملوں ہی میں اُن کی یہ ساری داستان بیان کر دی ہے۔

مکمل اقتباس پہلے دِیا جا چکا ہے۔وہ دیکھ لیا جائے یا اُن کا لکھا ہوا خاکہ غور سے پڑھ لیا جائے تو ساری بات کُھل کر سامنے آجاتی ہے۔

یہاں صرف دو جملے ہی دوبارہ لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نصر اللہ خاں صاحب نے لکھا ہے:

''وہ (اختر شیرانی) عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے لیکن اُن میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یہ فُل ٹائم جاب ہے اور اختر کا مزاج سیمابی تھا۔ وہ بلا کے شرمیلے تھے۔'' (95)

حیرت ہے ایک انتہائی شرمیلے اور معصوم شخص کے بارے میں یار لوگوں نے کیا کیا افسانے تراش لیے ہیں، سلمیٰ کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا کہ ''آپ کی راز داں ہستیاں عنقریب کوئی فتنہ برپا کرنے والی ہیں'' اور یہ فتنہ برپا ہو کر رہا۔'' (96)

سلمیٰ کے بعد دوسرا اہم موضوع جس کا تقریباً تمام خاکہ نگاروں نے ذکر کیا ہے وہ اختر شیرانی کی شراب نوشی ہے۔ اختر شیرانی کو شراب کی عادت لاہور میں پڑی۔ اِس حوالے سے حکیم نیّر واسطی نے اختر کا اپنا بیان نقل کیا ہے۔ اختر کا کہنا ہے کہ:

''میں شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد ہوا اور شراب میں حضرتِ جگر کا۔'' (97)

ڈاکٹر یونس حسنی اِس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''شراب نوشی کی لت اُنھیں ''حلقۂ اربابِ علم و ادب'' سے وابستگی کے زمانے میں پڑی۔ اُردو کا یہ مرکز علامہ تاجور نجیب آبادی نے لاہور میں قائم کیا تھا۔ اُردو کے دوسرے مشاہیر کی طرح ''جگر'' بھی یہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ اختر اُس زمانے میں حلقے کے سیکرٹری تھے۔ جگر کی صحبت میں اختر شراب کی لذّت سے آشنا ہوئے اور پھر یہ آشنائی تاحیات قائم رہی۔'' (98)

اختر شراب پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ شورش کاشمیری نے اُن کی بلانوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شراب کے بغیر اُن کا کوئی تصوّر قائم نہیں ہوسکتا۔ وہ شراب پیتے نہیں تھے، بلکہ حلق کے نیچے غٹاغٹ اُتارتے تھے۔'' (99)

شوکت تھانوی نے تو اختر کی شراب نوشی پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس بات کی قسم کھائی جاسکتی ہے کہ عالمِ ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔'' (100)

حکیم نیّر واسطی لکھتے ہیں کہ:

'رفتہ رفتہ اختر شراب میں بہہ گئے تھے۔ جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی تھی۔ شراب کی بدولت گوشت ہڈیوں سے جدا ہوگیا تھا۔ جگر جل کر کباب ہوگیا۔ شراب نے اُن کی زندگی کے بخیے اُدھیڑ دیے۔ شراب

سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بے کار۔ اور شراب کے بارے وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے۔" (101)

عاشق بٹالوی صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ:

"وہ (اختر) ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے گھر تشریف لائے۔ بوتل اُن کی جیب میں تھی۔ کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ بدعت کب سے شروع کی؟" کہنے لگے "فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا اِس لیے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔"(102)

افیم ملا کر شراب پینے کا ذکر کسی اور مضمون یا خاکے میں نہیں ملتا۔ اس کا ذکر صرف عاشق حسین بٹالوی صاحب نے کیا ہے۔ اِسی طرح کی ایک انوکھی بات کا ذکر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اختر شیرانی کے دو ہی مشغلے تھے! شاعری اور شراب۔ کہتے ہیں کہ جب احباب کے ساتھ مل کر شراب کی محفل آراستہ کرتا تھا تو پہلے کمرے کے فرش اور دیواروں پر چھڑکاؤ کرتا تھا تا کہ ایک خاص فضا پیدا ہو جائے۔" (103)

ڈاکٹر صاحب جملے کا آغاز "کہتے ہیں" سے کرتے ہیں۔ اِس سے تو خبر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات کہیں سے سُن رکھی ہے۔ اُنھیں نہ تو اس کی مکمل خبر ہے اور نہ اِس پر مکمل یقین۔ چونکہ بات کہنے والے کو خود یقین نہیں اِس لیے یہ بات خود بخود مشکوک ہو جاتی ہے۔

محمد طفیل صاحب نے اختر شیرانی بارے ایک بڑا عمدہ جملہ لکھا ہے کہ:

"اُنھیں شرابی کی حیثیت سے سب جانتے ہیں، دوست کی حیثیت سے کم جانتے ہوں گے۔"(104)

خود محمد طفیل صاحب نے بھی اختر شیرانی کی دوست نوازی کا تو ایک آدھ واقعہ ہی تحریر کیا ہے اور زیادہ اُن کی شراب نوشی اور مدہوشی کے عالم میں غیر انسانی رویّے ہی کو بیان کیا ہے۔ محمد طفیل صاحب کو ٹونک میں چند دن اختر صاحب کے ہمراہ بسر کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن ایام کی رُوداد ہی خاکے میں لکھی ہے۔ ٹونک میں کلال کے ہاتھوں "گت" بننے، مہمانوں کے ساتھ ناروا سلوک، تُو تکار اور ہاتھا پائی کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہونے والے یومِ اقبال کے ایک جلسے کی کارروائی کا ذکر کیا ہے۔ اختر شیرانی کی شراب نوشی اور عالمِ مدہوشی کے سبب اس جلسے میں بدمزگی

پیدا ہوئی۔ اختر کے بارے عمومی رائے تو یہ ہے کہ وہ سرِ عام شراب نوشی سے پرہیز کرتے تھے اور شراب پینے کے بعد بہکتے تو تھے مگر بھٹکتے نہیں تھے۔ مگر اِس واقعہ میں وہ نہ صرف سرِ عام شراب پیتے اور سٹیج پر جا کر بار بار لڑکھڑاتے اور لُکنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا بولتے سُنائی دیتے ہیں۔ چونکہ منٹو اور قاسمی صاحب اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں اِس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اختر کی شراب نوشی پر اپنے دُکھ اور غم کا اظہار اِس طرح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میں نے جب بھی اختر کو نشے میں دیکھا، یہ سوچ کر اُداس ہو گیا کہ شراب نے ایک نہایت نیک طبع اور پاکیزہ فطرت شاعر کو کتنا بے بس کر ڈالا ہے۔''

مگر مدہوشی کے عالم میں اُن کے مزاج کی نیکی اور پاکیزگی قائم رہتی تھی۔'' (105)

پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اُن کی شراب نوشی پر اپنے تأسف کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

''شراب نوشی کے سبب عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں سے استمداد تک بھی نوبت پہنچی۔ وہ شخص جس کا احترام مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زعمائے قوم بھی ملحوظ رکھتے تھے، دُخترِ رز کے ہاتھوں اِن حالوں کو پہنچ گیا۔'' (106)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اِس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کی مے نوشی حافظ صاحب کے لیے تو سوہانِ روح تھی ہی، باقی خاندان کو بھی اِس کا بڑا قلق تھا۔ بعض بہی خواہ اس عادت سے نجات کے لیے نسخے اور ٹوٹکے بتاتے رہتے تھے۔ ماسٹر مٹھولال جی کی تجویز پر اختر صاحب کو شراب سے بچانے کے لیے بھنگ پر لانے کی کوشش کی گئی۔۔۔۔۔۔۔ مگر اختر صاحب نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر کسی بقراط کی رائے پر شیر کا جھوٹا گوشت بھون کر کھلایا گیا لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فش۔'' (107)

اور شراب چھوڑی تو کس وقت جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئے۔ بہ قول ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی:

''حالت سقیم ہوئی تو ڈاکٹروں نے صلاح کر کے کوشش کی اُنھیں دو ایک گھونٹ بطور دوا پلائے جائیں ممکن ہے اِس ترکیب سے ضعف میں کچھ افاقہ ہو! لیکن جب آبِ طرب ناک کا جام مُنہ کے نزدیک لے جایا گیا تو اُس کی بُو کو سونگھتے ہی ہونٹ بھینچ لیے اور مُنہ کی طرف اشارہ کر کے انگشتِ شہادت

آسمان کی طرف اُٹھا دی۔ مطلب یہ تھا کہ مے آلود دہن لے کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونا مناسب نہیں۔''(108)

یہ تو اختر صاحب کے اِس دُنیا سے کوچ کر جانے کے وقت کا قصّہ ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں مے آلود دہن لے کر حاضر ہونا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سے پہلے ٹونک میں ہونے والی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''ٹونک میں گھر سے باہر محفل جمتی تھی۔ اِس محفل میں کوئی شخص بھی پینے پلانے کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ اختر صاحب کلال کے ہاں سے پی آتے اور ایک اَدّھا شیروانی کی جیب میں چھپا لاتے۔ اسے ڈیوڑھی کے بھاری بھرکم دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں رکھ دیتے۔ وقفے وقفے سے اُٹھ کر دروازے کی اوٹ میں جاتے اور گھونٹ لے لیتے۔ اگر میں نظر پڑ گیا تو کسی بہانے مجھے گھر کے اندر بھیج دیتے۔ میں سمجھ جاتا اور وہاں سے کھسک لیتا۔ اُنھیں اِس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ میرے بچّوں کو کہیں مجھ سے نفرت نہ ہو جائے۔ اس محفل میں دُنیا بھر کے موضوعات پر بحث ہوتی اور اکثر قاری جمیل صاحب سے فرمائش کر کے سورۂ یٰسین کی تلاوت سُنتے۔ قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں اور اختر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔''(109)

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی صاحب نے بھی اختر کے حوالے سے کچھ ایسی ہی باتوں کی تفصیل لکھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

''اختر پی کر بہکتے ضرور تھے مگر بے قابو نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹوں کا خیال، بڑوں کا لحاظ، آدابِ محفل، کسی چیز میں فرق نہیں آتا تھا۔ نشے کی حالت میں بھی اُن کی زبان سے خدا، رسولؐ، مذہب، دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ جملہ سُننے میں نہیں آیا۔''(110)

حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اختر کی شراب نوشی کے حوالے سے دو واقعات بیان کیے ہیں۔ ایک تو مدرسے کے ایک طالب علم، مولوی صاحب کا قصّہ ہے، جو اُن کی شراب کی بوتل چُرا کر بھاگے اور سیدھے مسجد میں جا گُھسے۔ اختر صاحب اُن کے پیچھے گئے مگر مسجد کی پہلی سیڑھی سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بہ قول حکیم صاحب:

''اختر فوراً ہی مسجد کی پہلی سیڑھی سے نیچے اُتر آئے اور خاص تیور کے ساتھ کرارے لہجے میں کہا:

''مولوی صاحب نیچے آجاؤ شرم کرو شرم۔ اِس ناپاک بوتل کو لے کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مجھے دیکھو اللہ کے فضل سے ایک سیڑھی آگے نہیں بڑھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

اور پھر کہنے لگے'' مولوی صاحب بوتل نالی میں پھینک دو۔ اب یہ میرے کام کی نہیں رہی۔ میں گندہ آدمی ہوں، میرے مقدر میں گندگی لکھی ہے۔ یہ بوتل تمھارے طفیل مسجد میں ہو آئی ہے۔ اب میرے کام کی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور اُن کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری۔'' (111)

دوسرا واقعہ حکیم صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک بار اُن کی مشہور نعت جو آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ، بالخصوص ہر اتوار کی صبح نشر ہوتی تھی

؎ سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا

مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانامؐ آیا

اور یہ نعت چچا (حکیم ظہیر احمد برکاتی) کو بہت پسند تھی۔ ایک بار اُنھوں نے اختر سے یہ نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اختر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

''ظہیر میاں! آپ کہیں تو کوئی نظم سنا دوں، اِس وقت میں نعت نہیں سنا سکتا۔ میں پھر آؤں گا اور یہ نعت ضرور سناؤں گا، مگر اِس وقت نہیں۔''

یعنی نعت کے لیے جس قدر طہارتِ جسم و ذہن کی ضرورت اور حضورِ قلب کی جو کیفیت اس کے لیے ان کی نظر میں مطلوب تھی اُس وقت وہ اس سے محروم تھے۔'' (112)

حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ:

''اُن کا ایمان بڑا قوی تھا اور اُن کے دل میں شراب کی حرمت کا وہی عقیدہ اور مسجد کے تقدّس کا وہی جذبہ تھا جو ایک مسلمان کے جذبے میں ہوتا ہے۔'' (113)

اِن واقعات سے اختر کی شراب بارے ذاتی رائے اور دینی شعائر اور آپؐ سے عقیدت، محبّت اور احترام کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ ''اِس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اختر

صاحب عشقِ رسولِ اکرمؐ سے سرشار تھے اور دل کی گہرائیوں سے نعت کہتے تھے۔''

شورش کاشمیری مرحوم نے اختر کے عشقِ رسولؐ کا ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا ہے جو عرب ہوٹل میں پیش آیا اور جس میں اختر نے مدہوش ہونے کے باوجود ایک گستاخ نوجوان کی سرزنش کی اور:

''پھر بے اختیار رونے لگے۔ کہتے جاتے تھے، ہم عاصیوں کا تو ایک ہی ٹھکانہ ہے سرکارِ مدینہ، دربارِ مدینہ۔''(114)

ڈاکٹر صاحب نے اِس واقعہ کی زیادہ تفصیل نہیں لکھی۔ ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر مذہب کے بڑے پاس دار تھے۔ ٹونک کا ماحول اور اُن کا گھرانہ، کٹر مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اسی رنگ میں اختر کی شخصیت کا اِرتقا ہوا۔ یہی نظریات اُن کے خمیر میں داخل ہو گئے تھے۔ اُن کی شاعری کی ابتداء نعت سے ہوئی اور آخر میں بھی عمدہ نعتیں کہیں۔ عشقِ رسولؐ اُن کی زندگی کے آخری ایام میں اُن پر کافی حاوی رہا۔ اِس سلسلے میں ایک رِقّت آمیز واقعہ شورش صاحب نے بیان کیا ہے۔

''ایک بار چند کیمونسٹ نوجوانوں نے اُنھیں گھر رکھا تھا۔ مختلف ادیبوں اور شاعروں کے بارے اُن کی رائے طلب کر رہے تھے۔ جن کے بارے پوچھا جا رہا تھا وہ سب عموماً ترقی پسند حلقہ کے شاعر تھے۔ شراب کا دَور چل رہا تھا، اختر نشے سے سرشار تھے۔ یوں بھی وہ افادی شاعری کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سب ہی کی نفی کر گئے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ ترقی پسند تحریک ہی کے منکر ہیں تو افلاطون اور ارسطو پر سوال کر بیٹھے۔ اختر نے دونوں کو اپنے حلقۂ سخن میں زیرِ تربیت قرار دے دیا۔ شراب کی ترنگ میں جو تھے ایک جوشیلے قسم کے نوجوان نے تڑ سے سوال کیا'' آپ کا حضرت محمدؐ کے بارے کیا خیال ہے؟'' اختر ایک دم تڑپ اُٹھے اور بلور کا گلاس اُٹھا کر نوجوان کے سر پر دے مارا۔ ''بدبخت ایک عاصی سے سوال کرتا ہے۔ ایک سیاہ رُو سے پوچھتا ہے۔ ایک فاسق سے کیا کہلوانا چاہتا ہے؟'' تمام جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ روتے روتے گھگی بندھ گئی، کہنے لگے'' تم نے اِس حالت میں یہ نام کیوں لیا؟ تمھیں جرأت کیسے ہوئی؟ گستاخ، بے ادب''۔ اس لڑکے کو مجلس سے نکال دیا اور پھر خود بھی اُٹھ کر چلے گئے۔ اُس روز رات بھر روتے رہے۔ کہتے تھے'' یہ لوگ اِتنے نڈر ہو گئے ہیں کہ ہمارا آخری سرمایہ ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں گناہ گار ضرور ہوں لیکن یہ مجھے کافر بنانا چاہتے ہیں۔

اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ‘‘(115)

یہ واقعات اختر شیرانی کے عشقِ رسولؐ کی داستان سناتے ہیں ۔اختر شیرانی شراب پیتے تھے مگر اِس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔جو لوگ شراب نہیں پیتے تھے اختر اُن کو اِس خبیث شے سے بچنے اور دُور رہنے کی تلقین کرتے ۔ حزیں کاشمیری بیان کرتے ہیں کہ:

’’ایک ملاقات میں شراب کی بوتل کا ڈھکن اُن سے کھل نہیں رہا تھا تو ’’میں‘‘ نے اُن کے ہاتھ سے بوتل لے کر دانتوں میں ڈھکنا جکڑ کر آنِ واحد میں بوتل سے الگ کر دیا۔اب بوتل ہاتھ میں لے کر قہر آلود نظروں سے مجھے (حزیں کاشمیری کی طرف) دیکھ رہے ہیں، کہنے لگے:’’یہ تم نے کیا کیا؟ ایک بوتل میرے ہاتھ سے چھین لی پھر اسے دانتوں سے کھول دیا۔ اِس خبیث شے کو شرفاء ہاتھ تک نہیں لگاتے ۔مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسی بوتل کو چھوؤ گے بھی نہیں‘‘۔ مرحوم جس انداز میں تلقین کر رہے تھے اُس میں سچائی اور نیت کا خلوص شامل تھا۔‘‘ (116)

میرزا ادیب لکھتے ہیں:

’’گو وہ بلا نوش تھے مگر شاگردوں کے سامنے شراب کا ذکر تک نہیں کرتے تھے ۔ اِس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔‘‘(117)

حکیم نیّر واسطی کہتے ہیں:

’’شرم وحیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سِوا کسی کو آتا دیکھتے تو شراب کی بوتل اِدھر اُدھر چُھپانے کی کوشش کرتے۔‘‘(118)

ڈاکٹر یونس حسنی کا بیان ہے کہ:

’’مروّت اور پاس داری کا یہ عالم تھا کہ شغل مے کے وقت ہر اُس شخص سے دُور رہتے جس کے متعلق اُنھیں خیال ہوتا کہ اس پر اُن کا یہ شغل گراں گزرے گا۔اگر سرِ راہ مڈ بھیڑ ہو جاتی اور شراب کے نشے میں ہوں تو کترا کے نکل جاتے۔‘‘ (119)

نصر اللہ خاں اپنے خاکے ’’اختر شیرانی‘‘ میں اُن کی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’شراب نہیں پیتے تھے تو بجھے بجھے سے رہتے، جیسے کوئی پھول کُھلا گیا ہو۔ایسی حالت میں ان سے مل کر ہول آتا۔ وہ کُھل کر بات نہ کر پاتے اور نہ ہی اُن کی بات کا مزا آتا اور جب شراب پیتے اور سرور گھٹتا تو اپنے خول سے نکل آتے اور یہ دوسرے ہی اختر ہوتے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے دوست سے اختر کا تعارف کروایا۔ اختر خوب پیئے ہوئے تھے۔ اُن کی بھولی بھالی باتیں سن کر اور اُن کی بچّوں جیسی شرارتیں دیکھ کر میرے دوست نے کہا:

''یارا اگر شراب پی کر انسان ایسا ہی معصوم ہو جاتا ہے تو شراب ضرور پینی چاہیے۔'' (120)

ایک رِندِ لا اُبالی ہوتے ہوئے بھی اختر اخلاقی، دینی اور سماجی اقدار کے پابند دِکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے ہر عمل میں اسلامی شعائر اور مشرقی روایات کے احترام کی جھلک نظر آتی ہے اور بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

''اختر رومان پسند آدمی تھے۔ لا اُبالی، لاپرواہ اور بے نیاز۔ ایسے لوگ عموماً کسی اخلاقی پابندی یا سماجی رسم و رواج کے کسی بندھن کو برداشت نہیں کرتے لیکن اختر کی زندگی اِس رُجحان کی نفی کرتی ہے۔'' (121)

اختر شیرانی لا اُبالی ہونے کے باوجود ایک معصوم انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے اختر شیرانی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے حوالے سے ایک بڑی بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بچپن میں وہ چھ سات برس کا عرصہ جو حافظ صاحب اپنے بیٹے اختر سے دُور رہے (1906ء-1913ء)، اختر کی سیرت کی تشکیل میں فیصلہ کُن کردار کا حامل تھا۔ اِس اہم ترین مرحلے میں اختر کا باپ کی محبّت سے محروم رہنا اُن کے مزاج کے اکثر نمایاں مظاہر کا ذمہ دار ہے۔ بچپن کا وہ احساسِ محرومی تاحیات اختر کی شخصیت پر سایہ فگن رہا۔ اِس وجہ سے اُن میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی اور قوتِ ارادی کمزور رہ گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے والد کے حسبِ منشا رسمی تعلیمی مدارج طے نہ کر سکے۔ اُن کی مے نوشی کی عادت کو بھی اِسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور والد کے عتاب کے باوجود اُن کی پرستش کی حد تک احترام کو بھی۔'' (122)

اختر صاحب اپنے والد کی ناراضی کے باوجود اُن کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اُنھیں اِس بات کا اعتراف تھا کہ ''بابا'' کی برہمی بلاوجہ نہیں اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بنانا چاہتے تھے وہ اختر نہ بن سکے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے بہ قول:

''حافظ صاحب کو بیٹے کے تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔ اِس تکدّر کا اِظہار اُس وقت ہوا جب اختر کی پہلی قابلِ ذکر نظم ''جوگن'' انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی مجلّے ''اُردو'' (اورنگ آباد) میں شائع ہوئی

(شمارہ جنوری،1925ء)اور مولوی عبدالحق مرحوم نے حافظ صاحب کو مبارک باد کا خط لکھا۔خط پڑھ کر بڑے جھلّائے اور بظاہر اپنی اہلیہ مگر درحقیقت اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا ''ہونہہ''!۔۔۔سسرا شاعری کرنے چلا ہے۔''(123)

اپنی تمام بے راہ رویوں اور حافظ صاحب کے سخت گیر رویّے کے باوجود، اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

''والد کا بے حد احترام کرتے تھے۔وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔اپنے والد کا نام بڑے احترام سے لیتے اور اکثر اُن کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔''(124)

میرزا ادیب نے بھی اِسی قسم کی رائے کا اِظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اختر اپنے والد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔والد کے ناروا سلوک کے حوالے سے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے بلکہ خود کو قصوروار سمجھتے تھے کہ اُن کی اُمیدوں پر پورا نہ اُتر سکے۔کہا کرتے تھے:

''قصور میرا ہے،اُن کی کوئی غلطی نہیں۔وہ جو کچھ بنانا چاہتے تھے،میں بن نہ سکا۔''(125)

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

''حافظ صاحب اُن سے خفا تھے مگر اختر نے ہمیشہ اُن کا ذکر احترام سے کیا۔اختر صاحب اس واقعہ کا ذکر بطورِ خاص کرتے''زندگی میں صرف ایک بار باوا نے ہمیں مُنہ لگایا تھا اور ''تنقیدِ شعر العجم'' کا مسوّدہ دے کر فرمایا:''اِس پر ایک نظر ڈال لو۔میں نے دیکھا تو جہاں جہاں لہجہ سخت ہو گیا،پینسل سے وہاں نرم کر دیا۔''(126)

یہ اختر کا علمی مقام و مرتبہ تھا کہ حافظ صاحب بھی اپنے مسوّدے پر اُن کی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''شیرانی خاندان میں اخلاقی پابندیاں پہاڑوں کی چٹانوں سے زیادہ سنگین تھیں اور اختر اس خاندان کا باغی بچّہ تھا اور اس بغاوت کی سزا وہ اپنے سخت گیر باپ سے عمر بھر پاتا رہا۔حافظ صاحب ثقہ بزرگ تھے اور صاحبزادے رِند۔لہٰذا دونوں باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی لیکن اِس کے باوجود،میں نے اختر کو مولانا کا جتنا ادب کرتے دیکھا ہے شاید ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کا اِتنا ادب کرتا ہو۔مولانا اختر کی شراب نوشی اور

اُس کی محبّت اور بے باک شاعری کی وجہ سے اُس سے خفا رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اختر کو علیحدہ کر دیا تھا۔'' (127)

اور اختر جو اپنے باپ سے صحیح معنوں میں پیار حاصل نہ کر سکا، ساری عمر اُس پیار کے لیے ترستا رہا۔ گھر سے بے دخلی کی تصویر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے یوں بیان کی ہے:

''حافظ صاحب کو جب اُن کی مے نوشی کی خبر ہوئی تو گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ سزا کے طور پر اختر صاحب کا گھر میں داخلہ ممنوع فرمایا۔ اختر صاحب کو اِس تازہ صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ وہ حسبِ معمول آدھی رات کو گھر پہنچے۔ دستک کی آواز سن کر والدہ نے دروازہ کھولے بغیر، بیٹے کو باپ کا حکم پہنچایا۔ یہ سن کر اختر دروازے کے آگے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے اور ماں اپنی اکلوتی اولاد کی محبت کے باعث بند دروازے کے اندر کی طرف بیٹھ کر اُنھیں مَے خواری سے اِجتناب کی تلقین کرتی رہیں۔ والدہ کی نصیحتوں کا یہ سلسلہ اذانِ فجر کے قریب، حافظ صاحب کی بیداری سے پہلے ختم ہوا۔ اختر صاحب کو والد کی سخت گیری کا اندازہ تھا، اِس لیے اُسی دن اپنے رہنے کا کسی اور جگہ انتظام کر لیا۔'' (128)

اِس واقعہ کو ڈاکٹر یونس حسنی نے یوں بیان کیا ہے:

''شراب چُھپنے والی تو تھی نہیں۔ حافظ محمود شیرانی کو بھی بالآخر ایک دن اس کا علم ہو گیا۔ وہ اُن کی عاشق مزاجی، لاپرواہی اور گھریلو ذمہ داریوں کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب تو گویا اُنھیں اختر سے نفرت سی ہو گئی! یہ شراب کے نشے میں عموماً رات گئے گھر پہنچتے اور وہاں محمود صاحب کے حکم سے پہلے ہی دروازہ بند کر دیا جاتا۔ یہ جاتے اور بند دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتے۔

ماں قدموں کی آواز سُن کر دروازے کی دوسری جانب آ کر بیٹھ جاتیں، سمجھاتیں، نصیحتیں کرتیں اور دونوں ماں بیٹے باتوں میں رات کاٹ دیتے۔'' (129)

حکیم نیّر واسطی بیان کرتے ہیں:

''اختر کا معمول یہ تھا کہ وہ اکثر رات گئے گھر لوٹتے تھے، اور اسی اثناء میں بارہا ایسا ہوا کہ اُن کے والدِ محترم نے غصّہ میں آ کر مکان کے اندر سے زینے کو قفل لگا دیا۔ اختر آتے اور اس دروازہ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیرِ اثر اُن کی والدہ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر باتیں کرتے رہتے

اور اِس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزرجاتی تھی، تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کُھلتا۔'' (130)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اِس واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ واقعہ محترم پروفیسر سیّد محمد یونس حسنی صاحب نے اختر پر اپنے مقالے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے حوالے سے درج کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب جو صرف اختر سے اپنی محبت نیز اپنے شاعرانہ مزاج کے باعث اِس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے ضروری احتیاط ملحوظ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس یک شبی واقعہ کو فعل ماضی مطلق کی بجائے ماضی استمراری میں بیان کیا، نیز لفظ ''عمومًا'' کے اضافے سے اسے دوام عطا کر دیا۔ پھر آگے چل کر۔۔۔۔۔۔۔۔

خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

کے مصداق بعض خلاصہ نویسوں نے اس واقعہ میں شوہر کی اطاعت اور بیٹے کی محبّت کے مثالی پہلو نظر انداز کر کے اس میں پائی جانے والی ڈرامائی کیفیت کو اپنے مضمون چمکانے کے لیے استعمال کیا۔ اِسی طرح اختر کے سلسلے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے بعض اور بیانات بھی ناقدروں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے۔'' (131)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے بڑے دبے لفظوں اور احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے حکیم نیّر واسطی صاحب کے بیانات کی تردید کرتے ہوئے صرف یہ لکھا ہے کہ اُنھوں نے ''ضروری احتیاط نہیں کی''۔ حقیقت یہی ہے کہ حکیم صاحب نے بہت سے واقعات اس ضروری احتیاط کے بغیر لکھے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش بہر صورت موجود ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا واقعہ کے علاوہ، سلمیٰ کا پہلا گمنام خط ملنے کے بعد اختر کی حالتِ زار، سلمیٰ کی شادی کی رات اختر کی کیفیت اور پھر اختر کے جنازے کو روک کر برقعہ پوش خاتون کا، اختر کا آخری دیدار وغیرہ۔ محققین کو حکیم صاحب کے بیان کردہ واقعات سے اختلاف ہے۔

گھر سے بے دخلی کے بعد کے واقعات کا بھی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر ٹوہ لگائے رکھتے کہ بابا کب لاہور سے باہر جاتے ہیں، بس وہ لاہور سے نکلے اور انھیں گھر آنے کی چھٹی ملی۔ ہم بہن بھائیوں کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ اور ''بابا'' واپس آتے تو ہم کھلونے چھپا دیتے اور اُن کے کالج جانے پر ہی نکالتے۔ ہمیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر ''بابا'' ان کے بارے میں پوچھیں تو بھاء جی (اختر صاحب) کا نام نہ لینا۔'' (132)

حافظ صاحب کی سخت گیری اور اختر صاحب کا احترام اور اُن سے عقیدت و محبّت کا قصّہ یہیں ختم

نہیں ہوتا۔ 1940ء میں جب حافظ صاحب ملازمت سے سبک دوش ہو کر ٹونک جانے لگے تو اختر صاحب بہت گھبرائے۔ حافظ صاحب اُنھیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے اور اختر صاحب اُن کے بغیر لاہور میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ حالانکہ لاہور سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔ لاہور نے اُنھیں شہرتِ دوام بخشی تھی۔ اُن کا حلقۂ یاراں یہاں تھا۔ لاہور اُن کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا اور پھر یہاں سلمیٰ بھی رہتی تھی مگر اختر صاحب اِن تمام چیزوں کو چھوڑ کر ''بابا'' کے ہمراہ جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے بہ قول:

''''بابا'' کے قریبی دوستوں سے سفارش کروائی، بابا بہ مشکل اِس پر آمادہ ہوئے کہ ''وہ'' (اختر) چلا چلے لیکن میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔''

باپ بیٹے نے یہ معاہدہ مرتے دم تک نبھایا۔ نہ باپ نے کبھی طلب کیا اور نہ بیٹے نے جرأت کی۔ ہاں بعض اوقات حافظ صاحب کوئی علمی مسئلہ چھان بین کے لیے کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر نیچے بھجوا دیتے تو اختر صاحب اپنا سب کام چھوڑ کر اُس پر توجّہ دیتے اور مطلوبہ معلومات مہیّا کر کے اوپر بھجواتے۔'' (133)

اختر صاحب تمام تعزیرات سہتے رہے مگر نہ تو احترام میں کمی آنے دی اور نہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ ایک چپ چاپ اور خاموش محبّت اور عقیدت کا رشتہ قائم رہا اور اسے زندگی بھر نبھاتے رہے۔ اِس سلسلے میں اختر کی محبّت کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب:

''ٹونک میں حافظ صاحب کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رِندِ خرابات نے جنازہ روک کر، پٹی پکڑ کر کچھ اِس انداز میں صدائے نالہ وشیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اِس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔'' (134)

نصر اللہ خاں کا بیان ہے کہ:

''میں اجمیر پہنچا اور اختر سے ملا تو وہ مجھے گلے لگا کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا اور کہنے لگا'' نصر اللہ! میرے ابّا مر گئے۔'' حالانکہ اختر کے ابّا کو مرے یہ دوسرا سال تھا۔'' (135)

والد کے احترام، عقیدت اور محبّت کے ساتھ ساتھ والدہ کا احترام بھی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہوش وحواس سے عاری ہونے کی حالت میں بھی اُنھوں نے والدہ کے احترام کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ یہی رویّہ اُن کا اپنی دوسری والدہ کے ساتھ تھا۔ ان دونوں کے آگے

تو بالکل بچّہ بن جاتے تھے۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد عدّت پوری ہونے پر ہماری دوسری دادی امّاں عزیزوں سے ملنے، ہمارے آبائی گاؤں شیرانی آباد گئیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ماہ رہنے کا خیال تھا۔ جاتے ہوئے ان سے (اختر) سے کہہ بیٹھیں ''میں تمھاری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ناراض ہو کر جا رہی ہوں، اب واپس نہیں آؤں گی۔'' اُس وقت تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن ابھی اُن کو گئے دو ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ بے قرار ہو گئے۔ مجھے (ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی) ایک عزیز کے ہمراہ اُن کو لینے بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تب اُنھیں چین آیا۔'' (136)

اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ اختر اپنی حقیقی اور سوتیلی والدہ کا احترام کرتے تھے تو اختر کی سوتیلی ماں بھی اُن سے بے پناہ محبّت کرتی تھیں۔ نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''مولانا محمود شیرانی کی دوسری بیوی بھی اختر کو اپنی بھرپور محبّت دینا چاہتی تھیں لیکن مولانا پرانے ڈھنگ کے آدمی تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ اس پیار سے کہیں وہ اور نہ بگڑ جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قابل آدمی اور اچھا آدمی اچھا باپ بھی ہو۔''(137)

اختر صاحب کو اپنی اولاد سے بھی بے پناہ محبّت تھی، گھر میں بچّوں سے ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ اُن کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ مظہر محمود کو اُن کے شوق کے پیشِ نظر ہوائی بندوق خرید کر دی۔ بیٹی نسرین اختر کے شوہر نظر الدین خاں شیرانی دریائے بناس میں ڈوب کر وفات پا گئے جبکہ شادی کو ابھی چالیس روز ہی ہوئے تھے، بہت غمگین ہوئے۔ اس سانحہ پر قطعۂ تاریخ کہا:

ے ''ہے غرقِ ظلمت و یاس آسماں آج
مہِ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
اجل ڈوبا نظرالدیں جواں آج

1366 ہجری''

(138)

پہلا بیٹا جاوید محمود زبور اختر جسے وہ بے حد عزیز رکھتے تھے مر گیا اور اُس سے کچھ مُدّت بعد عزیز ترین دوست ''شیون'' مرحوم کی خودکشی کا حادثہ پیش آیا جو اُن کے لیے سوہانِ روح تھا۔ ان حادثات کا ذکر اُنھوں نے

یوں کیا ہے:

بعد از غمِ جدائی عذرا مرے لیے
یادِ زبور و ماتمِ ''شیون'' ہے آج

یہ بات بھی درست ہے کہ وہ میدانِ عمل کے آدمی نہ تھے۔ اپنی لا اُبالی طبیعت کے سبب گھریلو ذمہ داریوں کی جانب توجہ نہیں کرتے تھے۔ گو حافظ صاحب اور اُن کی والدہ یہ ذمہ داری احسن انداز سے نبھا رہے تھے مگر اختر کو اِس بات کا احساس ضرور تھا کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہیں۔ حافظ صاحب کی رحلت کے بعد اختر صاحب نے اپنی قوتِ اِرادی کو مجتمع کیا اور پروگرام بنایا کہ وہ ٹونک سے لاہور جائیں گے اور مکان کا بندوبست کر کے اہلِ خانہ کو وہاں بلوا لیں گے۔ فسادات کے دِنوں میں 1948ء کے آغاز میں جوں توں کر کے لاہور پہنچے اور حکیم نیّر واسطی صاحب کے ہاں قیام کیا۔ اُن دِنوں کا حال حکیم نیّر واسطی صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

'آپ اپنے اہل و عیال کو بہت زیادہ یاد کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ ''حکیم صاحب! میں نے اپنی بیوی کا کوئی حق ادا نہیں کیا اور پھر اِس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ اور ایک دن آپ نے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے وقت اپنے صاحب زادے خوشنود (مظہر محمود) کی نقلیں 'اُتارنے لگے اور پھر فرمانے لگے ''ہائے میں نے بچوں کے لیے بھی کچھ نہیں کیا اور اس کے بعد اس قدر روئے کہ دیر تک روتے چلے گئے۔ اُسی زمانے میں اُن کی ایک صاحبزادی کا خط آیا جس میں اُنھوں نے لکھا کہ ''والدہ کہتی ہیں، تم تو پردیس میں جا کر آرام سے بیٹھے ہو اور ہم یہاں تکلیف میں پڑے ہوئے ہیں'' تو اس پر آپ نے ایک سانیٹ لکھا جس میں آپ نے اپنی رفیقۂ حیات سے یوں خطاب کیا:

ے تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ ملال آتا ہے
آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے

اور پھر ایک مرتبہ آپ کی رفیقۂ حیات نے لکھا کہ تم ہمیں لاہور جا کر بھول گئے تو اس پر آپ نے ''پیمانِ وفا'' کے عنوان سے ایک سانیٹ لکھا:

ے بربِّ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تم کو
ہر ایک ذرّہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تم کو '' (139)

اختر صاحب نے بیوی بچّوں کے لیے کچھ کیا یا نہیں مگر اُن کے دل میں اُن کے لیے جو محبّت اور احساس ہے اس کی خبر ضرور ہوتی ہے۔اور سیّد منظور الحسن برکاتی صاحب کا اختر کی شخصیت کے بارے یہ تبصرہ بالکل درست ہے کہ:

''وہ ایک ایسا شخص تھا جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔'' (140)

دردمندی، وسیع القلبی اور کشادہ دستی اختر صاحب کی فطرت کا حصّہ تھی۔نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''اختر سر تا پا پیار تھے، خلوص تھے، اُن کا بچپن، اُن کی جوانی پر بھی مسلّط رہا۔وہی بھول پن، وہی بچّوں ایسی معصوم معصوم شوخیاں، وہی ضد۔'' (141)

سعادت حسن منٹو کی رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے۔وہ کہتے ہیں:

''بعض اوقات اختر بالکل بچے بن جاتے تھے۔اُن کی گفتگو اور حرکات بالکل بچّوں کی سی ہوتیں۔بچّہ بن کر وہ بچگانہ قسم ہی مسرّت محسوس کرتے تھے۔''

منٹو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اختر کے پاس دولت نہیں۔قلاّش تھے مگر بڑے رحم دل اور انسانیت دوست تھے۔''(142)

اختر سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد احمد ندیم قاسمی اپنے تأثر کا اِظہار اِس طرح کرتے ہیں:

''اُن کی شخصیت بھی سیدھی سادھی تھی، اُن کی گفتگو میں بھی محبّت کی چاشنی تھی۔مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اِتنا مقبول شاعر، اِتنا نرم گفتار بھی ہوسکتا ہے۔''(143)

احمد ندیم قاسمی نے اپنی بے روزگاری کے دِنوں کا ذکر کرتے ہوئے، اختر کے احساس اور بڑے پن کا بھی اعتراف کیا ہے۔اُن دِنوں احمد ندیم قاسمی اپنے بھائی کے ساتھ لاہور میں ایک کرائے کے مکان میں مقیم تھے۔ایک دن اُن کی غیر موجودگی میں اختر اُن کے کمرے کے تالے میں وہ کاغذ ٹکا آئے جس میں لکھا تھا:

''میں نے سنا ہے تم بے کار ہو اور تمھیں کوئی ذریعۂ معاش نہیں مل سکا۔میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔اِس لیے تمھیں ''حکم'' دیتا ہوں کہ جب تک تمھارے روزگار کا کوئی بندوبست نہیں ہوجاتا، تم میرے خرچ پر صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، بعد دوپہر کی چائے اور رات کا کھانا، عرب ہوٹل میں کھاؤ گے۔''(144)

اور احمد ندیم قاسمی، مسلسل تین ماہ اُن کے حکم کی تعمیل میں عرب ہوٹل سے کھانا کھاتے رہے۔اِسی احساس،

انسان دوستی، ہمدردی، سیر چشمی اور دوسروں کے کام آنے کے جذبے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اُنھیں ''فرشتہ سیرت انسان'' کہتے ہیں۔

میرزا ادیب، اختر شیرانی کے بارے لکھتے ہیں:

''زندگی کی اعلیٰ قدروں سے وابستگی ناقابل شکست تھی۔ بڑے شاعر ہی نہیں، بڑے انسان بھی تھے۔'' (145)

اِس بڑے انسان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے اُن کی شخصیت کے پرت کھولے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اُن کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی اور یہ کشش عبارت تھی، علم و فن، آداب و اخلاق، شرم و حیا، خلوص و وفا، مودّت اور سب سے بڑھ کر دوسروں سے ہمدردی کرنے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے غم بانٹ لینے سے۔'' (146)

اختر صاحب کسی کو دُکھ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ کسی سائل کا سوال ردّ نہیں کر سکتے تھے بلکہ از خود بھی ضرورت مندوں کی امداد پر آمادہ رہتے تھے۔ کسی رسالے یا ریڈیو اسٹیشن سے روپیہ آتا تو گھر تک آتے آتے راستے ہی میں پیسے ختم ہو جاتے۔ سب کے سب مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ پہنی ہوئی قمیض اور پاؤں کے سلیپر تک ضرورت مندوں کو دے دیتے۔ اِن باتوں کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اختر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اختر صاحب ریڈیو اسٹیشن سے تانگے میں بیٹھ کر موہنی روڈ اپنے کسی دوست کے پاس جا رہے تھے۔ راستے میں کسی وجہ سے تانگے والے کا چالان ہو گیا۔

موہنی روڈ پہنچ کر دروازے پر دستک دے کر اختر صاحب نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور تانگے والے کی طرف بڑھایا اور بولے ''تانگے والے! مجھے افسوس ہے کہ تمھارا چالان ہو گیا۔ یہ پیسے تم رکھ لو۔'' اُن دِنوں سو روپیہ بڑی رقم تھی، اور تانگے کا کرایہ صرف چار آنے۔ لہٰذا تانگے والا گھبرا گیا۔ اِس اثنا میں وہ دوست گھر سے نکلا۔ اُس نے یہ صورت دیکھی تو جیب سے دس روپے نکال کر تانگے والے کو دینا چاہے، لیکن اختر صاحب نہ مانے اور تانگے والے کو اُن سے سو روپے لیتے ہی بنی۔'' (147)

مال و منالِ دُنیا سے اِس بے نیازی کو حکیم نیّر واسطی بھی بیان کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک اُن کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب ڈاک خانے سے پیسے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں کو بانٹتے آئے اور جب وہ گھر پہنچے تو صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں تھا۔''(148)

گو اُنھیں خود تو روپے پیسے سے کبھی رغبت نہ رہی مگر دوسروں کی ضرورتوں کو ہمیشہ مدِنظر رکھا۔ محمد طفیل، اُن کی انسان دوستی کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''نازش صاحب کہتے ہیں کہ ایک دن اختر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے فلاں دوست کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ دو تین ماہ سے بے کار ہے۔ نوبت فاقوں تک آن پہنچی ہے تو یہ بڑے پریشان ہوئے۔ دو تین دن تک دوڑتے بھاگتے رہے۔ کہیں سے تین سو روپوں کا انتظام کیا۔ مجھے ڈھونڈا، ساتھ لے کر دوست کے مکان کی طرف چلے۔ مکان آیا تو خود نیچے ٹھہر گئے۔ مجھے کہا ''اوپر جا کر روپے دے آؤ۔'' میں نے کہا ''اختر صاحب! اپنے ہاتھ سے دیجیے۔'' کہنے لگے ''خود روپے دیتے ہوئے شرم آئے گی۔''

ایسے ہی اوصاف اور کردار کے پیشِ نظر محمد طفیل کہتے ہیں:

''سوائے شراب کی علّت کے میں نے اختر صاحب میں کوئی خرابی نہ دیکھی۔ وہ اپنے ملنے والوں کی عزت کرتے تھے۔ اُن کی مدد کرتے تھے، اُن سے پیار کرتے تھے۔ غرض معصوم سے انسان تھے جو اختر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔''(149)

شراب نوشی اور احباب نوازی کے سلسلہ میں اُنھیں جن مالی پریشانیوں کا سامنا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ وہ ہر طریقے سے روپیہ کمانے یا حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے، لیکن اس کے برخلاف ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کے بقول:

''اختر کے کردار میں استغناء، ایمان داری اور حلال وحرام کے پختہ شعور کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے روپیہ حاصل کرنے کے لیے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ضمیر کے خلاف ہوتا۔''(150)

اختر صاحب صرف شعر ونغمہ کی صدا تھے۔ روپیہ پیسہ اُن کی ترجیح میں شامل ہی نہیں تھا۔ حکیم نیّر واسطی کہتے ہیں:

''اُنھوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا، کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ اُنھوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کیے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے کیوں کہ آمد وخرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔'' (151)

روپے کا حساب کتاب رکھنا اُن کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ تو صرف خرچ کرنا جانتے تھے۔ ڈاکٹر

مظہر محمود شیرانی صاحب کو اکثر یہ خیال آتا ہے کہ:

''اختر صاحب اپنی محدود اور بے قاعدہ آمدنی کے باوجود ایسی کشادہ دلی، فراخ دستی کا مظاہرہ کیسے کر لیتے تھے؟ اُن کی زندگی کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ بیش و کم کا نہیں بلکہ اندازِ چشمِ کرم کا تھا۔''(152)

یہ چشمِ کرم ہی کا فیض تھا کہ ہاتھ کھلا اور دل محبّت سے لبریز تھا۔ رقیق القلب اِس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر مُرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں، وہیں بیٹھ کر دیر تک اُنھیں دیکھتے اور روتے رہے اور کہتے رہے

؎ مجھے تو کچھ اِنھی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

اختر رقیق القلب انسان تھے اور عمر کے آخری حصّے میں تو رِقّتِ قلب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بقول حکیم نیّر واسطی:

''جب وہ سیر کرتے کبھی کبھی راوی روڈ کی طرف نکل جاتے اور وہاں ایک کیمپ میں مہاجرات کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھتے تو کھڑے کھڑے رونے لگتے۔''(153)

اُس زمانے میں بڑے افسردہ رہتے تھے۔ اُن کی سانیٹ ''مہاجرہ'' اُنھی دِنوں کی یادگار ہے۔ ایک دن شورش کاشمیری سے کہنے لگے:

''شورش! انسان پاگل ہو گیا ہے۔ جمنا میں صدیوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ اب کے دیکھا اور محسوس کیا جیسے اس کی آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے۔ ستلج پر نظر ڈالی، بیوہ کے سہاگ کی طرح ویران تھا۔ بیاس دیکھا، دونوں کناروں پر بے آس لوگوں کے ڈیرے اُداس پڑے ہیں۔ پانچ دریاؤں کا پانی خون ہو گیا ہے شورش!''(154)

اُس عہد میں بات بات پر روتے تھے، آنسو بے اختیار آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ اپنی اس حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

؎ روتا ہے بات بات پہ یوں بار بار کیوں
اختر خبر نہیں، دلِ ویراں کو کیا ہوا

یہ ویرانی تو ہر حسّاس دل کا مقدّر ہے اور اختر شیرانی تو کچھ زیادہ ہی حسّاس تھے۔

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی صاحب نے چند سطور میں اختر شیرانی کی مکمل شخصیت کو بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اُن کا دامن شراب نوشی کے سوا، ہر نوع کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ اخلاق و سیرت کے محاسن کے حامل تھے۔ مشرقیت اور قدامت اُن کی ادا ادا سے جھلکتی تھی۔''(155)

اور بقول حکیم نیّر واسطی:

''وہ اِتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں اُن میں جمع ہوگئی تھیں۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق اور دوست نواز تھے۔ عطا پاش اور خطا پوش، وہ ایک مردِ قلندر اور فقیرِ خاک نشیں تھے۔ اور اُن کے دل میں مہر و یاری کے سوا کسی کے لیے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہیں تھی۔ سیر چشمی اور مال و منالِ دُنیا سے بے نیازی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اختر بے حد ہمدردِ بنی نوعِ انسان تھے۔ جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا، تلملا اُٹھے اور اکثر رو پڑتے اور عورت ذات کی مصیبت تو کبھی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اخلاق، انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بہت بڑے انسان تھے۔ دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض، سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے۔''(156)

اِس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھا اور دیکھا جائے تو وہ کون سی انسانی خوبی ہے جو اختر میں نہیں۔ اختر شیرانی کی شخصیت کا مکمل عکس، سیّد منظور الحسن برکاتی کے اِس بلیغ تبصرے میں موجود ہے:

''وہ ایسا شخص تھا جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔''(157)

گو کچھ لوگوں نے اُن کی شراب نوشی اور عشق کے شعروں کو ضرورت سے زیادہ ہوا دے دی ہے وگرنہ اختر شیرانی کی زندگی، کلیوں اور پھولوں کی کہانی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

حواشی

1 اختر شیرانی نقوش،لاہور(آپ بیتی نمبر،جون 1964ء۔ص۔1428

2 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،کہاں سے لاؤں اُنھیں،لاہور،القا پبلی کیشنز،2011ء۔ص۔1

اختر شیرانی 4 مئی، 1905ء کو محلہ مہندی باغ (ٹونک میں پیدا ہوئے۔ دادا نے اپنے ایک متوفی بیٹے (محمد داؤد خاں، 18۔جولائی،1895ء،یکم اکتوبر،1900ء،ٹونک) کے نام پر محمد داؤد خاں نام رکھا۔علاوہ ازیں نو مختلف تاریخی نام نکالے گئے جن سے ظاہری و معنوی اعتبار سے سنہ 1323 ہجری برآمد ہوتا ہے۔ان میں سے صرف ایک نام مسعود خسرو ایسا ہے جو آگے چل کر اختر نے اپنے بعض مضامین میں استعمال کیا۔(ص۔1)

3 اختر شیرانی پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔سرحدی پٹھانوں کا یہ قبیلہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد ہے اور اپنے جدِ اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے پڑ پوتے ''شیرانی'' کے نام سے منسوب ہے۔اِس قبیلے کے بعض خاندان راجپوتانے میں آباد ہو گئے تھے۔اختر کے اسلاف ریاست جودھ پور ماروا ڑ میں آباد ہوئے تھے۔جہاں ''شیرانیوں کی ڈھانی'' کے نام سے شیرانی پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے۔اختر کے بزرگوں کو سیّد احمد شہیدؒ سے ارادت تھی اور وہ اُن کے مرید تھے۔چنانچہ سیّد صاحبؒ کے دوسرے رفقاء کی طرح انھیں بھی جاگیر عطا ہوئی تھی۔اختر کے پردادا حاجی چاند خاں وزیر الدولہ کے عہد (1834۔1865ء) میں جودھ پور سے ٹونک آئے اور ''قافلے'' میں قیام کیا۔

مظہر محمود شیرانی مرتّب ''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی'' جلد اوّل،لاہور،مجلسِ اُردو ادب،1966ء

سیّد صاحبؒ کے قافلے کے مجاہدین ٹونک کے جس محلّے میں اقامت گزین ہوئے وہ ''قافلہ'' کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''،جلد اوّل،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،1993ء،ص۔28

4 چاند خاں کے لڑکوں میں سب سے بڑے اسماعیل خاں اُس دَور کی مروّجہ تعلیم (جس میں بنیادی حیثیت فارسی زبان کو حاصل تھی) پا کر سرکارِ ٹونک میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے خوب معزز ہو گئے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''،جلد اوّل،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،1993ء،ص۔28

جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

''محمد اسماعیل خاں ٹونک کے منشی خانے میں نائب میر مُنشی مقرر ہوئے۔نواب محمد علی خاں نے اُنھیں اپنی بیگم (مشرف بیگم) کا کامدار مقرر کر دیا۔اس طرح محمد اسماعیل خاں کا خاندان ٹونک کا معزز خاندان شمار کیا جاتا تھا۔

جاوید اختر بھٹی،''20 معروف ادبی شخصیات''لاہور،برائٹ بکس،2006ء،ص۔316

5 حافظ محمود شیرانی کا پہلا نام محمد میکائیل تھا۔اسماعیل خاں کی ایک بیاض کے حوالے سے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں ”بتاریخ 29 شوال،1297 ہجری بمطابق کنوارسری یکم 1937 بکرمی، یوم سہ شنبہ،5۔اکتوبر،1880ء،بعد مغرب یعنی غروبِ آفتاب برخوردار محمد میکائیل (عرف محمد محمود) تولد شد بمقام ٹونک

اسمِ تاریخی نظام الدین اسمٰعیل، منظور میاں، حمید الدین خاں (معنوی)

اِس عبارت کے نیچے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے نوٹ لکھا ہے”عرف محمد محمود اصل عبارت سے اوپر بعد میں لکھا گیا ہے۔غالباً اُس وقت جب بھائی مودود خاں تولد ہوا اور ناموں میں تبدیلی عمل میں آئی۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،”حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات“، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب،1993ء، ص۔30

6 یہ واقعہ پبلک احتجاج 1921ء ٹونک کی ریاستی دور کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ٹونک میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوا۔یہ ایک پبلک احتجاج تھا جو”مادھے والی کا جھگڑا“ یا ”ہنگامۂ 1921ء کے نام سے مشہور ہوا۔رعایا کی جانب سے حقوق طلبی کے اِس مظاہرے کو سختی سے کچل دیا گیا۔پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ خصوصیت سے زیرِعتاب آئے۔حافظ صاحب کی گرفتاری کے بھی احکام جاری ہو گئے۔بعض حضرات وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ حافظ صاحب کی گرفتاری کے احکام اُن کے بھائی مسعود خاں کی شکایت پر جاری ہوئے تھے۔کسی بہی خواہ نے وارنٹ پہنچنے سے پہلے اُنھیں (حافظ صاحب کو) صورتِ حال کی اطلاع دے دی۔یہ اپنے ملازم کو ساتھ لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور مارواڑ چلے آئے اور قیام جاری رکھا۔اسی عرصۂ قیام میں حافظ صاحب کا قبیلے کی ایک خاتون سے دوسرا نکاح ہوا۔یہ واقعات 1921ء سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،”حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات“، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب،1993ء، ص۔56

حافظ صاحب کے دوسرے نکاح کی داستان بھی ڈاکٹر صاحب نے بیان کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

”حافظ صاحب کے بھائی مقصود خاں مزاج کے تیز تھے۔اپنی پہلی بیگم کو (جن سے کوئی اولاد نہ تھی) جواب دے دیا۔وہ ڈھائی اپنے میکے چلی گئیں۔اِس بات کا قبیلے والوں نے بہت بُرا مانا اور جب حافظ صاحب وہاں پہنچے تو اُن کو آڑے ہاتھوں لیا۔قبیلے کی پنچایت کے فیصلے کے مطابق (جرگے کا کردار قبائلی زندگی میں ہمیشہ فیصلہ کُن رہا ہے) حافظ صاحب نے یہ نکاح کیا۔ان دوسری بیگم سے اُن کے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ایضاً، ص۔150

ڈاکٹر صاحب اِس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

”حافظ صاحب کے پہلی بیگم (والدہ اختر شیرانی) سے تعلقات زیادہ خوش گوار نہ تھے۔وہ بڑی سیدھی، باوقار، بردبار اور ہمدرد خاتون تھیں۔تاہم میاں بیوی کے درمیان ان بن رہی۔اس کا آغاز اُس وقت ہوا جب حافظ صاحب کے قیامِ انگلستان کے زمانے میں

اُن کے مخالف اعزہ نے یہ مشہور کر دیا کہ اُنھوں نے وہاں شادی کر رکھی ہے۔ وہ بدخواہوں کے اِس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئیں اور حافظ صاحب نے بھی واپسی پر اِس لغو اِلزام کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اختلافِ رائے اُس وقت سامنے آیا جب اختر صاحب ذرا بڑے ہوئے اور ماں کو اُن کی شادی کا اشتیاق ہوا۔ اُن کی مرضی تھی کہ اپنی نند زہرہ (اہلیہ نیاز محمد خاں شیرانی وکیل دربار ٹونک، حافظ صاحب کی یہ بہن دوسری والدہ سے تھیں اور اُن سے صرف دو ماہ چھوٹی تھیں اور اُن سے دلی محبّت کرتے تھے) کی لڑکی سے بیٹے کا رِشتہ کریں۔ اختر صاحب بھی راضی تھے مگر اِس بات پر حافظ صاحب کو آمادہ کرنا پتھر میں جونک لگانے کے مترادف تھا۔ غرض یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ 28۔ مارچ 1928ء میں اکلوتی بچی کے انتقال کے بعد اختر صاحب واحد اولاد تھے۔ جب اُنھوں نے مَے نوشی شروع کی تو پہلے والدہ کو پتہ چلا۔ اُنھوں نے بیٹے کی محبّت اور شوہر کے خوف سے اِس بات کو ایک عرصے تک پوشیدہ رکھا۔ باپ کو اُس وقت پتہ لگا جب یہ عادت پختہ ہو چکی تھی۔ تعلقات میں کشیدگی کا بڑا سبب یہی معاملہ تھا۔ چنانچہ آخر آخر میں بول چال کا موقع بھی کم ہی آتا تھا۔ ویسے حافظ صاحب ان کا پورا خیال رکھتے تھے اور وہ بھی شوہر کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ غرض 1946ء میں شوہر کا انتقال ہوا۔

1948ء میں جوان بیٹے (اختر) کا داغ لگا تاہم اُن کا عالم تسلیم و رضا دیدنی تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں بیگموں کی آپس میں ایسی الفت تھی کہ انجان دیکھے تو سمجھے حقیقی بہنیں ہیں۔ 1957ء میں دونوں ساتھ ساتھ حج پر گئیں۔ جہاں بڑی بیگم چند روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد 8۔ ذی الحجہ، 1376ھ (6۔ جولائی 1957ء) کو منیٰ کے مقام پر جاں بحق تسلیم ہوئیں۔

ایضاً ص۔ 164

چھوٹی بیگم (خدیجہ بیگم) کا 6۔ اکتوبر، 1984ء کو شیخو پورہ میں انتقال ہوا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اُن کی تاریخ بھی کہی۔

کاست "قلبِ ماہ" چوں ہاتف بگفت

الف = ا

برخدیجہ رحمتِ موفور باد

گفت مظہر سالِ تاریخِ وفات

باخدیجہ طاہرہ محشور باد

1406 - 1 = 1405ھ

مشمولہ "مجموعہ گلہائے تاریخ"، مرتّب فخر بخاری، لاہور، اظہار سنز، 2019ء، 1441ھ، ص۔ 42

''اختر صاحب اپنی دوسری والدہ (بیگم حافظ محمود شیرانی) کو ''بی چی'' کہتے تھے۔ یہ پہلے اختر کے حقیقی چچا مقصود خاں شیرانی کی اہلیہ تھیں یعنی اختر صاحب کی چچی تھیں۔ چچی بی کا مخفف ''بی چی'' ہے، اختر صاحب آخر تک اُنھیں اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔''

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، سہ ماہی ''سورج''، مدیر تسلیم احمد تصوّر، لاہور، سالنامہ، اکتوبر تا دسمبر، 2006ء، جلد 35، شمارہ 2، ص 110

7 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں: ''جب ٹونک سے جلاوطن ہو کر حافظ صاحب مارواڑ میں مقیم تھے، اُس وقت اختر کی عمر 16 برس ہو چکی تھی۔ اب'' حافظ صاحب نے سوچا کہ اُنھیں (اختر) لاہور لے جا کر اورینٹل کالج میں داخل کرا دیں۔ اِس مقصد سے بیٹے کو لے کر ستمبر/ اکتوبر 1921ء میں لاہور پہنچے۔''

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، ص۔ 56

8 اختر شیرانی، خود نوشت خاکہ، مشمولہ ''نقوش'' آپ بیتی نمبر، 1964ء، لاہور، ص۔ 1428

9 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''شعلۂ مستعجل'' مشمولہ ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، لاہور، القا پبلی کیشنز 2011ء، ص۔ 2

10 اختر شیرانی، خود نوشت، نقوش آپ بیتی نمبر، ص۔ 1429

11 جاوید اختر بھٹی، ''20 معروف ادبی شخصیات''، لاہور، برائٹ بکس، 2006ء، ص۔ 32

12 اختر شیرانی نے تو ''رومان'' کے بارے صرف یہی لکھا ہے کہ ''بوجوہ بند ہو گیا'' مگر ''رومان کے اجراء اور بندش کی کہانی عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور حکیم نیّر واسطی نے تفصیل سے بیان کی ہے۔

13 عاشق حسین بٹالوی ''چند یادیں چند تاثرات''، لاہور، آئینۂ ادب، 1969ء، ص۔ 135

14 ایضاً، ص۔ 137

15 ایضاً، ص۔ 139

16 ماہِ نو، جنوری، 1949ء، ص۔ 25

16-A ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، سہ ماہی ''سورج'' سال نامہ، اکتوبر تا دسمبر 2006ء، جلد 35 شمارہ 2، لاہور، ص۔ 160

17 حکیم نیّر واسطی ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر 1956ء، ص۔ 889

18 ایضاً، ص۔ 889

19 نقوش مکاتیب نمبر، دوم، ص۔ 737، یہ خط 11۔ اکتوبر، 1946ء کو لکھا گیا

20 اختر شیرانی ''خود نوشت''، ص۔ 1429

21 جاوید اختر بھٹی، ''20 معروف ادبی شخصیات''، لاہور، برائٹ بکس، 2006ء، ص۔ 317

22 ڈاکٹر عبدالسلام خورشید،''وے صورتیں الٰہی''،لاہور،قوم کتب خانہ،1976ء، ص ـ 39

23 حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ و اختر''،لاہور، کتاب خانہ نورس، 1950ء، ص ـ 128

24 شورش کاشمیری،''قلمی چہرے''،کراچی،مجلسِ یادگارِ شورش،1999ء،ص ـ 37

25 ایضاً،ص ـ 37

26 حکیم نیّر واسطی،نقوش،لاہور،شخصیات نمبر 2،اکتوبر 1956ء،ص ـ 897

27 محمد طفیل،''جناب''،لاہور،اِدارہ فروغِ اُردو،1961ء، ص ـ 59

28 حکیم نیّر واسطی،نقوش،لاہور،شخصیات نمبر 2،اکتوبر 1956ء،ص ـ 898

29 نصر اللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،کراچی،مکتبہ تہذیب وفن،1984ء،ص 90،91

30 محمد طفیل،''جناب''،ص ـ 59

31 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،کراچی،انجمن ترقی اُردو، 1976ء،ص ـ 72

32 حکیم نیّر واسطی،''نقوش،شخصیات نمبر 2''، ص ـ 889

33 سعادت حسن منٹو،''گنجے فرشتے''،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2009ء، ص ـ 51

34 حکیم سیّد محمود احمد برکاتی،''جادۂ نسیاں''،لاہور،کتاب سرائے،2009ء، ص ـ 51

35 ایضاً،ص ـ 52

36 عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''،لاہور،آئینہ ادب،1969ء، ص ـ 131

37 ایضاً،ص ـ 133

38 خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط''،لاہور،آئینہ ادب،1957ء،ص ـ 8 , 9

39 ایضاً،ص ـ 12

40 ایضاً،ص ـ 12

41 ایضاً،ص ـ 13

42 اختر شیرانی کا بیان مشمولہ''چند یادیں چند تاثرات''،ص ـ 131

43 عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''،ص ـ 133

44 خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط''،لاہور،آئینہ ادب،1957ء،ص ـ 17 , 18

45 خادم حسین بٹالوی ''اختر و سلمیٰ کے خطوط''، لاہور، آئینۂ ادب، 1957ء ص۔20

46 ایضاً ص۔21

47 ایضاً ص۔24

48 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء، ص۔60

49 حکیم نیّر واسطی ''سلمیٰ و اختر''، لاہور، کتاب خانہ نورس، 1950ء، ص۔70

50 ایضاً ص۔21، 22

51 عاشق حسین بٹالوی ''چند یادیں چند تاثرات'' ص۔134

52 حکیم نیّر واسطی ''سلمیٰ و اختر'' ص۔26

53 خادم حسین بٹالوی ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔31

54 ایضاً ص۔29

54-A ایضاً ص۔34

55 ایضاً ص۔36

56 ایضاً ص۔55 , 56

57 ایضاً ص۔69 , 70

58 ایضاً ص۔75 , 76

59 ایضاً ص۔77

60 حکیم نیّر واسطی ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر 1956ء، ص۔897

61 مکتوب مظہر محمود خاں شیرانی ابن اختر شیرانی بنام یونس حسنی، مؤرخہ 22۔اکتوبر، 1962ء، بحوالہ ڈاکٹر یونس حسنی ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، 1976ء، ص۔45

62 خادم حسین بٹالوی ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔197 , 198

63 ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی ''اُردو ادب ماحولیاتی تناظر''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2022ء، ص۔75

64 ڈاکٹر یونس حسنی ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔45

65 خادم حسین بٹالوی ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔80

66 خادم حسین بٹالوی ،''اختر وسلمیٰ کے خطوط''، لاہور، آئینۂ ادب، 1957ء، ص۔88

67 ایضاً، ص۔115

68 ایضاً، ص۔135

69 ایضاً، ص۔163, 164

70 حکیم نیّر واسطی ،''سلمیٰ واختر''، ص۔84

71 ایضاً، ص۔87

72 ایضاً، ص۔100,99

73 خادم حسین بٹالوی ،''اختر وسلمیٰ کے خطوط'' ص۔164

74 ایضاً، ص۔194

75 ایضاً، ص۔176

76 ایضاً، ص۔202

77 ایضاً، ص۔202

78 ایضاً، ص۔203

79 ایضاً، ص۔208

80 ڈاکٹر یونس حسنی ،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔379

81 ایضاً، ص۔379

82 ایضاً، ص۔384

83 پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سُرا، خط بنام راقم، 17۔اگست، 2022ء

84 ڈاکٹر یونس حسنی ،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔385

85 ایضاً، ص۔46

86 حکیم نیّر واسطی ،''سلمیٰ واختر''، ص۔130

87 ڈاکٹر یونس حسنی ،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔47

88 ایضاً، ص۔47

89 محمد طفیل ،''جناب''، لاہور، اِدارہ فروغِ اُردو، 1961ء، ص۔58
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا کہنا ہے کہ محمد طفیل خاص مشن پر ٹونک گئے تھے۔مقصد کچھ مخصوص پردہ نشینوں کے خطوط حاصل کرنا تھا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ (ڈاکٹر صاحب کی راقم اور پروفیسر فخر بخاری سے گفتگو، 15۔نومبر، 2017ء)

90 حکیم نیّر واسطی ،''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر 1956ء، ص۔897

91 ڈاکٹر یونس حسنی، ’’اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب‘‘، ص۔53

92 ایضاً، ص۔52

93 ایضاً، ص۔53

94 ایضاً، ص۔50

95 نصر اللہ خاں، ’’کیا قافلہ جاتا ہے‘‘، ص۔90

96 خادم حسین بٹالوی، ’’اختر و سلمیٰ کے خطوط‘‘، ص۔164

97 حکیم نیّر واسطی، خاکہ ’’اختر شیرانی‘‘، مشمولہ ’’نقوش شخصیات نمبر‘‘، جلد دوم، ص۔892

98 ڈاکٹر یونس حسنی، ’’اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب‘‘، ص۔53

99 شورش کاشمیری، ’’قلمی چہرے‘‘، ص۔37

100 شوکت تھانوی، ’’شیش محل، لاہور، اُردو بک سٹال، 1944ء، ص۔34

101 حکیم نیّر واسطی، خاکہ ’’اختر شیرانی‘‘، مشمولہ ’’نقوش شخصیات نمبر‘‘، جلد دوم، ص۔893

102 عاشق حسین بٹالوی، ’’چند یادیں چند تاثرات‘‘، ص۔146

103 ڈاکٹر عبد السلام خورشید، ’’وے صورتیں الٰہی‘‘، لاہور، قومی کتب خانہ، 1976ء، ص۔36

104 محمد طفیل، ’’جناب‘‘، ص۔63

105 احمد ندیم قاسمی، ’’میرے ہم قدم‘‘، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء، ص۔18

106 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ’’شعلۂ مستعجل‘‘ مشمولہ ’’کہاں سے لاؤں اُنھیں‘‘، لاہور، القا پبلی کیشنز، 2011ء، ص۔20

107 ڈاکٹر یونس حسنی، ’’اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب‘‘، ص۔18

108 ایضاً، ص۔19

109 ایضاً، ص۔7

110 حکیم سیّد محمود احمد برکاتی، ’’جادۂ نسیاں‘‘، لاہور، کتاب سرائے، 2009ء، ص۔50

111 ایضاً، ص۔42

112 ایضاً، ص۔43

113 ایضاً، ص۔43

114 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ’’کہاں سے لاؤں اُنھیں‘‘، ص۔14,13

115 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔74,73

116 حزیں کاشمیری،''کہاں گئے وہ لوگ''،لاہور،اِدارہ کتاب گھر،2005ء،ص۔166

117 میرزا ادیب،''ناخن کا قرض''،لاہور،امتزاج پبلی کیشنز،ص۔39

118 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔893

119 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔75

120 نصراللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔90

121 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،ص۔73

122 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔2

123 ایضاً،ص۔2

124 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔892

125 میرزا ادیب،''ناخن کا قرض''،ص۔32

126 حکیم سیّد محمود احمد برکاتی،''جادۂ نسیاں''،ص۔45

127 نصراللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔92

128 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔3

129 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔57

130 حکیم نیّر واسطی،''اختر و سلمیٰ''،ص۔75

131 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔3

132 ایضاً،ص۔4

133 ایضاً،ص۔4

134 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔892

135 نصراللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔195

136 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔15

137 نصر اللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔96

138 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''مجموعہ گلہائے تاریخ''،مرتّب سید فخر حسین بخاری،لاہور،اظہار سنز،2019ء،ص۔22

139 حکیم نیّر واسطی،''اختر و سلمیٰ''،ص۔165,164

140 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔17

141 نصر اللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔90

142 سعادت حسن منٹو،''گنجے فرشتے''،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2009ء،ص۔52,51

143 احمد ندیم قاسمی،''میرے ہم قدم''،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2007ء،ص۔12

144 ایضاً،ص۔15

145 میرزا ادیب،''ناخن کا قرض''،لاہور،امتزاج پبلی کیشنز،1981ء،ص۔32

146 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔7

147 ایضاً،ص۔9

148 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔889,888

149 محمد طفیل،''جناب''،ص۔63

150 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔74

151 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔891

152 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔10

153 حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ و اختر''،ص۔162

154 ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،ص۔75،بحوالہ شورش کاشمیری،روزنامہ''کوہستان''،لاہور،8 ستمبر 1963ء

155 حکیم سیّد محمود احمد برکاتی،''جادۂ نسیاں''،ص۔52

156 حکیم نیّر واسطی،خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''،جلد دوم،ص۔889,888

157 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔17

اختر شیرانی پر لکھے گئے خاکے

متن

اختر شیرانی

اختر شیرانی (خودنوشت)

۱۹۰۵ء کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں (غالباً) میرے دادا جن کا نام مولوی محمد اسمٰعیل خاں تھا تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اُن کے نام سے علمی دُنیا اچھی طرح واقف ہے۔ اُن کی تنقیدی نظر مستشرقین سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ جاننے والی نظریں اُنھیں جاننے کی طرح جانتی ہیں اور ماننے والی حقیقت شناسیاں ماننے کی طرح مانتی ہیں۔

۱۹۱۹ء میں والیٔ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احسان فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والدِ ماجد کی معیت میں لاہور جیسی متمدن، مہذب اور شاندار دنیا میں آنا پڑا۔ ہندوستان کے مشہور اور دنیائے اسلام کے مشہور تر شاعر علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر تھے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ آغازِ طفلی میں داغ جیسے مشہور شاعر کو بھی میری خوش مذاقی یا بدمذاقی نے توہین آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ زپازدہ سالہ عمر کی نادانیاں، مرزا نوشہ کی غزلوں پر غزل لکھنا، اپنے لیے قابل تعریف سمجھا جاتا۔ اُن کی تقلید میں بہت کچھ مہمل نگاری کے بعد مرحوم کی ذہانت کی قدر دانیاں، اِس عہد میں اپنے اوجِ شباب کو پہنچی تھیں۔ گو سر عبدالقادر، سر اقبالؒ اور اُن کے ہم مذاقوں کی قدر شناسی مرزائے مرحوم کے ''اوجِ قبول'' کی ابتدائی تربیت میں مصروف تھیں۔ لاہور آنے پر والد ماجد نے اپنے جن عزیز دوستوں سے ملاقات کرائی اُن میں علامہ اقبالؒ، مرزا محمد سعید (آئی ای ایس) اور سر عبدالقادر بھی تھے۔ ایک بھولا بھالا بچہ ایک مشہور اور مقبول شاعر کو جس عقیدت بھری نظر سے دیکھ سکتا ہے، وہ نظر انارکلی کے پُرشور و پُر از ہجوم بازار میں بھی اس کی ارادتوں کی شریک تھی لیکن نتیجہ کچھ زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے محترم دوست مولانا نیاز فتح پوری نے سر اِقبال مرحوم کی ملاقات کے

بعد کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو مرحوم کے عقیدت کیشوں کے لیے زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ میرا خیال بھی اس سے مختلف نہ تھا بہر حال بقول شاعر

بحرِ ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

کے قصور کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اِس لیے اِس تذکرے کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ اب رہے اپنے حالات جس کے اظہار کے دوران مَیں کسی قدر بہک چلا تھا، اس کی طرف اپنے عزیز (سیّد) بشیر ہندی کے اصرار پر رجوع کرتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ دو چار مہینے منشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہوگیا۔ ڈاکٹر ولنر آنجہانی جو بعد کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہوگیا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ گلستان کا ''باب پنجم'' اور خیام کی ''رُباعیات'' لاہور کے ہر ذرّے میں دعوتِ قبول دے رہی تھیں۔ یہاں یہ عالم تھا کہ بقول آقائی میرزا حسین کاظم زادہ مدیر و سر و بیر مجلّہ ''ایران شہر'' (برلن):۔

''شما کہ یک قریحہ صالح جانِ جوشاں و دل تپاں و جذبات سوزاں وارید۔۔۔۔۔حیف باشد کہ زبانِ سعدی در کام و ذوالفقارعلی در نیام بہ ماند۔''

چنانچہ تباہیوں کی اِس دعوت کو قبول کرنا پڑتا اور ''ہمایوں'' کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے ''بہارستان'' کی ادارت کا بار اُٹھانا پڑا۔ تعلیم چھوٹ گئی اور جنونِ عشق و شباب کے ہاتھوں اُسے خیر باد کہنا پڑا۔ چند سال گزرنے کے بعد از سرِ نو تعلیم کی دُھن سوار ہوئی اور مَیں اپنے پُرانے کالج (اورینٹل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے بعد صحافت کی وحشت جواب تک

مِری تعمیر میں مضمر تھی اِک صورت خرابی کی

کا ہیولا (خون گرم دہقان) کی شکل میں کرم فرما رہی تھی، از سرِ نو دامن گیر ہوئی اور مَیں نے ''خیالستان'' کے نام سے ایک ماہنامہ پرچہ نکالا۔

''بہارستان'' کی زندگی نے جب کہ مرحوم مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا میرے ایک مضمون نے جو مولانا ئے مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا، مولانا محمد علی کو اِتنا متأثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے اِدارے کے توسّط سے مجھے مجبور کیا کہ میں ''ہمدرد'' کے فکاہی کالم کے لیے (کم از کم ہفتے میں ایک بار) کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔ چنانچہ اس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔

محمد علی بھی آج رخصت ہوگیا۔ ''ہمدرد'' بھی مِٹ چکا۔ مگر مَیں اور میری جنون سامانیاں ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ''رومان'' کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا۔ جو بوجوہ بند ہوگیا۔ اب رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ، جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے علم کے بعد نہ کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو، ورنہ یہ موضوع میرے لیے ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

پر عمل کرسکوں:۔

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اُٹھا رکھی ہے

پر اِس کو ختم کروں۔

شاعری کے متعلق مجھ سے میرا نظریہ دریافت کیا گیا ہے۔ مختصر تر الفاظ میں گزارش کروں گا کہ میرے نزدیک شاعری ایک ایسا جذبہ ہے جو صرف عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور اُنھی کے لیے باعثِ حاصل مسرت ہے اور بس۔۔۔!

(''نقوش'' لاہور آپ بیتی نمبر، جون 1864ء)

❁❁❁❁❁❁❁

احمد ندیم قاسمی

اختر شیرانی

جب مَیں استفسار کرنے والوں کو بتا تا ہوں کہ جس وقت مَیں نے شعر کہنا شروع کیا تو بیک وقت اقبالؔ، جوشؔ، ظفرؔعلی خاں اور اخترؔ شیرانی سے متاثر تھا، تو وہ بہت حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ''بُعد المشرقین'' اُن کی سمجھ میں نہیں آیا اور میں اُنھیں سمجھا بھی نہیں پاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آغاز میں اِنھی شخصیات سے متاثر تھا۔ بعد میں میری پسند میں غالبؔ اور میرؔ بھی داخل ہو گئے مگر اخترؔ کا طلسم بھی قائم رہا۔ متذکرہ شعرائے کرام کی موجودگی میں اخترؔ شیرانی کی مقبولیت ان سے کسی طرح کم نہ تھی بلکہ اُردو شاعری کے نوجوان قارئین تو اخترؔ کی نظموں کو ازبر کیے رہتے تھے۔ اخترؔ کی شاعری کا طلسم آنے والے کئی برسوں تک قائم رہا بلکہ بعض تحفّظات سے قطعِ نظر اب تک قائم ہے۔

میری شاعری کا آغاز تھا اور اُس زمانے میں ادبی رسالوں میں اخترؔ کے ''رومان'' کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ میرا پہلا افسانہ بھی ''رومان'' ہی میں شائع ہوا تھا اور میرا ابتدائی کلام بھی ''ہمایوں'' کے علاوہ ''رومان'' میں درج ہوتا رہا۔ اخترؔ نے نہایت باقاعدگی اور محبت سے میرے عقیدت مندانہ خطوں کے جواب لکھے۔ اب تک اُن سے زیادہ خوش خط شاعر میرے تجربے سے نہیں گزرا۔ میں نے یہ خط محفوظ کر رکھے تھے مگر کچھ زیادہ ہی محفوظ ہو گئے کہ اب تلاش کے باوجود دستیاب نہیں۔ اخترؔ نے میرا ایک خط ''رومان'' میں بھی شائع کیا اور اس کے جواب میں غالبؔ کا یہ شعر درج کیا:

دل نہیں ورنہ دِکھاتا تجھے زخموں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

یہ ۳۵-۱۹۳۶ء کے دن تھے جب میں گاؤں سے لاہور آیا اور فلیمنگ روڈ پر اخترؔ کے ہاں

حاضر ہوا۔ اُن کا دفتر عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ میری عقیدت مندی انتہا پر تھی مگر جب میں نے دبی زبان سے اپنا تعارف کرایا تو اخترؔ اِتنے تپاک سے ملے جیسے مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ اُن کی شخصیت بھی سیدھی سادی تھی اور اُن کی گُفت گُو میں بھی محبت کی چاشنی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اِتنا مشہور و مقبول شاعر اِتنا نرم گُفتار بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد میں اُن کی خدمت میں بلا ناغہ حاضر ہونے لگا۔ اُن کے ہاں عموماً پان کا دور چلتا تھا اور میں اِس معاملے میں پنجاب کا پکا دیہاتی تھا۔ پان لے تو لیتا تھا مگر اس پر لگا چونا چُپکے سے میز کے نیچے رگڑ دیتا تھا۔

اخترؔ کے والدِ گرامی محترم حافظ محمود شیرانی جب بھی یونیورسٹی سے گھر تشریف لاتے تھے تو اخترؔ کو اُن کے قدموں کی چاپ سے پتہ چل جاتا تھا کہ حافظ صاحب تشریف لائے ہیں۔ اخترؔ فوراً سگریٹ بجھا کر اور کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھنے کا انداز اِختیار کر لیتے تھے اور کنکھیوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ حافظ صاحب قبلہ عمارت کی تیسری منزل پر رہتے تھے۔ وہ جب بھی اپنے گھر تشریف لائے، اُنھوں نے اخترؔ کے کمرے کی طرف بھولے سے بھی نظر نہ ڈالی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ حافظ صاحب اپنے بیٹے سے خفا ہیں اور اُن دونوں میں بول چال بھی نہیں ہے مگر میں اختر سے براہِ راست یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ قصّہ کیا ہے۔ آخر ایک روز اخترؔ نے خود بتایا کہ حافظ صاحب اُن کی مختلف سرگرمیوں سے شاکی ہیں اور ایک عرصے سے اپنے بیٹے سے خفا ہیں۔ اس کا ایک اور ثبوت مجھے اُس روز ملا جب میں حافظ صاحب کے لیے فارسی کے بڑے شاعر حافظ شیرازی کے دیوان کا ایک ایسا نسخہ لایا جو سات رنگوں میں نہایت سلیقے سے چھپا تھا اور اُس کا ناشر شاید بمبئی کا کوئی سیٹھ تھا۔ میں نے اخترؔ صاحب سے کہا کہ حافظ صاحب سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ میں اُن کی خدمت میں دیوانِ حافظ کا یہ نایاب نُسخہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ کہے بغیر اُٹھے اور مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ ہم تیسری منزل پر حافظ صاحب کے خاص کمرے کے دروازے پر پہنچے تو اخترؔ نے ہولے سے کہا کہ اپنا تعارف خود کرا لینا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ حافظ صاحب نے مجھے دیکھا تو اُٹھ کر میرے پاس آئے۔ پیار سے مصافحہ کیا اور بولے: ’’فرمائیے۔‘‘ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد دیوانِ حافظ کا وہ نُسخہ پیش کیا تو اسے دیکھ کر مُسکرائے۔ میرا شکریہ ادا کیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک الماری کے

پاس آئے اور دیوانِ حافظ کا یہی نُسخہ نکال کر بولے: ''یہ نُسخہ تو میرے پاس کب کا موجود ہے مگر میں آپ کا تحفہ بھی شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔'' میں وہاں سے شرمندہ شرمندہ سا واپس آ گیا۔ حافظ محمود شیرانی سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے اختر صاحب کو صورتِ حال بتائی تو وہ بولے: ''مجھے معلوم تھا کہ حافظ صاحب کے پاس یہ نسخہ پہلے سے موجود ہو گا مگر میں نے تمھیں روکا نہیں کہ اِس طرح تمھیں دکھ ہوتا۔ چلو حافظ صاحب سے تمھارا تعارف تو ہو گیا۔ یہی بہت ہے۔''

انجمن حمایتِ اِسلام کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شعراء کو دعوت دی گئی کہ ''پیغامِ عمل'' کے عُنوان سے نظمیں لکھیں۔ بہترین نظم لکھنے والے کو سونے کا تمغہ دیا جائے گا۔ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کا مطالعہ میرا ممد ثابت ہوا۔ میں نے بھی اِس موضوع پر نظم لکھی اور اسے بہترین نظم قرار دیا گیا۔ مجھے انجمن کی گولڈن جوبلی کے اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے وسیع میدان میں ایک بے حد پُرہجوم جلسے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے سونے کے تمغے کا انعام عطا کیا۔ میں یہ تمغہ جیب میں ڈال کر اپنی نشست پر آیا تو ایک نوجوان نے میرے کان میں سرگوشی کی آپ کو اختر شیرانی بلا رہے ہیں۔ اخترؔ چند نوجوانوں میں گھرے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا تو اُنھوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ انعام کی مبارک باد دی اور فرمایا: ''مگر ندیم! تمغے گونگے ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس تشریف لے گئے اور میں دم بخود کھڑا رہ گیا کہ آخر اخترؔ صاحب نے مجھ سے کیا کہنا چاہا ہے۔ اُس وقت تو مجھے اُن کے اس جملے کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا مگر اب اس کے معانی مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکے ہیں۔

میرے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش صاحب وطن ہائی سکول لاہور میں اُستاد تھے۔ میں بے کار تھا۔ میرے ایک ہم جماعت منور حسین شاہ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے اور ہمارے ہاں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ بھائی جان نے ریلوے روڈ کی ایک عمارت کی تیسری منزل پر ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا اور ہم تینوں اس میں مقیم تھے۔ پانی نیچے ایک نلکے سے دستیاب ہوتا تھا اور چونکہ میں کچھ زیادہ ہی صحت مند تھا اِس لیے نیچے سے اُوپر بالٹی میں پانی ڈھونا میرے فرائض میں شامل تھا۔

ایک روز بھائی جان نے اعلان کیا کہ مہینے کا آخر ہے اور اُن کے پاس معمولی سی رقم بچی ہے۔ ''شاہ'' کا مطالبہ ہے کہ نشاط سینما میں فلم ''خیبر پاس'' دیکھی جائے۔ فیصلہ کرلو کہ اِس رقم سے فلم دیکھو گے یا کھانا کھاؤ گے۔ فیصلہ ہوا کہ ٹاس کر لیتے ہیں۔ ٹاس کا نتیجہ فلم دیکھنے کے حق میں ہوا۔ بھائی جان نے کہا کہ اِس صورت میں کھانے کی بجائے چنے چبانا ہوں گے۔ چنانچہ ہم تینوں چنے چباتے رہے اور فلم دیکھتے رہے۔ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو بند تالے میں ایک کاغذ اٹکا ہوا تھا۔ وہ بھائی جان نے پڑھا اور بتایا کہ اخترؔ شیرانی صاحب نے نہایت خوش خط الفاظ کے ذریعے ندیم سے کہا ہے کہ ''میں نے سُنا ہے تم بے کار ہو اور تمھیں کوئی ذریعۂ معاش نہیں مل سکا۔ میں تمھارا بڑا بھائی ہوں اِس لیے تمھیں حکم دیتا ہوں کہ جب تک تمھارے روزگار کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا تم میرے خرچ پر صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، بعد دوپہر کی چائے اور رات کا کھانا عرب ہوٹل میں کھاؤ گے۔ نہیں کھاؤ گے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اور اگر کوئی مہمان یا دوست ساتھ ہوا تو اُسے بھی کھانے میں شامل کرو گے۔'' ظاہر ہے بھائی جان اِس پیش کش سے بہت متأثر ہوئے اور اخترؔ صاحب کی آخری دھمکی کے پیشِ نظر مجھے مشورہ دیا کہ عرب ہوٹل چلے جایا کرو ورنہ اخترؔ صاحب کا سا فرشتہ سیرت دوست کھو بیٹھو گے۔ میں دو تین مہینے تک عرب ہوٹل میں ناشتہ کرتا اور کھانا کھاتا رہا اور اپنے مہمانوں کو بھی کھلواتا رہا۔ ایک روز عرب ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ ویسے تو اختر صاحب مہینوں تک اپنا حساب نہیں چکاتے مگر جب سے تم اُن کے خرچ پر میرے ہوٹل میں کھانا کھانے لگے ہو اختر صاحب مہینے کی پہلی تاریخ کو آتے ہیں اور سارا حساب چُکا دیتے ہیں۔ آخر تم ان کے کیا لگتے ہو؟ میں نے کہا: ''میں اُن کا چھوٹا بے روزگار بھائی لگتا ہوں۔''

اُس دَور کے شعراء میں سے میرے علاوہ ن م راشد، سید ضمیر جعفری اور ناصر کاظمی، اختر صاحب کے اِنتہا درجے کے عقیدت مند تھے۔ میں ضمیر جعفری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں ایک رات کا مفصّل ذکر کر چکا ہوں جب اخترؔ صاحب نشے کے عالم میں ضمیر صاحب سے اپنا کلام ترنّم سے سُنتے رہے۔ مجھ سے بھی ایک نظم ترنّم سے پڑھنے کو کہا مگر جب میں نے عرض کیا کہ میں ترنّم کی نعمت سے محروم ہوں تو اُنھیں ضمیر صاحب پر ہی اِکتفا کرنا پڑا۔

میں ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر تھا۔ ایک دو روز کے لیے لاہور آیا تو اپنے نہایت پیارے دوست نندلال انیجہ کے ہمراہ فلیمنگ روڈ پر اختر صاحب سے ملاقات کے لیے گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر وہاں سے چلے گئے ہیں۔ ''رومان'' بھی بند ہو چکا ہے اور علامہ تاجور نجیب آبادی نے اُنھیں اپنا رسالہ ''شاہکار'' مرتّب کرنے کے لیے ملازم رکھ لیا ہے اور اختر صاحب وہیں پائے جاتے ہیں۔ میں نند کے ہمراہ اُنھیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھے الگ لے گئے اور بولے ''تمھارے پاس اِس وقت کتنی رقم ہے؟'' میرے پاس واپس ملتان جانے کا کرایہ تھا، سو میں نے یہ رقم نکال کر اُنھیں دکھائی۔ وہ شاید شدید ضرورت میں مبتلا تھے۔ اُنھوں نے وہ رقم لے لی اور مجھے میرے دوست نند نے لاہور سے ملتان کا ٹکٹ خرید کر دیا۔

قیامِ پاکستان کے چند ہفتے بعد کا واقعہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ بھارت سے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ نہ جانے کس خوشی میں مشاعرے کی صدارت مجھے سونپی گئی۔ مشاعرہ جاری تھا جب اختر صاحب اپنے ایک عقیدت مند قمر تسکین کا سہارا لیے مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے۔ سیدھے سٹیج پر تشریف لائے اور بولے ''اچھا تو ہمارا ندیم مشاعرے کی صدارت کر رہا ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے۔'' پھر مائیکروفون پر جا کر شعر سُنانے کی بجائے اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔ دراصل وہ اُس وقت انتہائی نشے میں تھے۔ اِس پر قریب قریب سب حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے اور شور مچا دیا۔ ''شرابی، شرابی! ہم شرابی کو نہیں پڑھنے دیں گے۔'' اِس پر آغا شورش کاشمیری لپک کر سٹیج پر آئے اور ایسی دھواں دھار تقریر کی اور اختر کی شاعرانہ عظمت کی اِس انتہا کی تحسین کی کہ غصّے سے بھرا ہوا ہجوم ٹھنڈا ہو گیا اور قمر تسکین اختر صاحب کو سہارا دے کر ہال سے باہر لے گئے۔۔۔۔ یوں میری صدارت کا بھرم بھی قائم رہا اور مشاعرہ بھی جاری رہا۔ یہ شورش صاحب کا کمال تھا۔

اختر صاحب شاید ٹونک تشریف لے گئے تھے۔ اِس دوران قیامِ پاکستان کے دِنوں میں فسادات شروع ہو گئے اور کسی اخبار میں اِس طرح کی ایک خبر بھی چھپ گئی کہ اختر شیرانی قتل ہو گئے ہیں۔ بے حساب دکھ کا اظہار ہوا اور شاید اخباروں نے ماتمی شذرے بھی لکھے مگر اختر صاحب لاہور میں نمودار

ہوئے اور اس غلط خبر کی تردید ہوئی۔

میں ایک روز لوہاری دروازے اور انارکلی کے چوک میں سے گزر رہا تھا جب میں نے دیکھا کہ اخترؔ صاحب نشے کے عالم میں چوک کے وسط میں کھڑے ٹریفک کنٹرول کر رہے ہیں اور انارکلی کے آغاز میں کتابوں کی دکانوں پر لوگ کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔ میں نے اُن لوگوں کو شرم دلائی۔ اخترؔ صاحب کے قریب گیا تو وہ بولے: ''ندیم! تم یہاں کیسے آگئے؟ کسی تانگے کی جھپٹ میں آجاؤ گے۔'' میں نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور عرض کیا کہ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ بولے ''ہاں ہاں بتاؤ۔'' میں نے ایک تانگہ پکڑا اور اخترؔ صاحب کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے اُنھیں حکیم نیّر واسطی صاحب کے ہاں پہنچایا اور حکیم صاحب سے عرض کیا کہ اِس حالت میں انھیں نکلنے نہ دیا کیجیے۔

میں نے رسالہ ''نقوش'' جاری کیا تو ایک روز ایبک روڈ پر اُس کے دفتر میں آئے اور فرمایا۔

''ندیم! میں نے تمھارا رسالہ دیکھا ہے۔ اس میں تمھاری ایک غزل درج ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:

کسی چمن میں بس اِس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بُھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ غزل تو مجھے کہنا چاہیے تھی۔ تم نے کیسے کہہ لی!!''

یہ اُن کی طرف سے میرے شعر کی تحسین تھی۔

میں نے جب بھی اختر صاحب کو نشے کی حالت میں دیکھا، یہ سوچ کر اُداس ہو گیا کہ شراب نے ایک نہایت نیک طبع اور پاکیزہ فطرت شاعر کو کتنا بے بس کر ڈالا ہے۔ اخترؔ صاحب سے اُن کے والدِ گرامی حافظ محمود شیرانی کو یہی واحد شکایت تھی۔ مدہوشی کے عالم میں بھی اُن کے مزاج کی نیکی اور پاکیزگی قائم رہتی تھی۔ بس اپنے عقیدت مندوں سے اپنی ہی شاعری سُنتے تھے اور آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ اِس سے زیادہ میں نے اُنھیں کبھی آؤٹ نہیں دیکھا البتہ جب ایک روز وہ انارکلی کے چوک میں کھڑے ''ٹریفک کنٹرول'' کر رہے تھے تو اُن کے پاجامے کا پائنچہ نیفے تک پھٹا ہوا تھا اور جب وہ ہوا میں پھڑ پھڑاتا تھا اور اُن کی ٹانگ ننگی ہو جاتی تھی تو اُنھیں اپنی اِس ہیئت کذائی کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ چوک انارکلی میں

ناشرین کُتب اور تاجرانِ کُتب کی متعدد دکانیں تھیں اور وہ سب اپنے دَور کے ایک بڑے شاعر کی اِس دردناک حالت پر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے اُنھیں شرم دلائی۔ بعد کا واقعہ اُوپر عرض کر چکا ہوں۔

ویسے تو میں نے اپنی ایک غزل میں یہ شعر بھی کہہ رکھا ہے کہ:

جام چھلکیں تو بھگو دیتے ہیں محفل ساری
ویسے ہم کو تو کوئی کد نہیں مَے خواروں سے

مگر اخترؔ صاحب کے علاوہ اپنے عزیز دوستوں منٹو اور مجاز اور عدم اور میراجی کو انتہائی مدہوشی کے عالم میں دیکھ کر مجھے اِس لیے کچھ زیادہ ہی دکھ ہوتا تھا کہ کتنی ہی پیاری شخصیتیں اِس نامراد عادت نے کچھ سے کچھ کر ڈالی ہیں۔

یہ ستمبر ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے، میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو اپنے قریبی عزیز مسعود پرویز کے ہمراہ میرے ہاں آئے اور بتایا کہ اخترؔ شیرانی بے ہوش ہیں اور اِس وقت میو ہسپتال میں زیرِعلاج ہیں۔ چلو اُنھیں دیکھ کر آئیں۔ میو ہسپتال کے ایک وارڈ میں ہم نے دیکھا کہ اخترؔ بے ہوش ہیں اور اُنھیں ڈرِپ لگی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا بچنا مشکل ہے اِس لیے کہ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ان کا جگر پتھر بن چکا ہے۔ ہم تینوں کچھ دیر تک بے حد اُداس کھڑے اپنے پیارے شاعر کو موت کے مُنہ میں جاتا دیکھتے رہے۔ دوسرے ہی روز اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کا خاندان ٹونک سے لاڑکانہ آ چکا تھا۔ اُن کی میّت کو اُن کے عزیزوں کی آمد تک بطور امانت رکھا گیا مگر جس روز اُن کے عزیز لاہور پہنچے اُسی روز کراچی میں قائدِاعظم کے انتقال کی خبر آئی اور سارا لاہور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اِسی کیفیت میں اختر کا جنازہ اُٹھا۔ اُنھیں میانی صاحب کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ بہاول پور روڈ پر اُن کا مزار اُن کے نام کے کتبے کے ساتھ موجود ہے۔

حق بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات کا غیر مشروط اعتراف کیے بغیر اُردو شاعری کی سچی تاریخ مرتّب ہی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اخترؔ کی وفات کے بعد ہمارے نقّادوں نے اس بے مثال شاعر سے گُناہ کی حد تک بے اعتنائی برتی مگر عالمی تاریخِ شعراء پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ زرِخالص کی پہچان میں بعض

اوقات ذرا زیادہ مُدّت گزر جاتی ہے۔ سامنے کی مثال مرزا غالب کی ہے کہ اپنی زندگی میں وہ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

مگر اِس کے بعد غالب ہی ہماری فضائے شعر پر ابرِ بہار بن کر چھا گیا اور اب تک چھایا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اختر کی انفرادی عظمت کے اعتراف کا وقت بھی زُود یا بدیر ضرور آئے گا۔

(میرے ہم قدم)

❀❀❀❀❀❀❀

تابش صدیقی

اختر شیرانی کی یاد میں

شاعرِ نغمہ و رومان، خیامِ اُردو اختر شیرانی کا نام آتا ہے تو میری آنکھوں میں ۱۹۳۴ء کے جون کی ایک جھلستی دو پہر کا نقشہ پھرنے لگتا ہے جب میں ایک بزرگ کا تعارفی خط لے کر مرحوم سے ملنے گیا تھا۔ وہ اُن دِنوں ۱۹ فلیمنگ روڈ پر اپنے والد پروفیسر محمود شیرانی کے ساتھ رہتے تھے۔ ملاقات کا جوشوق مجھے اُن کے پاس لے گیا تھا وہ اس پہلی ملاقات کے بعد برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان ساری صحبتوں کی یاد جو میں نے اختر شیرانی کی رومان انگیز شخصیت کے ساتھ گزاری ہیں، میری زندگی کا بڑا عزیز سرمایہ بن گئی ہے۔

۱۹۳۴ء کا زمانہ اُن کی انتہائی ہر دل عزیزی کا زمانہ تھا، ملک میں اُن کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہر طرف اُن کی نظموں کے چرچے تھے۔ ''جوگن''، ''اے سرزمین گجرات''، ''اے عشق کہیں لے چل''، ''ایک بار دیکھا دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے''، ''وکٹوریہ گیٹ میموریل میں چند زندہ تصویریں دیکھ کر''، ''ادب کی محفلوں میں کالج کے طالب علموں میں'' راہ چلنے والوں کی زبان سے اِن نظموں کے نشہ آور ٹکڑے سُنائی دیتے تھے۔

اختر صاحب کو والد کے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ ملا ہوا تھا جس میں اُن کی کتابوں کا ذخیرہ، چند کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ دوست احباب کا جمگھٹا یہیں لگتا تھا۔ سگرٹیں پی جاتی تھیں اور شعر سُنے اور سُنائے جاتے تھے۔ دوست پہروں بیٹھے رہتے تھے۔ اور اکثر ایسے بیٹھتے کہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ اور اختر دوستوں کی خوشنودی کی خاطر اپنے وقت کا ہر لمحہ اُن کے لیے وقف کر دینے میں عذر نہ کرتے تھے۔ اُن کی دوست نوازی اُن کی سب سے بڑی خوبی شمار کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ جیب خرچ

کی وہ ساری معقول رقم جو والد صاحب سے اُنھیں ملتی تھی دوست نوازی میں ختم ہو جاتی اور اختر خود سختی سے گزارتے لیکن اُن کی حمیت نے کبھی اپنے دوستوں پر اس کا اظہار گوارا نہ کیا۔

دوستوں کی جاں نثاری کی دوسری منزل یہ تھی کہ اگر کسی دوست سے دانستہ یا نادانستہ کوئی نقصان پہنچا تو ماتھے پر شکن نہ لاتے۔ لوگوں نے اُن کی اِس خوبی کو کمزوری سمجھ کر اس سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ مثلاً اُنھوں نے کئی بار رسالہ نکالا لیکن ہر بار کوئی دوست رسالہ دبا کر بیٹھ گیا اور یہ خاموش ہو رہے۔ ''انتخاب'' اور ''خیالستان'' کے بعد جب اُنھوں نے ''رومان'' نکالا تو اُس کا ڈیکلریشن ایک دوست کے نام سے لیا۔ جب رسالہ خوب چل نکلا تو دوست اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ دوستوں نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض احباب نے مقدمہ کی پیروی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں لیکن اختر مرحوم اپنے ایک پرانے دوست کو عدالت میں ذلیل کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ اور آمدنی کے ایک معقول ذریعہ سے محروم ہو کر زندگی کے دن بڑی تنگی ترشی سے گزار دیے۔

اُنھیں کسی کی معمولی سی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ اگر کسی دوست سے سُن پاتے تھے کہ فلاں دوست نے اُن کے بارے میں کوئی بُری بات کہی یا کی ہے تو سُن کر مسکرا دیتے۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ ''بعض لوگ مجھے دھوکا تو دیتے ہیں لیکن ستم یہ ہے وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں، اور میں اِس لیے خاموش رہتا ہوں کہ اُنھیں اپنی حرکت پر غور کرنے اور نادم ہونے کا موقعہ ملے۔''

اُن کے دوستوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر بھی اور گھٹیا درجے کے شرابی بھی لیکن دوستی میں سب اُن کے لیے برابر تھے۔ یکساں خوش اخلاقی سے ملتے اور یہی چیز عملی زندگی میں اُن کے لیے مُضر ثابت ہوتی۔

اختر کی زندگی کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزرا۔ اُنھوں نے پنجاب کی سیاست کے (جس کا مرکز لاہور تھا) کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ ہزاروں سیاسی ہنگامے اِس شہر میں برپا ہوئے لیکن اُنھوں نے ان سب ہنگاموں کو ایک خاموش ناظر کی طرح دُور سے دیکھا اور اپنا دامن کبھی سیاست سے آلودہ نہ کیا۔

یہ علیحدگی صرف سیاسی ہنگاموں ہی تک محدود نہ تھی۔ ادبی جلسوں اور مشاعروں سے بھی

اُنھیں اسی درجہ اجتناب تھا۔ایک زمانے میں لاہور میں جگرؔ، اصغرؔ، روشؔ، یگانہؔ، حفیظؔ، تاثیرؔ اور تاجورؔ جیسے شعراء موجود تھے۔ان کے دم قدم سے ادبی فضا میں بڑی گہما گہمی تھی۔ہر ہفتے کوئی نہ کوئی مشاعرہ یا کوئی نہ کوئی ادبی جلسہ ہوتا تھا لیکن اخترؔ اِن سب باتوں سے بے نیاز ۱۹ فلیمنگ روڈ پر اسی چھوٹے سے کمرے میں زندگی گزارتے رہے۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۳ء تک مشکل سے پانچ چھ مشاعروں میں شرکت کی ہوگی۔لاہور کے ہر مشاعرے میں اُن کے نام کا اعلان کیا جاتا تھا لیکن وہ اس میں نہیں جاتے تھے۔ایک تو عزلت پسند تھے ساتھ ہی اُنھیں اِس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ مشاعرے کے شاعر نہیں۔

اخترؔ بے حد مستغنی الطبع تھے۔بڑی سے بڑی تحریص بھی اُن کے ضمیر کو نہ خرید سکتی تھی۔۱۹۳۰ء میں حکومتِ پنجاب کے ایک بڑے افسر نے اُن سے ایک ڈرامہ لکھنے کو کہا جس میں تشدّد کی مذمّت کی گئی ہو۔اور وعدہ کیا کہ انعام میں حکومت اُنھیں خطاب اور مربع دے گی۔اور اُن کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے انکار کر دیا۔اِسی قسم کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاس کی اور ملک میں ہندوؤں نے ہر طریقے سے مخالفت کرنے کی قسم کھائی تو اخترؔ مرحوم کے ایک دوست لدھارام اُن کے پاس آئے کہ اُن سے قرارداد کے خلاف کچھ لکھوائیں۔پہلے دوستی کا واسطہ دے کر کام نکالنے کی کوشش کی۔جب یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو کانگرس کے زروسیم کا تذکرہ کیا لیکن اخترؔ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور لدھارام کو مایوس واپس جانا پڑا۔

اِسی استغنا کی وجہ سے زندگی بھر ملازمت نہ کی۔جنگ کے زمانہ میں (جب ایسے لوگوں نے بھی سرکار انگریزی کی فوج میں بھرتی ہونا اپنے لیے عین سعادت سمجھا جو سرکاری ملازمت کو حرام خیال کرتے تھے) مرحوم کا سرکاری ملازمت حاصل کر لینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن ملازمت کی پابندیوں میں جکڑے جانے کی بجائے اُنھوں نے مفلسی اور تنہائی کی زندگی کو ترجیح دی۔جہاں تک مجھے علم ہے ایک دو بار اُنھیں حکومتِ ہند نے پروپاگنڈے کے محکمہ میں ملازمت کی پیش کش کی لیکن اُنھوں نے اسے قبول نہ کیا۔

۱۹۳۵ء میں اُنھیں دارالترجمہ حیدر آباد میں ایک معزّز عہدہ پیش کیا گیا لیکن وہ وہاں جانے

پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ ملازمت خواہ سرکار انگریزی کی ہو یا کسی ریاست کی وہ اسے لعنت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اِس لعنت سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی

اُن کے والد جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری سے علیحدہ ہو کر اورینٹل کالج لاہور میں تشریف لے گئے تو کالج کی کمیٹی کے ایک معزز رکن نے اختؔر سے کہا ”آپ اپنے والد کی جگہ اُردو کے پروفیسر ہو جایئے“، لیکن اختؔر نے یہ کہہ کر درخواست رد کر دی ”لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔“ سُنا ہے اِس جواب سے اُن کے والدِ مرحوم پروفیسر محمود شیرانی کو بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی اور تعلیمی زندگی کے فوائد پر کافی دیر تک لیکچر بھی دیا لیکن اختؔر رضامند نہ ہوئے۔ اِس واقعہ کے بعد ہی اُنھوں نے یکے بعد دیگرے کئی رسالے نکالے جو بعض کرم فرماؤں کی مہربانی سے بند ہو گئے۔ ”رومان“ اُن کی آخری کوشش تھی جو اُنھوں نے صحافتی زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے کی لیکن اس کا جو انجام ہوا وہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

شراب اُن کی زندگی کی واحد اور بہت بڑی کمزوری تھی۔ اِسی خانہ خراب نے اُن کی مالی حالت تباہ کی۔ اسی نے اُن کی شاعری کا خاتمہ بھی کیا اور اب اُن کی زندگی کی شمع بھی گُل کر ڈالی۔

وہ رِندِ بلانوش تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کی رگوں میں خون کی بجائے شراب رواں تھی۔ اُن کی شراب نوشی کی کثرت کو دیکھ کر کئی بار ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے کسی بہت بڑے غم کو شراب کی گہرائیوں میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ غم سے کسی طرح دُوری نہیں ہوتی تو شراب کا قُرب بڑھتا جاتا ہے۔

۱۹۳۴ء میں جب میں پہلی بار اُن سے مل کر لوٹا تو میرے ایک عزیز دوست نے طنزاً کہا: ”مل آئے ہو شرابی سے۔“ یہ سُن کر مجھے بہت غصّہ آیا لیکن ضبط کر کے صرف اِتنا کہا: ”آپ لوگ ہر شاعر کو شرابی کہہ کر اُسے بدنام کرنے کے عادی ہیں۔ اختؔر شراب نوشی سے بہت بلند ہے۔“ لیکن یہ حقیقت پہلی ملاقات کے تین سال بعد منکشف ہوئی کہ اختؔر شراب نوشی سے بلند نہ تھے بلکہ اس میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ میں اِس عرصہ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ شراب کو چھوتے بھی نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اُنھوں نے متواتر تین سال تک اسے کیسے راز بنائے رکھا۔ ممکن ہے اگر ایک واقعہ پیش نہ آتا تو کم از کم میں ہی اُن کے

جاننے والوں میں ایک ایسا انسان ہوتا جسے لوگوں کی باتوں پر اعتبار نہ آتا اور اُنھیں شراب کی عادت سے مبرّا خیال کیسے رہتا۔

بات یوں ہوئی کہ ایک روز میں اُن کے ہاں بیٹھا تھا، وہ کرسی پر بیٹھے بائیں ہاتھ میں سگریٹ اور دائیں ہاتھ میں پینسل لیے فکرِ سخن میں مشغول تھے۔ اِدھر سگریٹ کا کش لگاتے تھے اور دھوئیں کے بادلوں میں چھت کو دیکھتے ہوئے زیرِلب کچھ بڑبڑاتے تھے اور ساتھ ساتھ بائیں پاؤں ہلاتے جارہے تھے۔ نظم لکھنے سے فارغ ہوئے تو کہا: ''ذرا اِس الماری کی کتابوں کو درست کر کے رکھ دو۔'' میں حکم کی تعمیل کو اُٹھا اور کتابوں کو ترتیب سے رکھنے میں مشغول ہوگیا۔ میں نے ایک کتاب جو اُٹھائی تو ایک بوتل سامنے آ گئی۔ اُٹھا کر دیکھا تو لکھا تھا: ''HAIG''۔ میں سخت حیران ہوا۔ میں نے کہا ''مولانا!'' اُنھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور میں نے بوتل سامنے کر دی۔ دیکھتے ہی بولے ''ارے یہ کیا؟'' ایک لمحہ کے بعد پھر بولے: ''خدا تعالیٰ بھی کیا کارساز ہے، میں جب بھی شراب ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہوں وہ شکستِ توبہ کے سامان پیدا کر ہی دیتا ہے۔ لاؤ اِدھر ذرا مِس گردن دراز بیگم کو۔۔۔!

اِس واقعہ کے بعد اُنھیں مجھ سے بھی پردا نہ رہا۔ وہ دراصل اُن لوگوں سے اِس راز کو چھپاتے تھے جنھیں نہیں چاہتے تھے کہ اِس عادتِ بد میں گرفتار ہوں۔ لیکن جب یہ باریک سا حجاب اُٹھ گیا تو بے دھڑک میرے سامنے بھی پینے لگے۔ لیکن ہمیشہ کہا کرتے تھے: ''من نہ کردم شما حذر بکنید''۔ اُن دِنوں اُنھیں والد کی طرف سے معقول رقم جیب خرچ کے طور پر ملتی تھی اور ساتھ ہی ''رومان'' بھی چل نکلا تھا اِس لیے اُن کی مالی حالت بہت اچھی تھی، چنانچہ مہنگی شراب پیتے تھے۔ مالی پریشانیاں بڑھیں تو سستی شراب پینے لگے لیکن اس کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی شراب کی بدولت والد صاحب سے تعلقات بے حد خراب ہو گئے اور اُنھوں نے ان سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ لیکن شراب اِس حد تک اُن کی زندگی کا جزو بن چکی تھی کہ اسے ترک کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

مَے نوشی کی اِس شِدّت نے گھر سے بے گھر کر دیا اور زندگی کے بہت سے دن دوستوں کی مہمانی پر کٹے۔ خود داری رخصت ہوئی اور دستِ سوال دراز ہونے لگا۔ شراب نوشی بڑھتی جارہی تھی اور اخترؔ

کو ہر روز یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ شراب کا انتظام کس دوست سے کرایا جائے۔ چنانچہ اب ان کے قدیم دوستوں نے بھی ان سے ملنا چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ یہ "یوسفِ بے کارواں" ہوتا گیا۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر عاشق بٹالوی اور بعض دیگر دوستوں نے والد کے ساتھ مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن والد نے صرف اس شرط پر صلح کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اختر شراب پینی چھوڑ دیں۔ یہ ایک ایسی شرط تھی کہ اخترؔ اِسے ماننے پر تیار نہ تھے، چنانچہ صلح نہ ہو سکی اور پھر حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ لاہور کے شراب خانے اور گلی کوچے اُنھیں زیادہ سے زیادہ بُری حالت میں دیکھنے لگے۔

جو شراب پہلے کبھی شاید حصولِ نشاط و بے خودی کے لیے پی جاتی تھی وہ اب اِس لیے پی جانے لگی کہ اب زندگی کے علایق سے رستگاری ملنے اور موت سے ہم آغوش ہونے کی تمنا ہر چیز پر غالب تھی۔

اس دَور کی شراب نوشی میں اُنھیں سخت اذیّت محسوس ہوتی تھی، کیوں کہ شراب پیتے ہی اُنھیں نہ جانے کیا ہو جاتا تھا کہ تکیہ پسلی کے نیچے رکھ کر جسم کا سارا بوجھ تکیہ پر ڈال دیتے تھے۔ درد سے چیختے تھے، چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ اِدھر یہ حالت ہوتی اُدھر وہ ساتھ ساتھ گلاس پر گلاس خالی کرتے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ اُن کے بچے اُن سے ملنے کے لیے آ گئے۔ اُن کے آنے کی خبر سُنتے ہی وہ آنسو پونچھ ڈالتے تھے اور اِس طرح بیٹھ جاتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جب تک وہ موجود رہتے اُن کے ساتھ ہنس ہنس کر پیار محبت کی باتیں کرتے لیکن جونہی بچے چلے جاتے وہی تکیہ، وہی آنسو اور وہی شراب ۔۔۔!

اب اخترؔ کی شاعری میں بہت زوال آ چکا تھا۔ نہ تو پہلی سی شادابی رہی تھی نہ زبان پر قدرت، تشبیہات اور استعارات بھی اب جیسے روٹھ گئے تھے۔ سب جانتے تھے کہ یہ سب دخترِ رز کی محبت کا فیض ہے۔ اِس لیے عشق نے اخترؔ کو بالکل نکمّا کر دیا۔ اختر کو خود بھی اِس کا احساس تھا۔ اس آٹھ دس سال کے عرصہ میں اُنھوں نے ایک نظم "اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا" لکھی جس میں اخترؔ مرحوم کی شاعری کا زور اور دیگر خوبیاں موجود تھیں۔ اِس نظم نے اُن کے مداحوں کے دلوں میں امید کی چمک پھر پیدا کر دی۔ وہ سوچنے لگے کہ شاید یہ ڈوبا ہوا ستارہ پھر اُبھر آئے اور فضاؤں کو اپنی تابانی سے جگمگا دے۔ آنے والے وقت نے مدّاحوں

کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ امیدیں حسرتیں بن کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ اُنھیں تو شراب سے فرصت ہی نہ تھی شعر کب کہتے۔

پاکستان کے قیام کے بعد لاہور میں آ کر تو اُن کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ والد کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ٹونک چلے گئے تو کسی کو امید نہ تھی کہ اب وہ واپس لاہور آئیں گے لیکن لاہور کی کشش اُنھیں کھینچ لائی۔ شاید اِس لیے کہ اُن کی قسمت میں اِسی خاک میں دفن ہونا لکھا تھا جس سے اُنھیں بے حد محبت تھی۔

۱۹۳۵ء کی ایک شام کا ذکر ہے کہ میں مرحوم کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ حسبِ دستور سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

''مولانا! آپ کی عمر کیا ہو گی؟''

اُنھوں نے کہا: ''یہی کوئی تیس بتیس برس۔''

نہ جانے میرا ذہن اچانک جوانا مرگ کیٹس کی طرف کیوں چلا گیا، میں سوچنے لگا: ''کیا اختر اُردو زبان کا کیٹس نہیں ہے۔ کہیں موت کا ظالم ہاتھ جوانی میں ہی اسے ہم سے نہ چھین لے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس نے کیٹس کو اُس کے شیدائیوں سے چھینا تھا۔'' میں نے بڑی مشکل سے اِس خیال کو ذہن سے نکالا اور اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہا کہ مجھے بھی کیسے خیالات آ رہے ہیں۔ لیکن بعد میں جو واقعات رونما ہوئے اور جس انداز سے اختؔر کی زندگی کا المیہ شروع ہوا اور جس طرح اختر کی شاعری زوال پذیر ہوئی، اس سے بار بار دل میں یہی خیال قوت پکڑتا گیا کہ اختؔر کو جوانی میں مر جانا چاہیے تھا۔

(''ماہِ نَو''، جنوری 1949ء)

❁❁❁❁❁❁

رئیس احمد جعفری

اختر شیرانی

”عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں“

بہت بڑے باپ کے بیٹے ہیں اور خود بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے والد ماجد پروفیسر محمود شیرانی کے علم و فضل کے سامنے فضلائے روزگار سرنگوں ہیں۔ ان کی مست اور البیلی شاعری نے اہلِ دنیا کو متوالا بنا رکھا ہے، خود بھی متوالے ہیں، خواہ پیئے ہوں یا بغیر پیئے ہوئے۔

ایک زمانہ تھا کہ نوجوان اخترؔ شیرانی کی شاعری، فضائے ہند میں ایک تہلکہ مچائے ہوئے تھی۔ کالج کے لڑکے اُن کے اشعار پڑھتے تھے اور رندوں کی طرح جھومنے لگتے تھے۔ کالج کی لڑکیاں اُن کے اشعار پڑھتی تھیں اور نسیمِ بہار کی طرح خود اٹکھیلیوں پر مائل ہو جاتی تھیں۔ اُن کی یاد زرکار ساریوں کے دامن سے بندھی رہتی تھی اور دھڑکتے ہوئے دِلوں کو اور زیادہ دھڑکا دیتی تھی۔ اُن کی مشہور نظم ”اے عشق کہیں لے چل“ جب ”نگار“ میں شائع ہوئی تو جس نوجوان نے پڑھا، وہ اُسی کو گنگنانے لگا۔ اپنے وقت میں اخترؔ عاشقوں اور دل گرفتوں کا امام تھا۔ لوگ اُس کے اشعار سے فال دیکھا کرتے تھے، پھر کوچۂ محبوب کا رُخ کرتے تھے۔

اخترؔ پہلا شاعر ہے جس نے معشوق کے سبزۂ خط کو چھوڑ کر کاکلِ مشکیں کی طرف توجہ کی، جس نے آدم کے بیٹوں سے مُنہ موڑ کر حوّا کی بیٹیوں کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ اخترؔ کی ”سلمیٰ“ حقیقی ہو یا ”ضرورتِ شعری“ کی پیداوار، لیکن اِس میں کوئی شُبہ نہیں، وہ پھلی پھولی اور اس رنگِ شاعری نے یکسر شاعری کی فضا بدل دی۔

اختر شیرانی نثر بھی لکھتے ہیں، مضامین و مقالات بھی، افسانے اور قصّے بھی۔ نثر میں بھی وہ اپنی

انفرادیت رکھتے ہیں، لیکن شاعری کی بات ہی اور ہے۔ اُن کی شاعری دل کی شاعری ہے۔ وہ دل جو کبھی امراءالقیس کے سینہ میں دھڑکا کرتا تھا، جس نے حافظ کے سینہ کو اپنا نشیمن بنایا تھا۔ اور یہ دل شراب کی ایک بوتل کے سوا کچھ نہیں ہے، وہی مستی، وہی ترنگ، وہی اُمنگ، وہی جوش۔۔۔۔۔

مجھے اُن سے دو تین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ہر بار میں ایک نیا نقش لے کر اُٹھا ہوں، اُن کے پاس سے۔ اِس اپنائیت، بے تکلفی، خلوص اور محبت سے ملتے ہیں، معلوم ہوتا ہے برسوں کی ملاقات ہے، مُدّت کی شناسائی ہے۔

جنگ کے دوران میں طاہر خاں صاحب نے ایک ''جنگی مشاعرہ'' کیا۔ اِس مشاعرہ میں اختر بھی شریک ہوئے۔ یہ شاہ جہاں محل ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں ایک دوست سے ملنے وہاں پہنچا۔ اِن کے کمرہ کے بعد اُن کا کمرہ تھا۔ میں نے انھیں دیکھا اور یہ سوچ کر آگے بڑھ گیا، انھیں کیا یاد میں کون ہوں؟ فوراً پیچھے پیچھے آئے، ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرہ میں لے گئے اور بڑی دیر تک بٹھائے رکھا اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

اخترؔ اب بھی جوان ہیں، ان کی شاعری بھی جوان ہے لیکن وہ خود بڑھاپے کی طرف لپک رہے ہیں۔ اِس لیے نہیں کہ ان کی شاعری کا رس ختم ہو گیا ہے۔ وہ تو اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دل وہی ہے، جذبات وہی ہیں، زورِ کلام اور دل آویزیِ بیان وہی ہے، لیکن گراں باریوں نے حالت بدل دی ہے۔ یہ وہ شاعر تھا جو اپنی شاعری کی آگ سے ہر دل کی انگیٹھی گرم کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی شاعری حوادث کی نذر ہو کر رہ گئی ہے اور یہ آگ سے برف بن گیا ہے۔ لیکن اِس برف کے نیچے شعلے دہک رہے ہیں۔ کیا جانے کب برف پگھل جائے ان شعلوں سے اور شعلے پھر خرمن سوز بن جائیں۔

(''دید و شنید'')

☆☆☆☆☆☆

حزیں کاشمیری

اختر شیرانی

اختر شیرانی کو پہلی بار میں نے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں دیکھا۔ یہ سن 1946ء کی بات ہے۔کالج والوں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں وہ کون صاحب تھے جنھوں نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ بہرکیف محفلِ مشاعرہ جب ڈیڑھ دو گھنٹہ کے بعد رنگ پر آنے لگی تو ہال سے ایک شور اُٹھا کہ اخترؔ شیرانی تشریف لا رہے ہیں۔سب لوگ منتظر بیٹھے تھے کہ ان کے کلام سے محظوظ ہوں۔اُن دِنوں عوام النّاس میں اخترؔ مرحوم کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔اُن کی اپنی طرز کی رومانوی شاعری، اُردو شاعری میں نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی۔وہ حقیقتاً شاعرِ شباب تھے۔مدّاحوں کے ایک بہت بڑے ادبی حلقہ کے علاوہ کالج کے لڑکے اُن کے شیدائی اور لڑکیاں اُن کے کلام پر جان چھڑکتی تھیں۔جب آپ کالج کے ہال کے ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اہلِ محفل نے دیکھا کہ آپ شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے سٹیج کی جانب بڑھ رہے ہیں۔اُن کی حالت یقیناً ایسی نہ تھی کہ وہ صدر کے قریب کھڑے ہو کر حاضرینِ محفل کو اپنے کلام سے نوازتے۔لہٰذا بہتر یہی سمجھا گیا کہ انھیں سمجھا بجھا کر ہال سے باہر ہی باہر رخصت کر دیا جائے مگر آپ مُصر تھے کہ اپنا کلام ضرور سُنائیں گے۔اُس وقت اُن کی زبان سے نکلتا ہوا ہر جملہ ٹوٹا ہوا، بے ربط اور مضحکہ خیز تھا۔آخر بڑی مشکل کے بعد اُنھیں محفلِ مشاعرہ میں شرکت سے روک دیا گیا۔آپ اکثر شراب کے نشے میں مدہوش رہتے تھے اور کثرتِ شراب نوشی ہی اُن کی موت کا سبب بنی۔ جب کبھی شراب کے لیے جیب میں پیسہ نہ ہوتا تو بلاتکلّف کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں سے اپنا تعارف کرا کے اُن سے رقم لے لیتے۔اختر شیرانی سے میری پہلی ملاقات شیخ مبارک علی تاجر کتب کی دکان پر ہوئی۔ یہ سن 1947ء کے اوائل کی بات ہے۔میں دکان پر بیٹھا حساب کتاب کے کسی معاملہ میں مصروف تھا کہ

ایک تانگہ عین دکان کے سامنے آ کر رکا۔ میں سمجھا کوئی صاحب کتابیں خریدنے کے لیے تشریف لائے ہیں، مگر جونہی وہ صاحب تانگے سے باہر آئے تو معلوم ہوا اختر شیرانی ہیں۔ میں فوراً پہچان گیا اور کرسی سے اُٹھ کر اُن کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا۔ آپ اندر تشریف لائے اور لا اُبالی انداز میں کرسی پر بیٹھ کر فرمانے لگے:

''دیوانِ حسرت مل جائے گا؟''

میں نے کہا: ''حضور! اس کا کون سا حصّہ درکار ہے؟''

کہنے لگے: ''حصّہ وِصّہ کیا چیز ہے؟ مجھے مکمل دیوان درکار ہے۔''

میں نے کہا: ''خوب۔''

میں نہیں کہہ سکتا کہ کن وجوہات کی بنا پر اُنھوں نے پھر فرمایا: ''جانتے ہو یہ شعر کس کا ہے؟'' مجھے اِس جملہ پر تعجّب بھی ہوا اور دل میں خوشی بھی کہ مجھ جیسے ہیچمدان کو اِس قابل سمجھا گیا کہ یہ بتاؤں کہ یہ شعر کس کا ہے؟ بہرکیف میں نے جواب دیا: ''فرمائیے'' آپ نے کہا:

دِلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

میں نے کہا: ''حسرت موہانی کا۔'' میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ آپ کرسی سے اچھل پڑے اور مجھ سے بار بار اِس کی توثیق کراتے رہے۔ میں نے کہا: ''حضور! آپ گھبرائیے نہیں، میں ابھی مولانا کا دیوان آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔'' چنانچہ میں نے یہ شعر متعلقہ دیوان سے ڈھونڈ کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ اب تو آپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگے: ''میں نے اِس شعر پر سو روپے جیت لیے ہیں۔ ایک صاحب بضد تھے کہ یہ شعر مولانا کا نہیں، ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ہے مگر افسوس اِس انعام میں تمھیں شریک نہیں کر سکتا کہ میرے پاس میری مخصوص ضرورت کے بعد تانگے کا کرایہ دینا بھی مشکل ہو گا۔'' میں نے کہا: ''حضور! کیا یہ میرے لیے باعثِ فخر نہیں کہ آپ نے مجھے اِس قابل سمجھا کہ مجھ سا کم علم بھی آپ کا مسئلہ حل کر سکتا تھا۔'' اِس پر آپ مسکرائے اور وہ دیوان لے کر اُسی تانگہ پر واپس چلے گئے۔ پھر تین چار ماہ

بعد دوبارہ دکان پر تشریف لائے۔ میرے اُستاد شیخ مبارک کے بارے میں دریافت کر کے کرسی پر بیٹھ گئے اور نئی مطبوعات کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے دو چار کتابیں اُن کے سامنے رکھ دیں جنھیں محض وقت گزارنے کے لیے دیکھتے رہے۔ پھر دفعتاً میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ میں اُن کی نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکا مگر یہ عُقدہ اگلے ہی لمحے کھل گیا جب آپ زیرِ دامن چھپی ہوئی شراب کی بوتل، جس پر سوڈے کی عام بوتلوں کی وضع کا ڈھکنا پیوست تھا، دانتوں سے کھولنے لگے۔ کافی کوشش کے باوجود وہ آپ سے نہ کھل سکا۔ میں نے ایک طرف اُن کی ناکامی اور دوسری طرف شراب کے لیے بڑھتی ہوئی بے تابی کو بھانپ کر دفعتاً بوتل اُن کے ہاتھ سے لے لی اور دانتوں میں ڈھکنا جکڑ کر آنِ واحد میں اُسے بوتل سے الگ کر دیا۔ اب کھلی بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی مگر وہ اِضطراب اور بے چینی غائب تھی۔ میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہنے لگے:

''یہ تم نے کیا کیا؟ ایک تو بوتل میرے ہاتھ سے چھین لی، پھر اسے دانتوں سے کھول دیا۔ اِس خبیث شے کو شُرَفا ہاتھ نہیں لگاتے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسی بوتل کو چھوؤ گے بھی نہیں۔'' مجھے اُن کے کرب کا احساس ہوا اور میں محسوس کرنے لگا کہ واقعتاً مجھے ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ مرحوم جس انداز میں تلقین کر رہے تھے اُس میں سچائی اور نیت کا خلوص شامل تھا۔ اس وقت مرحوم مجھے اپنے والد حافظ محمود خان شیرانی کے روپ میں دِکھائی دیے۔ میں نے بزرگوں سے سُنا تھا کہ حافظ صاحب اِس معاملہ میں ان سے سخت نالاں تھے۔ یہاں تک کہ ان کے کھانے پینے کے برتن الگ کر دیے تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ حافظ صاحب بھی ان کی شاعری کے معترف تھے۔ جب انھوں نے میٹریکولیشن کے لیے پنجاب یونیورسٹی کی کتاب ''سرمایۂ اُردو'' تالیف کی تو اُس میں اخترؔ شیرانی کی نظم بھی شامل کی۔ اکثر نقادانِ شعر و ادب نے اُنھیں رومانوی شاعروں کی صف میں لا کر ''شاعرِ شباب'' کا لقب دیا ہے اور کہا کہ وہ فقط نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ یہ درست ہے مگر میں اِس میں اس قدر اِضافہ کرنا چاہوں گا کہ وہ جس نوع کے بھی شاعر ہیں اوّل و آخر شاعر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی معروف اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچے ہوئے شعراء حضرات بھی در اصل شاعر نہیں ہوتے۔ اختر شیرانی ایک سچے شاعر تھے۔ مرحوم کے لاہور کے ایک مشہور و معروف طبیب حکیم

نیّر واسطی سے نہایت گہرے تعلقات تھے۔ حکیم صاحب نے آپ کی بہت خدمت کی اور ان کی زندگی کی، جو اکثر و بیشتر آلودہ مے رہی، دیکھ بھال کرتے رہے۔ آخر یہی مَے نوشی جان لیوا ثابت ہوئی۔ پاکستان بننے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد نہایت کسمپرسی کی حالت میں 9 ستمبر، 1948ء کو انتقال کر گئے۔

نمونہ کلام

آرزوِ وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم عزیزوں کا، حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں دِکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

اُن کی خوش بُو ہے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رلاتے ہیں ہمیں یاد آ کر
اے وطن تیرے گُل و سُنبل و ریحاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گُل ولالہ مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کِھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شِکوے سُن سُن کے وہ ہوتے ہیں پریشاں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیٔ شوق
شوق انگیز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گُل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اختر
اُن کی اُلفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

تمناؤں کو زندہ، آرزوؤں کو جواں کرلوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کرلوں

بہار آئی ہے، بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کرلوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کرلوں

کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی — ٹھہر جا اے جوانی! ماتمِ عمرِ رواں کرلوں
چمن میں ہیں بہم پروانہ وشمع ،گُل وبلبل — اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کرلوں
کسے معلوم کب ،کس وقت کس پر گر پڑے بجلی — ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کرلوں
برآئیں حسرتیں کیا کیا اگر موت اتنی فرصت دے — کہ اِک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کرلوں
مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اختؔر — تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کرلوں

اے عشق کہیں لے چل!

اے عشق کہیں لے چل ، اِس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے ،لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے ، اِس نفس پرستی سے

دور ـــ اور کہیں لے چل!
اے عشق ، کہیں لے چل!

اِک مذبح جذبات وافکار ہے یہ دنیا!
اِک مسکن اشرار و آزار ہے یہ دنیا!
اِک مقتل احرار و ابرار ہے یہ دنیا!

دور اِس سے کہیں لے چل!
اے عشق ، کہیں لے چل!

اے عشق ہمیں لے چل ، اِک نور کی وادی میں
اِک خواب کی دنیا میں ، اِک طور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تا خُلدِ بریں لے چل!
اے ، عشق کہیں لے چل!

ایک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں

تو ، خوف نہیں ، لے چل!
اے عشق ، کہیں لے چل

اِک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تُو وہیں لے چل!
اے عشق ، کہیں لے چل!

ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے!

تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے!
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے!
روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے!
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے!
بہشتِ حُسن کی تازہ کلی کے دھوکے میں
کلی نے بھی تمھیں دیوانہ وار دیکھا ہے!
کبھی جو اُٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لیے
تو آئینے نے تمھیں ہم کنار دیکھا ہے!

عروسِ برق نے اپنا نقاب اُلٹ کے تمھیں
غریق مستیٔ ابرِ بہار دیکھا ہے!
نسیمِ باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی
تمھیں بہ گل کدۂ شالا مار دیکھا ہے!
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو
ہزار بار نہیں، لاکھ بار دیکھا ہے!
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے
کہ اِس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے!
دِکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو!
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو!

اعترافِ محبت

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے شکایت کرتا ہوں!
دامانِ زبانِ خامُشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں!
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

مُدّت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا
راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا، پر تم سے کہتے ڈرتا تھا!
آج اِس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

حسرت بھری فریادوں کو مری باغوں کی فضائیں جانتی ہیں
فریاد سے لبریز آہوں کو صحرا کی ہوائیں جانتی ہیں
اور میرے مچلتے آنسوؤں کو ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں
اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

جس دن سے وہ صورت دیکھی ہے سو آرزوئیں بیتاب سی ہیں
دن ہیں تو وہ بے آرام سے ہیں، راتیں ہیں تو وہ بے خواب سی ہیں
آنکھوں تلے ہر دم پھرتی ہیں وہ "ساعدیں" جو مہتاب سی ہیں

یاد، اُن کی صباحت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو، زہرہ کی قسم، تاروں کی قسم!
تم پھولوں سے بڑھ کر رنگیں ہو، فطرت کے چمن زاروں کی قسم!
تم سب سے حسیں ہو، دنیا کی، دنیا کے نظّاروں کی قسم!

دنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

گو تم سے مجھے نسبت نہیں کچھ، اور ہے تو گدا وشاہ کی ہے!
وہ ذرہ ہوں جس کے دل میں نہاں امید، وصالِ ماہ کی ہے!
اِک شاعرِ مفلس جس کو ہوس اِک قیصرۂ ذی جاہ کی ہے!

پھر بھی یہ جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

گر حکم دو روشن تاروں کو مَیں لا کے جھکا دوں قدموں پر
جنت کے شگفتہ پھولوں کی جنت سی بسا دوں قدموں پر
سجدہ گہِ مہر و ماہ کو بھی سجدے میں گرا دوں قدموں پر

ناچیز ہوں، ہمت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

❁❁❁❁❁ (کہاں گئے وہ لوگ)

سعادت حسن منٹو

اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں

خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ حافظہ اِس قدر کمزور ہے کہ نام، سن اور تاریخ کبھی یاد نہیں رہتے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمٰن صاحب نے ایک روزانہ پرچہ ''مساوات'' جاری کیا۔ اس کی ادارت کے لیے باری علیگ (مرحوم) اور ابو العلاء چشتی الصحافی (حاجی لق لق) بلائے گئے۔ اُن دِنوں میری آوارہ گردی معراج پر تھی۔ بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے حد منتشر تھا۔ اُس وقت تو میں نے محسوس نہیں کیا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میرے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

جیجے کے ہوٹل (شیراز) میں قریب قریب ہر روز گپ بازی کی محفل جمتی تھی۔ بالا، انور پینٹر، عاشق فوٹو گرافر، فقیر حسین سلیس اور ایک صاحب جن کا نام میں بھول گیا ہوں، باقاعدگی کے ساتھ اِس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ ہر قسم کے موضوع زیرِ بحث لائے جاتے تھے۔ بالا بڑا خوش گو اور بذلہ سنج نوجوان تھا۔ اگر وہ غیر حاضر ہوتا تو محفل سونی رہتی۔ شعر بھی کہتا تھا۔ اُس کا ایک شعر ابھی تک مجھے یاد ہے:۔

اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چُبھ گئی ہے چھالے میں

جیجے سے لے کر انور پینٹر تک سب موسیقی اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ وہ صاحب جن کا نام میں بھول گیا تھا، وحید تھے۔ نیلی نیلی آنکھوں والے، لمبے تڑنگے، مضبوط جسم، آپ کا محبوب مشغلہ گوروں سے لڑنا تھا۔ چنانچہ کئی گورے ان کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے تھے اور طبلہ ماہر طبلچیوں کی طرح بجاتے تھے۔

اُن دِنوں جیجے کے ہوٹل میں ایک شاعر اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔قریب قریب ہر محفل میں اُس کے اشعار پڑھے یا گائے جاتے تھے۔جیجا(عزیز)عام طور پر ''میں اپنے عشق میں سب کچھ تباہ کرلوں گا''،بہت ممکن ہے کہ یہ مصرع غلط ہو، گایا کرتا تھا۔یہ نئے قسم کا جذبہ سب کے ذہن پر مسلّط ہو گیا تھا۔ معشوق کو جو دھمکی دی گئی تھی سب کو بہت پسند آئی تھی۔

جیجا تو اختر شیرانی کا دیوانہ تھا۔کاؤنٹر کے پاس کھڑا گاہک سے بل وصول کر رہا ہے اور گنگنا رہا ہے''اے عشق کہیں لے چل''۔۔۔۔۔مسافروں کو کمرے دکھا رہا ہے اور زیرِلب گا رہا ہے:''کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات۔''

عاشق فوٹو گرافر کی آواز بہت پتلی تھی،لیکن وہ ''اے عشق کہیں لے چل'' بڑے سوز سے گایا کرتا تھا۔میں نے جب بھی اُس کے منہ سے یہ نظم سُنی مجھ پر بڑا اثر ہوا۔اُس زمانے میں چونکہ طبیعت میں انتشار تھا اِس لیے یہ نظم مجھے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر دور۔۔۔۔۔بہت دور اَن دیکھے جزیروں میں لے جاتی تھی۔

اِتنا زمانہ بیت چکا ہے مگر وہ کیفیت جو اُس وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی،میں اب بھی محسوس کر سکتا ہوں۔عجیب وغریب کیفیت تھی۔جیجے کے ہوٹل کے بہت اندر اندھیری مگر ٹھنڈی کوٹھڑی میں بیٹھا میں یوں محسوس کرتا،کشتی میں بیٹھا ہوں۔پریاں اسے کھے رہی ہیں۔نازک پروں والی پریاں۔رات کا وقت ہے اِس لیے مجھے ان پریوں کا صرف سایا سا نظر آتا ہے۔سمندر پُرسکون ہے۔کشتی ہلکورے کھائے بغیر چل رہی ہے،کسی نامعلوم منزل کی طرف۔پاپوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ہم دنیوی شوروغل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں۔

جیجے کے ہوٹل میں کچھ عرصے کے بعد باری صاحب اور چشتی صاحب کا بھی آنا جانا شروع ہوگیا۔ دونوں کھانا کھاتے یا چائے پیتے اور چلے جاتے۔مگر جب جیجے کو معلوم ہوا کہ وہ اخباری آدمی ہیں تو فوراً اُن سے بے تکلّف مراسم پیدا کر لیے۔

باری صاحب اختر شیرانی کے کلام سے واقف تھے لیکن ذاتی طور پر شاعر کو نہ جانتے تھے۔چشتی

صاحب ایک مُدّت کے بعد بغداد اور مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد تازہ تازہ واپس آئے تھے،اس لیے وہ یہاں کے شعراء کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔پھر بھی اُنھوں نے جیجے سے اختر شیرانی کا کلام سُنا تو بہت متأثر ہوئے۔

اِس دوران مَیں باری صاحب کے ساتھ گُھل مِل گیا۔اُن کی سنجیدگی اور متانت بھری ظرافت مجھے بہت پسند آئی۔میرے ذہنی انتشار کو بھانپ کر اُنھوں نے مجھے صحافت کی طرف مائل کیا۔آہستہ آہستہ ادب سے روشناس کرایا۔

پہلے میں تیرتھ رام فیروز پوری کے ناول پڑھا کرتا تھا۔اب باری صاحب کی وجہ سے آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیوگو میرے زیرِ مطالعہ رہنے لگے۔ہیوگو مجھے بہت پسند آیا۔بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس فرانسیسی مصنف کا خطیبانہ انداز باری صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔آج کل میں جو کچھ بھی ہوں اُس کو بنانے میں پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً مَیں کسی اور راستے پر گامزن ہوتا۔

چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے روشناس ہو چکا تھا،اِس لیے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔اُس کی شاعری ہلکی پھلکی اور رومانی تھی۔میں اب غور کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لڑکوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر،جن کے دل و دماغ پر ہر وقت رومان کی مکڑی مہین مہین جالے تنتی رہتی ہے۔مجھے اِس وادی میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک دوست سے معلوم ہوا،اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور شیراز ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔اُسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ جیجے کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔

شام کو پہنچا تو ہوٹل کے باورچی نے کہا کہ سب اُوپر کوٹھے پر بیٹھے ہیں۔دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اُوپر گیا۔چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔کچھ کرسیاں بھی تھیں۔دیسی شراب کا دَور چل رہا تھا۔دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔صرف ایک صورت اجنبی تھی وہ اختر

شیرانی کی تھی۔ چپٹا چہرہ، سپاٹ پیشانی، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ، چھدرے بال، آنکھیں بڑی بڑی اور پُرکشش، ان میں تھوڑی سی اُداسی بھی تھی۔ بڑی شُستہ و رفتہ اُردو میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔

مَیں پاس پہنچا تو بالے نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب جیجے سے مخاطب ہوئے: ''عزیز (میری طرف اشارہ کرکے) ان کے لیے گلاس منگواؤ۔''

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا جو میں نے شکریے کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ اِس پر اُنھوں نے کہا ''نہیں بھائی میں کچھ نہیں سُناؤں گا۔ میں سُنوں گا۔'' پھر جیجے سے مخاطب ہوئے: ''عزیز! سُناؤ۔ رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آ۔'' یہ کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا جیسے بیتے ہوئے لمحات یاد آگئے ہوں۔ جیجے کو انکار نہیں تھا۔ گلا صاف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل گانا شروع کردی۔ سُر تال سب ٹھیک مگر آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پیتے رہے اور جھومتے رہے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت میں شیراز ہوٹل میں بیٹھا اختر صاحب کا انتظار کررہا تھا (وہ کسی دعوت پر گئے تھے) کہ ایک بُرقعہ پوش خاتون ٹانگے پر آئی۔ آپ نے ایک دم سے اختر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا ''کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔ آپ اپنا نام بتا دیجیے۔'' برقعہ پوش خاتون نے اپنا نام نہ بتایا اور چلی گئی۔

اختر صاحب آئے تو میں نے اُس خاتون کی آمد کا ذکر کیا۔ آپ نے بڑی شاعرانہ دلچسپی سے ساری بات سُنی اور مسکرا دیے۔ یوں وہ خاتون ایک اسرار سا بن گئی۔ کھانا کھانے سے پہلے شام کو جب ٹھرّے کا دور شروع ہوا تو جیجے نے اُس برقعہ پوش خاتون کے متعلق اختر صاحب سے پوچھا۔ ''حضرت وہ کون تھیں جو آج دوپہر کو تشریف لائی تھیں؟''

اختر صاحب مسکرائے اور جواب گول کر گئے۔ بالے نے اُن سے کہا ''کہیں سلمیٰ صاحبہ تو

نہیں تھیں؟''

اختر صاحب نے ہولے سے بالے کے گال پر طمانچہ مارا اور صرف اِتنا کہا ''شریر۔۔۔'' بات اور بھی زیادہ پُراسرار ہوگئی جو آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ معلوم نہیں وہ بُرقعہ پوش خاتون کون تھیں۔ اُس زمانے میں صرف اِتنا معلوم ہوا تھا کہ اختر صاحب کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیراز ہوٹل آئی تھی اور اختر صاحب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہیں۔

سب باری باری اختر صاحب کی دعوت کر چکے تھے۔ وہیں شیراز ہوٹل میں دعوت دینے کا طریقہ یہ تھا کہ دن اور رات میں ٹھرّے کی جتنی بوتلیں ختم ہوں، اُن کے دام ادا کر دیے جائیں۔ میں نے یہ طریقہ بھونڈا سمجھا اور دو بوتلیں اسکاچ وِسکی کی لے کر ایک شام وہاں پہنچا۔ ایک بوتل پر سے کاغذ ہٹایا تو اختر صاحب نے کہا ''بھائی! یہ تم نے کیا کیا؟ دیسی شراب ٹھیک رہتی۔ ایک کے بدلے دو آجاتیں۔''

میں نے عرض کیا ''اختر صاحب! ایک ختم ہو جائے تو دوسری موجود ہے۔''

اختر صاحب مسکرائے ''وہ ختم ہوگئی تو؟''

میں نے کہا ''اور آجائے گی۔''

آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''زندہ رہو۔''

دونوں بوتلیں ختم ہوگئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب اسکاچ سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ امرتسر ڈسٹلری کے کشید کردہ ٹھرّے کی ایک بوتل منگوائی۔ اس نے اختر صاحب کے نشے میں جو خالی جگہیں تھیں، پُر کر دیں۔

چونکہ یہ محفلیں خالص ادبی نہیں تھیں اور ان کے پیچھے صرف وہ عقیدت تھی جو اُن لوگوں کو اختر صاحب سے تھی، اِس لیے زیادہ تر اُن ہی کا کلام پڑھا اور گایا جاتا۔ شعر و سخن کے متعلق کوئی بصیرت افروز بات نہ ہوتی، لیکن اختر صاحب کی گفتگوؤں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُردو شاعری پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔

چند روز کے بعد میں نے گھر پر اختر صاحب کی دعوت کی۔ مگر یہ صرف چائے کی تھی، جس سے

اختر صاحب جیسے بلانوش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن اُنھوں نے قبول کی اور میری خاطر ایک پیالی چائے بھی پی۔

اِن محفلوں میں باری صاحب بہت کم شریک ہوئے۔ البتہ چشتی صاحب جو پینے کے معاملے میں اختر صاحب سے بھی چند پیگ آگے ہی تھے، اکثر ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی سُناتے جو عام طور پر بے روح ہوتا تھا۔

اختر صاحب غالباً دس دن امرتسر میں رہے۔ اِس دوران میں جیجے کے پیہم اسرار پر آپ نے شیراز ہوٹل پر ایک نظم کہی۔ جیجے نے اسے باری صاحب کی وساطت سے بڑے کاغذ پر خوش خط لکھوایا اور فریم میں جڑوا کر اپنے ہوٹل کی زینت بنایا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ نظم میں اُس کا نام موجود تھا۔

اختر صاحب چلے گئے تو جیجے کے ہوٹل کی رونق غائب ہوگئی۔ باری صاحب نے اب میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ میرا شراب پینا اُن کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خشک واعظ نہیں تھے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کئی دفعہ مجھے اِس علّت سے باز رہنے کے لیے کہا، مگر میں باز نہ آیا۔

باری صاحب تین مہینے امرتسر میں رہے۔ اِس دوران میں اُنھوں نے مجھ سے وکٹر ہیوگو کی کتاب ''سرگزشتِ اسیر'' کے نام سے ترجمہ کرائی۔ جب وہ چھپ کر پریس سے آئی تو آپ لاہور میں تھے۔ میں نے طبع شدہ کتاب دیکھی تو اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اور ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے آسکر وائلڈ کے اشتراکی ڈرامے ''ویرا'' کا ترجمہ شروع کر دیا۔ جب ختم ہوا تو باری صاحب کو اصلاح کے لیے دیا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ میری تحریروں میں بہت ہی کم کانٹ چھانٹ کرتے تھے۔ زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی، چنانچہ میں نے سوچا کہ باری صاحب کے بعد اختر صاحب کو ترجمے کا مسوّدہ دکھاؤں گا۔

عرب ہوٹل میں آنے جانے سے مظفّر حسین شمیم صاحب سے اچھے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے اُن سے اِصلاح کی بات کی تو وہ مجھے اُسی وقت اختر شیرانی کے پاس لے گئے۔ چھوٹا سا غلیظ کمرہ تھا۔ آپ چارپائی پر تکیہ سینے کے ساتھ دبائے بیٹھے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اختر صاحب مجھے پہچان

گئے ۔ ۔ ۔ یارانِ شیراز ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے اُن کو بتا دیا۔

شمیم صاحب اور اختر صاحب کی گفتگو بہت پُرتصنّع اور پُرتکلّف تھی حالانکہ مجھ سے کسی شخص نے کہا تھا کہ وہ دونوں کسی زمانے میں ایک جان دو قالب تھے۔ بہرحال شمیم صاحب نے میرے آنے کا مُدّعا بیان کیا۔ اختر صاحب نے کہا: ''میں حاضر ہوں۔ آج رات ہی سارا مسوّدہ دیکھ لوں گا۔''

اختر صاحب نے سینے کے ساتھ تکیہ اِس لیے دبایا ہوا تھا کہ اُن کے جگر میں تھوڑے وقفے کے بعد ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ اُس زمانے میں ہی اُن کا جگر قریب قریب ماؤف ہو چکا تھا۔ میں نے اُن سے رخصت لی اور شام کو حاضر ہونے کا کہہ کر شمیم صاحب کے ساتھ واپس عرب ہوٹل چلا آیا۔ اُنھوں نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ اگر تم اختر سے اپنا کام جلدی کرانا چاہتے ہو تو ساتھ ''وہ چیز'' لیتے جانا۔

میں جب شام کو اختر صاحب کے پاس پہنچا تو ''وہ چیز'' میرے پاس موجود تھی جو میں نے بڑے سلیقے سے پیش کی۔ بوتل ڈرتے ڈرتے باہر نکالی اور اُن سے کہا: ''کیا یہاں اِس کی اجازت ہے؟ معاف کیجیے گا، یہ پوچھنا ہی بڑی بدتمیزی ہے۔''

اختر صاحب کی آنکھیں تمتما اُٹھیں۔ میرا خیال ہے وہ صبح کے پیاسے تھے۔ مسکرائے اور میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ''شراب پینا کوئی بدتمیزی نہیں۔'' یہ کہہ کر بوتل میرے ہاتھ سے لی اور تکیہ فرش پر رکھ کر اس پر بوتل کا نچلا حصّہ ٹھونکنا شروع کیا، تاکہ کارک باہر نکل آئے۔

میں اُن دِنوں پیتا تھا مگر یوں کہیے کہ زیادہ پی نہیں سکتا تھا۔ چار پیگ کافی تھے۔ مقدار اس سے اگر بڑھ جاتی تو طبیعت خراب ہو جاتی اور سارا لطف غارت ہو جاتا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور پیتے کافی دیر ہو گئی۔ اختر صاحب کا کھانا آیا اور جس طریقے سے آیا اس سے میں نے یہ جانا کہ اُن کے گھر والوں کے تعلقات اُن سے کشیدہ ہیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اُن کے والدِ مکرّم حافظ محمود شیرانی صاحب (مرحوم و مغفور) اُن کی شراب نوشی کے باعث بہت نالاں تھے۔ تھک ہار کر اُنھوں نے اختر صاحب کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رات زیادہ گزر گئی تو میں نے اختر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسوّدہ دیکھنا شروع کر

دیں۔آپ نے یہ درخواست قبول کی اور مسوّدے کی اِصلاح شروع کردی۔چند صفحات دیکھے تو آسکر وائلڈ کی رنگین زندگی کی باتیں شروع کردیں جو غالباً اُنھوں نے کسی اور سے سُنی تھیں۔آسکر وائلڈ اور لارڈ الفرڈ ڈگلس کے معاشقے کا ذکر آپ نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا۔وائلڈ کیسے قید ہوا، یہ بھی بتایا، کہ اُن کا ذہن ایک دم لارڈ بائرن کی طرف چلا گیا۔اس شاعر کی ادا انھیں پسند تھی۔اس کے معاشقے جو کہ لاتعداد تھے، اختر صاحب کی نگاہوں میں ایک جداگانہ شان رکھتے تھے۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ بائرن کے نام سے اُنھوں نے کئی غزلیں اور نظمیں بھی لکھی تھیں۔

لارڈ بائرن ایک سنگ دل، بے رحم اور بے پروا انسان تھا۔اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑا نواب تھا، جس کے پاس دولت تھی۔اختر صاحب قلاش تھے۔بڑے رحم دل اور انسانیت دوست۔بائرن کو بڑھیا سے بڑھیا شراب میسّر تھی۔اختر کو بمشکل ٹھرّا ملتا تھا۔بائرن کے ملک کی فضا اور تھی، اختر کے ملک کی فضا اور۔وہ کسی صورت میں بھی لارڈ بائرن نہیں بن سکتے تھے، لیکن پھر بھی اُنھوں نے اپنے دل کی تسکین کے لیے دو معشوق اختراع کر لیے تھے۔سلمیٰ اور عذرا۔

سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ کوئی حقیقتاً سلمیٰ تھی۔ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو مگر جو سلمیٰ ہمیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیّلی ہے۔اس کا وجود اِس قدر شفاف ہے کہ صاف ایتھری معلوم ہوتا ہے۔ایک اور بات بھی ہے کہ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پوست کی زندہ عورت ہوتی تو شاعر اس سے اتنی والہانہ محبت کبھی نہ کرتا۔مگر چونکہ وہ اس کی اپنی تخلیق تھی، اِس لیے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

لارڈ بائرن کی باتیں سُنتے سُنتے مجھے نیند آگئی اور میں وہیں سو گیا۔صبح اُٹھا تو دیکھا اختر صاحب فرش پر بیٹھے مسوّدہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔بوتل میں تھوڑی سی بچی ہوئی شراب تھی۔یہ آپ نے پی اور آخری صفحات دیکھ کر مسوّدہ میرے حوالے کیا اور کہا ’’ترجمہ بہت اچھا ہے۔کہیں کہیں زبان کی اغلاط تھیں، وہ میں نے درست کر دی ہیں۔‘‘

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اُن کا شکریہ ادا کیا اور امرتسر روانہ ہوگیا۔اس کے بعد میں

جب کبھی لاہور جاتا اختر صاحب کے نیاز ضرور حاصل کرتا۔ ایک بار گیا تو دیکھا کہ آپ کے سر پر پٹیاں بندھی ہیں۔ اُن سے دریافت کیا تو اُنھوں نے جواب دیا ”مجھے تو قطعاً یاد نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کل رات میں نے تانگے میں سوار ہونے کی کوشش کی مگر گر پڑا اور چوٹیں اِس وجہ سے آئیں۔“

اختر صاحب کی اپنی ذات کے بارے میں یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ بعض اوقات وہ بالکل بچے بن جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو اور حرکات بالکل بچوں کی سی ہوتیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بچہ بن کر وہ بچگانہ قسم ہی کی مسرّت محسوس کرتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد میں بمبئی چلا گیا۔ اختر صاحب سے اِتنے مراسم نہیں تھے کہ خط وکتابت ہوتی لیکن جب اُنھوں نے رسالہ ”رومان“ جاری کیا تو میں نے اُنھیں مبارک باد کا خط لکھا۔ اب میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ترجمے کا دور وہیں لاہور اور امرتسر میں ختم ہو گیا تھا۔ میں نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے، جو مقبول ہوتے تھے۔ ”رومان“ میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ بمبئی کے ہفتہ وار ”مصوّر“ میں ”رومان“ پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس کی تعریف کی۔ احمد ندیم قاسمی کا محبت بھرا خط موصول ہوا جو ایک طویل سلسلۂ خط وکتابت کا پیش خیمہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ”رومان“ بند ہو گیا اور اختر میری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل ہو گئے۔ کئی برس گزر گئے۔ ملک کی سیاست نے کئی رنگ بدلے۔ حتیٰ کہ بٹوارہ آن پہنچا۔ اس سے پہلے جو ہلڑ مچا اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس دوران میں اخباروں میں خبر چھپی کہ اختر صاحب ٹونک سے پاکستان آرہے تھے کہ راستے میں بلوائیوں نے اُن کو شہید کر دیا۔ بہت افسوس ہوا۔ میں، عصمت اور شاہد لطیف دیر تک اُن کی باتیں کرتے اور افسوس کرتے رہے۔

کئی اخباروں میں اُن کی موت پر مضامین شائع ہوئے۔ اُن کی پرانی نظمیں چھپیں، لیکن کچھ عرصے کے بعد اُن کی موت کی خبر کی تردید ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ بخیر وعافیت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بمبئی کے ادبی حلقے کو بہت خوشی ہوئی۔

تقسیم کے پانچ مہینے بعد میں بمبئی چھوڑ کے لاہور چلا آیا کیوں کہ سب عزیز واقارب یہاں جمع

تھے۔افراط وتفریط کا عالم تھا۔اختر صاحب سے ملنے کا خیال تک دماغ میں نہ آیا۔بڑی مُدّت کے بعد یومِ اقبال کے جلسے میں اُن کو دیکھا مگر نہایت ہی ابتر حالت میں۔

رات کے جلسے کی صدارت اختر صاحب کو کرنا تھی۔یونیورسٹی ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔جلسے میں شرکت کے لیے بھارت سے علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی آئے ہوئے تھے۔وقت ہو چکا تھا مگر صاحبِ صدر موجود نہیں تھے۔میں نے ساحر لدھیانوی سے پوچھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اختر شیرانی صاحب ہال کے باہر پی رہے ہیں۔اُن کی حالت بہت غیر ہے،اِس لیے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ صدارت نہ کریں،مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ مُصر ہیں۔

میں باہر گیا تو دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور پی رہے ہیں۔ظہیر کاشمیری کے ہاتھ میں بوتل ہے۔آپ نے گلاس ختم کیا اور ظہیر سے کہا:''چلو اجلاس کا وقت ہو گیا۔''ظہیر نے ان کو روکا ہے:''جی نہیں۔ابھی کہاں ہوا ہے۔''مگر اندر ہال سے نظم پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔آپ نے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ کے اپنے منہ میں کئی کئی ٹکڑے کرتے ہوئے کہا:''جلسہ شروع ہو چکا ہے۔مجھے آواز آ رہی ہے۔''یہ کہہ کر اُنھوں نے ظہیر کو دھکا دیا۔اِس موقعے پر میں آگے بڑھا۔اختر صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے بالکل نہ پہچانا۔نشے سے اُن کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔میں نے اُن کو جھنجھوڑا اور اپنا نام بتایا۔اِس پر اُنھوں نے ایک لمبی''آہ''کی اور مجھے گلے لگا لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔الفاظ چونکہ اُن کے مُنہ میں اوپر تلے ہو کر ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے،اِس لیے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ظہیر نے میرے کان میں کہا کہ میں اُنھیں اندر ہال میں نہ جانے دوں،مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔میں نے اور تو کچھ نہ کیا،اختر صاحب سے کہا:''اِتنی دیر کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔کیا اس کی خوشی میں بوتل میں سے مجھے کچھ نہ ملے گا؟''

آپ نے ظہیر کاشمیری سے کچھ کہا،جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ سعادت کو ایک گلاس بنا دو۔ظہیر گلاس میں آتشِ سیّال انڈیلنے لگا کہ اختر صاحب تیزی سے لڑکھڑاتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہو گئے اور ہمیں اس کی اُس وقت خبر ہوئی جب اُن کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔پھر بھی میں دوڑ کر اندر گیا اور چبوترے

پر چڑھنے سے پہلے اُن کو روک لیا، مگر وہ میری گرفت سے نکل کر کرسیٔ صدارت پر جا بیٹھے۔ جلسے کے منتظمین بہت پریشان ہوئے۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ سب اسی مخمصے میں گرفتار تھے۔ اُن کی حالت بہت بُری تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے کرسی پر جھولتے رہے، لیکن جب اُنھوں نے اُٹھ کر تقریر کرنا چاہی تو معاملہ بڑا سنگین ہو گیا۔ مائیکروفون کے سامنے آپ بار بار اپنی ڈھیلی پتلون ٹھیک کرتے اور ثابت قدم رہنے کی ناکام کوشش میں بار بار لڑکھڑاتے تھے۔ آپ کی لُکنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا نکل رہا تھا۔

حاضرین میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا ''یہ شرابی ہے۔ اِسے باہر نکالو۔'' بس طوفان برپا ہو گیا۔ ایک نے بنچوں پر کھڑے ہو کر بڑے غصّے میں کہا۔ ''پاکستان میں کیا یہی کچھ ہوگا۔۔۔۔۔'' دوسرا چلّایا ''اور جلسے میں خواتین بھی موجود ہیں۔''

اختر صاحب برابر بولتے رہے۔ ایک تو ویسے ہی ان کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی، شور میں تو وہ ایک شور کا حصّہ بن گئی تھی۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو دوست احباب اختر صاحب کو زبردستی ہال سے باہر لے گئے۔ فضا بہت خراب ہو گئی تھی، لیکن شورش کاشمیری کی بروقت تقریر نے مدد کی اور ہال پُرسکون ہو گیا۔

اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات میو ہسپتال میں ہوئی۔ میں، پرویز پروڈکشن کے لیے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ احمد ندیم قاسمی آئے۔ آپ نے بتایا کہ ''میں نے کسی سے سُنا ہے اختر صاحب دو تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں اور میو ہسپتال میں پڑے ہیں، بڑی کسمپرسی کی حالت میں۔ کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔ مسعود پرویز نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی کہ اُن کی دو تین نظمیں یا غزلیں فلم کے لیے لے لی جائیں اور پرویز پروڈکشن کی طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے اُن کو دے دیے جائیں۔ بات معقول تھی چنانچہ ہم اُسی وقت موٹر میں بیٹھ کر میو ہسپتال پہنچے۔

مریضوں سے ملنے کے لیے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں اِس لیے ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پر اُس وقت جو ڈاکٹر مقرر تھے، اُن سے ملے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ نے بڑے افسوس ناک لہجے میں کہا: ''اُن سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ

نہیں۔“

میں نے پوچھا:”کیوں؟“

ڈاکٹر صاحب نے اُسی لہجے میں جواب دیا:”وہ بے ہوش ہیں۔جب سے یہاں آئے ہیں اُن پر غشی طاری ہے یعنی الکوہلک کوما۔“

یہ سُن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ہم نے اس کا اظہار کر دیا۔ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور ہمیں وہاں لے گئے جہاں ہمارا رومانی شاعر، سلمیٰ اور عذرا کا خالق بے ہوش پڑا تھا۔بیڈ کے ارد گرد کپڑا تنا تھا۔ہم نے دیکھا اختر صاحب آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔لمبے لمبے ناہموار سانس لے رہے ہیں۔ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ہم تینوں اُن کو اِس حالت میں دیکھ کر پژمردہ ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا:”کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟“ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا”ہم امکان بھر کوشش کر چکے ہیں۔“

”انتڑیاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ایک صرف دل اچھی حالت میں ہے۔گھپ اندھیرے میں امید کی بس یہی ایک چھوٹی سی کرن ہے۔“

جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت میں کسی نہ کسی طرح کام آنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا”اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں۔آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے۔ممکن ہے بھارت میں مل جائے۔“

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام لکھوا کر میں فیض صاحب کے پاس پہنچا اور اُن کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اُسی وقت امرتسر ٹیلی فون کرایا اور اپنے اخبار کے ایجنٹ سے کہا کہ وہ دوا حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے لیکن افسوس دوا نہ ملی۔مسعود پرویز نے دِلّی فون کیا۔وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سلمیٰ اور عذرا کو پیارے ہو گئے۔

(”گنجِ فرشتے“) ❁❁❁❁❁

شورش کاشمیری

اختر شیرانی

نام داؤد خاں، تخلّص اختر، قوم شیرانی الافغانی، علامہ محمود شیرانی کے اکلوتے بیٹے، آبائی وطن ٹونک تھا لیکن لاہور میں پروان چڑھے۔ افق شعر پر آفتاب کی طرح چمکے اور یہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اختر کو موت نے نہیں مارا بلکہ وہ خود مرے تھے۔ واقعہ یہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں زندگی کے بخیے اُدھیڑ ڈالے۔ شراب کے بغیر اُن کا کوئی تصوّر قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ شراب پیتے نہیں بلکہ حلق کے نیچے غٹا غٹ اُتارتے تھے۔ اُن کا وجود سمٹ سمٹا کے شراب ہو گیا تھا۔ اخیر عمر میں یہ عالم تھا کہ شراب میں پانی ملانا شرک سمجھتے تھے۔ بوتل خریدی، کاک اُتارا اور بے روک ہو کر پی گئے۔ کسی نے ٹوکا تو اُسے قہقہوں میں اُڑا دیا۔

اُن کی زندگی کا حرفِ آغاز سلمیٰ ہے جو اُن کے کلام میں روح کی طرح رچا ہوا ہے اور حرفِ آخر شراب جس میں بُت کدے سے مَے کدے تک کی سینکڑوں رُسوائیاں چھپی ہوئی ہیں۔

اُنھوں نے جوانی میں بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھائے اور کئی دروازوں پر دستک دے کر لوٹ آئے لیکن سلمیٰ سے اُن کا لگاؤ کبھی ختم نہیں ہوا۔ سلمیٰ ہی کے لیے جیتے تھے اور سلمیٰ ہی کے لیے داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

شاعری میں اُنھوں نے جو نئے تجربے کیے وہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں بلکہ اُن کی کسک آج بھی تنہائی کے لمحوں میں دِلوں کے اندر محسوس ہوتی ہے اور جب تک انسان گوشت پوست کا انسان ہے، اختر کی شاعری کا رُوپ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔

میانہ قامت، دوہرا بدن، کتابی چہرہ اور روشن آنکھیں لیکن رِندی کے باوجود پلکیں حیا سے جُھکی ہوئیں، ستواں ناک، سڈول جسم، چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے۔ کبھی کسی بھلے وقت میں اچکن بھی پہن لیتے، ورنہ عام لباس کھلے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص اُنھیں چہرے مُہرے کے اعتبار سے اختر شیرانی نہیں کہہ سکتا تھا بلکہ حُلیے سے تو بمبئی کے دادا ہی نظر آتے تھے۔ اُنھیں دیکھنے سے نہ دیکھنا زیادہ بہتر تھا۔ وہ اپنے کلام میں ایک یونانی مجسمہ معلوم ہوتے تھے لیکن حقیقتاً وہ معذرت کی ایک صدا تھے۔

(''قلمی چہرے'')

❁❁❁❁❁❁

شوکت تھانوی

اختر شیرانی

رسائل میں کافی پڑھا ہے۔ یوں بہت کم دیکھا ہے اور جس قدر دیکھا ہے اُس سے بھی بہت کم سمجھا ہے۔ البتہ اِس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ عالم ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔ میں اپنی حیرت کے نشے میں تھا اور وہ اپنے ذاتی نشہ میں.......... سیراب تشنہ کام........ میں نے اس بلا کی پیاس کبھی نہیں دیکھی۔ صحرا میں پیاس تو دیکھی ہے مگر دریا کے اندر بھی پیاس؟.........

اختر شیرانی کے شاعر ہونے پر ایمان ہے۔ پڑھ پڑھ کر جھومے ہیں، گُنگنائے ہیں مگر اختر شیرانی کو دیکھ کر ایک دھچکا بھی لگا ہے۔ دل چاہا ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ یہ اختر شیرانی نہیں ہیں اور جب کسی نے کہا ہے کہ یہی ہیں اختر شیرانی تو ایسا معلوم ہوا ہے کہ گویا ہماری ہنسی اُڑ رہی ہے۔ ہم کو طعنہ دیا جا رہا ہے، ہمیں چھیڑا جا رہا ہے۔

("شیش محل")

☆☆☆☆☆☆

صادق الخیری

اختر شیرانی

اُردو شاعری میں رومانی دور کی یاد آتے ہی طائرِ خیال، ماضی کا طواف کرنے لگتا ہے اور ذہن میں اُس شاعرِ رعنا کا نام اُبھر آتا ہے جس کے تخیّل میں آغا حشر کاشمیری نے ہزاروں جنتیں آباد دیکھیں، یعنی اختر شیرانی۔

اختر شیرانی نے ہمارے شعری ادب میں نئے نئے تجربے اور قابل قدر اضافے کیے ہیں، اُنھوں نے روایتی انداز چھوڑ کر نہ صرف نظم کی ہیئت بدلی، بلکہ بے حجابانہ کہنے کا طرز اختیار کیا۔ چنانچہ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اُن کا مرکزِ خیال مرد کے بجائے عورت ہے --------- عورت جو کبھی سلمیٰ کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی ریحانہ کے روپ میں۔ محبوب کا یہ نیا تصوّر، تخاطب کا یہ نیا انداز، دراصل ایک عطیہ ہے جو اختر شیرانی نے اُردو شاعری کو دیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے جیسے اُن کی شاعری مقبول ہوتی گئی، گھر گھر لڑکیوں کے نام سلمیٰ اور ریحانہ رکھے جانے لگے اور ان کی نظموں کے بند کے بند ذہنوں نے ازخود محفوظ کر لیے۔

اختر شیرانی کی جن نظموں سے میں پہلے پہل متأثر ہوا اُن میں ''اے عشق کہیں لے چل'' مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ یہ اُن کے اوّلین دور کی یادگار نظم ہے۔ اِس کا موضوع، اِس کی ہیئت و ترتیب، اِس کے الفاظ و تراکیب اور سب سے بڑھ کر اِس کی روانی اور موسیقی، یہ سب اجزا، شاعر نے اِس حُسن و خوبی کے ساتھ یک جا کیے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یاد نہیں آتا کہ یہ نظم سب سے پہلے ''بہارستان'' میں چھپی تھی یا ''ہزار داستان'' میں۔ اِس نظم کو ایک تصویر کے ساتھ شائع کیا گیا تھا اور دراصل یہ تصویر ہی اس پُر کیف نظم کا محرّک ہوئی۔ یہ نظم مجھے بے حد عزیز ہے۔ اِس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سُنیے:

سنہ ۳۶ء میں ''ساقی'' کے ''جاپان نمبر'' کے لیے میں نے ادیبۂ فرنگ، جون کون کوئسٹ کے ایک ناول کا ترجمہ کیا۔ یہ ناول ''طلوعِ آفتاب کی سرزمین''، یعنی جاپان کے گُل پوش خیابانوں کا قصّۂ عشق ہے اور مصنّفہ نے اِس سحرناک ماحول میں ایک بڑی دل دوز داستان سُنائی ہے۔ اِس ناول کو خوب سراہا گیا۔ اور غالباً اِس پائے کے ناول اُردو زبان میں بہت کم منتقل ہوئے ہیں۔ بعد میں جب اِس ناول کو کتابی صورت میں شائع کیا جارہا تھا تو مجھے اس کے نام کی فکر ہوئی، کیونکہ انگریزی عنوان An Eastern Love کا لفظی یا عام ترجمہ مجھے ناپسند تھا۔ مجھے اس کے لیے ایسے نام کی تلاش تھی جو خوب صورت بھی ہو اور جس کی اصل موضوع سے مناسبت بھی ہو۔ بہت سے کرم فرماؤں کی طرح اختر شیرانی نے بھی مجھے اِس ناول کے بارے میں خط لکھا تھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار عجیب وغریب انداز میں کیا تھا۔ اُنھوں نے لکھا کہ میں آج کل بہت کم چیزیں پڑھتا ہوں، اِس لیے خود اِسے پڑھنے کی توفیق نہ ہوتی لیکن میرے ایک رفیق نے آپ کے ناول کی بےحد تعریف کی۔ چنانچہ مجھے اشتیاق ہوا اور یقین کیجیے کہ اِسے پڑھ کر مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی-------- میں نے سوچا کہ اِس خوب صورت نام کے لیے انھیں سے کیوں نہ مشورہ کرلیا جائے؟ وہ اُن دِنوں ٹونک منتقل ہوگئے تھے۔ میں نے اُنھیں وہاں خط لکھا۔ اس کے بعد یاددہانی کی۔ پھر ایک اور خط لکھا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔۔۔

مجھے اُن دِنوں تفریحی رخصت پر جانا تھا۔ چنانچہ جے پور، اجمیر کے ساتھ ٹونک کا پروگرام بنایا۔ جے پور کے اسٹیشن پر ریل رکی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت، چند احباب کے ہمراہ ایک کونے میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں اور خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ ملاقات ہوئی تو انار کی طرح کھل گئے۔ زبردستی اپنی آرام کرسی پر بٹھایا۔ میرے خطوط کے بارے میں قطعی لاعلمی ظاہر کی، اور جب میں نے ٹونک کے سفر کا مقصد بتایا تو بہت ہنسے۔ خمار کی وجہ سے کچھ لڑکھڑا بھی رہے تھے۔ مگر بحیثیت مجموعی طبیعت موج پر تھی اور گاہے گاہے اپنے رفیقوں کو ''بیٹا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرے لیے اُنھوں نے ریفرشمنٹ روم سے چائے کا بندوبست کیا اور جو بیرا چائے کی کشتی لے کر آیا، وہ عمر میں اُن سے دگنا نہیں تو ڈیوڑھا ضرور تھا۔ جب اُنھوں نے اُس کو بھی ''بیٹا'' کہا تو وہ بگڑ گیا مگر اُنھوں نے اس کے بڑبڑانے کی صرف اِتنی پروا کی کہ ''اچھا بیٹے!

اب تمھیں بیٹا نہیں کہیں گے'' کہہ کر پھر ہنسنے لگے۔۔۔۔

میرے ساتھ بیگم صادق الخیری اور بچے بھی تھے۔ٹونک جانے والی گاڑی کے انتظار میں وہ سب ویٹنگ روم میں ٹھہر گئے تھے۔جب مجھے زیادہ دیر لگی اور میرا چھوٹا بچہ وامق گھبرا کر رونے لگا تو ملازم اُسے میرے پاس لے آیا۔اختر شیرانی نے دیکھ کر پوچھا:''یہ میرا بھتیجا ہے؟'' میں نے کہا:''جی ہاں۔ہمارا اِرادہ تھا کہ آپ سے ملنے کے بعد اجمیر جائیں گے۔'' اُنھوں نے بچے کو گود میں لے لیا۔پھر کچھ سوچ کر اُنھوں نے اُسے نوکر کو واپس دے دیا،اور ایک صاحب کو''بیٹے اِدھر آنا'' کہہ کر اپنے ساتھ ایک طرف لے گئے۔ذرا دیر بعد واپس آئے اور میرے بچے کو پانچ روپے دیے اور اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا،وہ بولے:''صادق میاں!میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔میں نے اِس بچے کو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔اور میاں!بھاوج کو جا کر میری دُعا کہہ آؤ۔''

میں پُرانی رسموں کا قائل نہیں ہوں،مگر اُنھوں نے یہ سب کچھ اِتنی عُجلت اور خلوص سے کہا کہ مجھ پر بڑا اثر ہوا۔اُس وقت میں نے اُن میں اگلے وقتوں کی جھلک دیکھی۔خیر،بہت دیر تک سوچتے رہے۔پھر ایک دم بولے:''میری نظم............ مگر نام طویل ہو جائے گا......''

میں نے کہا''کیا؟''بولے:''اے عشق کہیں لے چل''..........

یہ نام مجھے بے حد پسند آیا اور میں نے اُن کا عطیہ سمجھ کر بصد شکریہ اپنے ناول کے لیے قبول کر لیا۔

۳۸ءمیں اختر شیرانی دِلّی آئے تو میرے بڑے بھائی (مولانا رازق الخیری) نے اُن کے اعزاز میں پُرتکلّف دعوت دی۔اس موقع پر مجھے بہت سے اکابرِ اُردو کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔میں اچھے شاعروں کی دل سے قدر کرتا ہوں،لیکن پیشہ ور شعراء سے مجھے چڑ ہے اور یہ کہنے میں مجھے مطلق تامّل نہیں کہ میں اِن شاعروں کو کبھی اچھا نہیں سمجھتا جو سطحی یا بے مقصد شعر کہتے ہیں۔اِسی طرح کسی شاعر کا موقع بے موقع شعر سُنانا بھی مجھے ناگوار گزرتا ہے۔بہر حال اِس صحبت میں تو بہت سے قد آور اور پڑھے لکھے ادیب اور شاعر جمع تھے،اور مجھے ان میں سے اکثر شعراء کا کلام سُننے کا اِشتیاق تھا۔

کھانے کے بعد،اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں تو ساغر نظامی نے فرمایا:''ارے بھائی!یہ کیا خشک گفتگو ہے۔کھانا کھاتے ہوئے اِتنی دیر ہوگئی مگر شعر و شاعری کا ابھی تک ذکر نہیں۔طعام کے بعد تو کلام لازم ہو

جاتا ہے۔‘‘

یہ سُن کر سب نے شاعروں کا جائزہ لیا اور سوائے حضرتِ جوشؔ اور اخترؔ شیرانی کے، سب کو آمادہ پایا۔ جوشؔ اور اخترؔ کا کلام، اُن کی زبانی سُننے کا مجھے بے حد شوق تھا۔ لہٰذا میں نے جوش صاحب کی طرف درخواست کے انداز میں دیکھا تو وہ بولے: ’’ہاں ہاں۔ مگر پہلے اِن سے سُنیں گے۔۔ یہ ساغرؔ کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ ساغرؔ نے اپنے مجموعے میں سے جو وہ ساتھ لائے تھے، ایک عمدہ غزل سُنائی لیکن جب وہ ختم ہوگئی تو اُنھوں نے اپنی کتاب بند نہیں کی۔ خیال یہ تھا کہ اب دوسرے صاحب اپنا کلام سُنائیں گے، مگر ساغرؔ نے فوراً کہا: ’’ایک غزل سُنانے کے بعد تو شاعر موج میں آتا ہے۔ ایسے میں اسے ٹوکنا نہیں چاہیے۔‘‘ اِتنا کہہ کہ اُنھوں نے ’’اے میری روحِ گلاب‘‘ سُنائی اور واقعی بہت لطف آیا۔ پھر سب اخترؔ شیرانی کی طرف متوجہ ہوئے، مگر افسوس! وہ نہ صرف خالی الذہن تھے بلکہ سب کے اصرار کے باوجود کچھ نہ سُنا سکے۔ آخر جوشؔ صاحب نے یہ کہہ کر کہ شاعر کو سُن کر شاعر گرماتا ہے، پہل کی اور گرج دار آواز میں اپنا کلام سُنایا۔ اس کے بعد پھر سب نے اصرار کیا، مگر اخترؔ شیرانی اپنا جگر تھامے بیٹھے رہے۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر اشرفؔ ندوی اور ڈاکٹر محی الدین زورؔ جیسے احباب کی استدعا پر وہ شرمندہ سے ہیں۔ کبھی کوئی شعر یاد آتا ہے، کبھی صرف ایک مصرع، اور کبھی آدھے مصرعے تک پہنچتے ہی بھول جاتے ہیں۔ کثرتِ شراب نوشی نے اُنھیں گویا ناکارہ کر دیا تھا اور اس صحبت میں ہر شخص کو اِس کا احساس تھا۔ آخر جوشؔ صاحب فرمانے لگے: ’’جگر نے شراب چھوڑ دی اور بچ گئے۔ اخترؔ سے یہ چھٹ نہیں سکتی۔ اس نے انھیں برباد کر دیا ہے۔‘‘، معلوم نہیں اس موقع پر اخترؔ شیرانی کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُنھیں شرمندگی بھی تھی اور اپنی حالت کا رنج بھی۔

جب صحبت آخر ہوئی اور احباب رخصت ہو گئے تو میں نے اخترؔ صاحب سے کہا کہ مجھے اوٹو گراف لکھوانے کا شوق ہے، لیکن میں نے صرف چند خاص ہستیوں کو اِس کی زحمت دی ہے۔ آپ بھی مجھے ممنون کیجیے۔ چاہتا یہ ہوں کہ آپ اپنا وہ شعر لکھیے جسے آپ واقعتاً اپنا بہترین شعر سمجھتے ہوں۔ اُنھوں نے میری البم لے لی اور یہ کہہ کر کہ ’’آپ نے میری مشکل حل کر دی۔‘‘ تحریر فرمایا:

تم کو اختؔر بھی یاد آتا ہے
کھویا کھویا سا وہ جوانِ خموش

اختؔر

۱۳۔۴۔۳۸
(''آسماں کیسے کیسے'')

☆☆☆☆☆☆

صادق الخیری

اختر شیرانی

مگر ہم تہہِ خاک پنہاں رہیں گے

اختر شیرانی کی شاعری مجھے شروع سے پسند ہے لیکن اُن سے تعلقات، جو ہمیشہ نیاز مندانہ رہے، اُس وقت قائم ہوئے جب اُنھوں نے ’’رومان‘‘ نکالا۔ اُن کی فرمائش پر میں نے ’’رومان‘‘ میں ایک افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا ’’آخری رات‘‘۔ اسے اُنھوں نے بے حد پسند کیا اور ’’رومان‘‘ کی خصوصیت کے پیشِ نظر شاید مناسب ہی تھا مگر میں نے جب اپنے افسانوں کے مجموعے ترتیب دیے تو اسے کسی میں شامل نہیں کیا۔ عمر کی رفتار اِنسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ جو فن پارہ آج محمود ہے، ہوسکتا ہے کسی وجہ سے کل فنکار کو پسند نہ رہے۔ یہی اس افسانے کے ساتھ ہوا۔ اس افسانہ کی رسید میں اُنھوں نے جو خط لکھا، اُس میں یہ سطریں بھی تھیں:

> ’’آپ کے برادرِ بزرگ (مولٰینا راز ق الخیری) سے نیاز حاصل تھا۔ اب صحت کی خرابی نے اِس قابل نہ رکھا کہ رازق صاحب سے ملاقات یا خط وکتابت کے ذریعے تجدیدِ مراسم ہوتی رہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور یہ خط بڑی مشکل سے لکھا جا رہا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ’’رومان‘‘ کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ تحریر فرمائیں۔ میری دِلی تمنّا ہے کہ ’’رومان‘‘ میں آپ ہمیشہ لکھا کریں۔ میری خط وکتابت کی سُستی جو بیماری کا نتیجہ ہے، اخلاص سے بدگمانی کا باعث نہ ہونی چاہیے۔‘‘
>
> (صداقت کیش، اختر شیرانی)

اِس خط پر تاریخ یا سن کچھ بھی درج نہیں ہے۔ بعد میں سُنا کہ وہ بالعموم کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ اِسی لیے تاریخ اور مقام لکھنا بھول گئے۔ تاہم یہ غالباً ۳۵ سنہ ء کا زمانہ تھا۔ اِس خط سے اندازہ ہوا کہ اُن کی صحت بگڑ چکی ہے اور یہ بھی کہ اُن سے مولٰینا رازق الخیری کی ملاقات تھی۔ چنانچہ ایک دن مولانا سے گفتگو ہوئی تو اُنھوں نے بڑے رنج کے ساتھ اختر شیرانی کا ذکر کیا کہ ایک جوہرِ قابل زمانے کا شکار ہے۔ دنیا نے اس بے

مثال شاعر کی قدر نہیں کی، جو اپنے وقت کا کیٹس اور شیلی ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اختر شیرانی کی زندگی ایک داغِ ناتمامی کی مانند ہے اور اُن کو ایک زبردست مایوسی اور محرومی نے تباہ حال کر دیا ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ''او دیس سے آنے والے بتا'' اور ''یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی'' مقبولِ خاص و عام ہو چکی تھیں اور پڑھے لکھے گھروں میں ان کا چرچا تھا۔

''رومان'' کے سلسلے میں مراسلت ہوئی تو اُن سے تعلقات بڑھے اور مولانا رازق الخیری سے بھی اُن کے پرانے تعلقات کی تجدید ہو گئی۔

ایک دن کالج سے آیا تو برادرِ معظّم نے یاد کیا۔ اندر گیا تو ایک صاحب سے مصروفِ گفتگو تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے: ''اِنھیں پہچانو۔'' میں نہیں پہچانا تو اُن صاحب سے مخاطب ہوئے: ''آپ پہچانیے۔'' وہ صاحب کھڑے ہو گئے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے ''صادق میاں ہیں۔''

پھر اُنھوں نے تعارف کرایا: ''یہ اختر شیرانی ہیں۔'' مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جب وہ بغل گیر ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ ملاقات رسمی نہیں، بلکہ اِس میں بڑا اخلوص ہے۔

اختر شیرانی کا اب یہ معمول بن گیا تھا کہ جب دِلی آتے تو مولانا رازق الخیری اور مجھ سے ضرور ملتے۔ دفتر ''عصمت'' میں اُن کا کافی وقت گزرتا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ جب وہ مولانا سے ملنے آتے تو اُن کے ہوش و حواس قائم ہوتے اور اُن کی گفتگو بڑی ذمہ دارانہ ہوتی، حالانکہ اُس زمانہ میں اُن کی شراب نوشی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

چونکہ ہمارے ہاں بڑوں کے سامنے ادب لحاظ کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور اختر شیرانی اب میرے ساتھ قدرے بے تکلّفی برتنے لگے تھے، اِس لیے میں مولانا کی موجودگی میں اُن کے پاس کم بیٹھتا تھا۔ ہماری ملاقات زیادہ تر فتح پوری ہوٹل میں ہوتی جہاں وہ قیام کرتے تھے یا ہمارے گھر پر علیحدہ کمرے میں جہاں مولانا رازق الخیری عموماً نہیں آتے تھے۔ ایک دن وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں اُنھیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اُن کے کپڑے بڑے خراب تھے اور اُن کی آنکھیں بے خواب معلوم ہوتی تھیں۔ کہنے لگے: ''صادق میاں! پرسوں رازق صاحب نے بتایا کہ اگلے ہفتے تمھاری شادی ہو رہی ہے۔ ہم تو اُس وقت یہاں نہیں ہوں گے لیکن ہم کو

مٹھائی ضرور ملنی چاہیے۔‘‘ میں نے کہا: ’’آپ ابھی مٹھائی کھائیے گا؟ میں منگاتا ہوں۔‘‘ میں اُٹھنے لگا تو بولے: ’’نہیں نہیں۔ آپ ہمیں پانچ روپے لا دیجئے، ہم مٹھائی خود خرید لیں گے۔‘‘

یہ بات عجیب سی تھی۔ مجھے ذرا دیر لگی تو اُنھوں نے خود ہی کہا: ’’بات یہ ہے صادق میاں! پرسوں رازق صاحب نے تیس روپے دیے تھے وہ ختم ہو گئے۔ اب ہمیں پانچ روپے کی ضرورت ہے۔‘‘

مولانا رازق الخیری نے اُنھیں تیس روپے کیوں دیے؟ اور اُنھوں نے مجھ سے پانچ روپے کیوں مانگے؟ اُن کی حالت اِس قدر رزدہ کیوں ہوگئی؟ یہ آپ آگے چل کر پڑھیں گے۔ میرے لیے اس وقت یہ سب معمّا سا تھا۔ بہرحال آہستہ آہستہ اُن کی خستہ حالی آشکار ہوگئی اور لاہور کے حالات دِلّی کے حلقوں میں عام ہونے لگے کہ شراب نے اختر شیرانی کو مجبور کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جتنا کماتے ہیں اس کی نذر کر دیتے ہیں بلکہ اپنی عظمت اور خودی کو بھی ٹھیس لگا لیتے ہیں۔

چند ماہ بعد وہ پھر دِلّی آئے۔ اُن کی مالی حالت اِس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ اب کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرے بلکہ اُنھوں نے دفتر ’’ریاست‘‘ میں قیام کیا۔ اِس موقع پر اُنھوں نے ’’رومان‘‘ کے بند ہو جانے کا قصّہ بڑی دل سوزی سے سُنایا۔ کہنے لگے کہ ’’میں نے بڑے ارمان سے اِس پرچے کو پروان چڑھایا مگر میرے ایک دوست نے میرے ساتھ دغا کی۔ میں نے اس کی تفصیل معلوم نہیں کی کیونکہ میرا خیال ہے کہ اِس میں خود اُن کی لا اُبالی طبیعت کا بھی قصور ہوگا۔ انتظامی امور اُن کے بس کے نہیں تھے اور جب تک کوئی ان پر قادر نہ ہو، وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہی رہتا ہے۔ خیر، اُنھی دِنوں اُن کی وہ دل دوز نظم ’’مرنے کے بعد‘‘ شائع ہوئی جس میں اُنھوں نے کہا تھا:

چمن زار شاداب و خنداں رہیں گے　　درختوں پر طائر غزل خواں رہیں گے
فضاؤں میں بادل پُر اَفشاں رہیں گے
مگر ہم تہہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے　　صداؤں سے معمور رستے رہیں گے

بپا زندگی کے یہ طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ، روشن چراغاں رہیں گے
مگر ہم تہہِ خاک پنہاں رہیں گے
غرض یہ خدائی کے رنگیں نظارے یہ شام و سحر کے بہاریں نظارے
خراماں و رخشاں و رقصاں رہیں گے
مگر ہم تہہِ خاک پنہاں رہیں گے

یہ چند اقتباسات اس نظم کے ہیں جو دِلوں کو برماتی ہے،لیکن یہ نظم کسی اعلیٰ درجے کے ادبی رسالے میں نہیں چھپی اور نہ اسے وہ شہرت نصیب ہوئی جس کی یہ حق دار تھی۔میں نے جب یہ نظم جس کا ہر بند برچھی کی انی ہے،ایک ہفت روزہ اخبار ''ریاست'' میں پڑھی تو بڑا دُکھ ہوا،لیکن اِس میں اختر شیرانی کا قصور نہیں تھا۔''ریاست'' نے کم سے کم اعترافِ کمال کے طور پر اُن کی خدمت میں ''معاوضہ'' تو پیش کیا،خواہ وہ قلیل ہی ہوگا مگر میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت کے ''معیاری ادبی'' رسائل کہاں گم ہو گئے تھے۔

اختر شیرانی کا کلام پڑھنے کے بعد دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ایک یہ کہ وہ بے حد حسّاس تھے اور اُنھوں نے بڑی شِدّت سے محبّت کی۔دوسری یہ کہ محبت میں ناکامی کے بعد،اُن کے عشق میں آوارگی شامل ہوگئی تھی۔یہ ہرجائی پن اُن کی فطرت کا خاصہ تھا یا انتقاماً اُنھوں نے اسے اختیار کیا۔اس کا فیصلہ مشکل ہے۔یہ شعر:

وہ شاعر ہے کہ دنیا میں کہانی اُس کی رسوا ہے
وہ رسوا،اُس کا دل رسوا،جوانی اُس کی رسوا ہے

اختر شیرانی ہی کا ہے اور اپنے ہی متعلق ہے۔اِس قسم کے اشعار جن سے اُن کی ذہنی کیفیات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اُن کے ہاں کثرت سے ہیں لیکن چونکہ یہ مضمون اُن کی سیرت کے لیے مخصوص نہیں،اس لیے اسے

سے گریز کر کے، اُن کے ایک اور جذبے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اُن کی شاعری کا اہم حصّہ ہے۔ یہ ہے اُن کی امن پسندی، امن کے لیے جدّ و جہد اور وطن کی خاطر سرفروشی کی تمنّا۔ میری رائے میں اُن کی شاعری کو رُجعت پسند قرار دینا اُن پر ظلم ہے۔ اُن کے کلام کا ذرا تحمّل اور گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں جا بجا اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اُن کے ہاں نغمگی اور سرمستی کے علاوہ شمشیر و سناں کی جھنکار بھی ہے۔ یہ وہی رِندِ خراباتی ہے جو للکار کر کہتا ہے:

سُن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساغر کو اُلٹ، بربط کو اُٹھا، ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جاں بازی کی ساعت آپہنچی، رویائے محبت ختم ہوا

ہیں جام و سبو بے کار، اُٹھا
اُٹھ ساقی! اُٹھ تلوار اُٹھا

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں، رہنے دے مئے گلفام نہ دے
تلوار اُٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے
صہبا کی جگہ رقصاں ہے جنوں، مستی کا فریبِ جام نہ دے

یہ جامِ مئے گُلنار اُٹھا
اُٹھ ساقی! اُٹھ تلوار اُٹھا

ایک دفعہ جب اُن کے پاؤں میں شدید چوٹ لگی تو اُنھوں نے اِس سلسلے میں کچھ تمنّائیں کی تھیں لیکن آخری آرزو یہ تھی:

اور اگر زخم ہی آنا تھا، بہر رنگ تو یہ
ملک کے واسطے، میدان میں آیا ہوتا

اختر شیرانی کا جنگی ترانہ ''بڑھے چلو'' پڑھ کر کون ہے جو جانبازی کے جذبے سے سرشار نہ ہو جائے؟ اِس نغمے میں جہاں شوکتِ الفاظ، غضب کی موسیقی اور بے پناہ روانی ہے، وہاں لہو کو گرمانے کا

سامان بھی موجود ہے۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر'' کا مصنّف صرف بربادیٔ دل ہی کا ماتم کرنا نہیں جانتا بلکہ اپنے وطن کے نوجوانوں کو شجاعت وغیرت کا سبق دینا بھی جانتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

اُٹھاؤ تیغِ بے اماں ، وطن کے پاک نام پر
لٹا دو عُمرِ نوجواں ، وطن کے پاک نام پر
نثار کر دو اپنی جاں ، وطن کے پاک نام پر
صدائیں دیتا ہے وطن ، بڑھے چلو بڑھے چلو

دِلاورانِ تیغ زن ، بڑھے چلو بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن ، بڑھے چلو بڑھے چلو

''نظامِ رنگین''، ''فسادزدہ ہندوستان''، ''نغمۂ امن'' اور اِسی قسم کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن سے اختر شیرانی کی دِلی لگن کا پتہ چلتا ہے کہ وہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بیدار فن کار ہے۔ اُس کے حواس جیتے ہیں، اُس کا دماغ زندہ ہے اور وہ ایک خراب نظام سے بیزار ہے۔ کمال یہ ہے کہ ان نظموں میں بھی وہی شادابی، وہی رنگینی اور وہی موسیقی ہے جو اُن کی شاعری کا خاصہ ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ، ان میں ایک بہتر ماحول کی تمنّا اور ایک ذمّے دار فرد کی خوش آئندہ آرزوئیں بھی مچلتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں دِلّی تاراج ہوگئی اور ہم لوگ عازمِ پاکستان ہوئے۔مولانا رازق الخیری پہلے چلے آئے تھے۔اُن کے پیچھے کچھ عرصے کے لیے دفتر ''عصمت'' کی نگرانی میرے سپرد ہوئی۔ اِس دوران مجھے کچھ کاغذات دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ایک عجیب چیز ہاتھ لگی جس سے پتہ چلا کہ اختر شیرانی اور مولانا رازق الخیری کے درمیان کافی خط وکتابت تھی۔موصوف کے خطوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مولانا کو برادرِ بزرگ سمجھتے ہیں۔ان خطوں میں وہی انکساری اور عرضِ مدّعا تھا جو بڑوں کے سامنے چھوٹوں کو ہوتا ہے۔غالباً اُن سے یہ طے ہوا تھا کہ ''عصمت'' میں اشاعت کے لیے خواتین کی جو نظمیں آتی ہیں وہ اُنھیں ایک نظر دیکھ لیا کریں اور مولانا ہر ماہ اُنھیں ایک رقم معاوضے کے طور پر دیا کریں۔معاوضے کا اِس لیے ذکر کرنا پڑا کہ

مولانا اُنھیں جو رقم دیتے تھے وہ احسان معلوم نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ رقم اختر شیرانی کی بجائے اُن کی بیگم کے نام بھیجی جاتی تھی، غالباً اِس خیال سے کہ شراب کی نذر نہ ہو جائے۔ اِس کے باوجود کبھی اختر شیرانی کا دِلّی آنا ہوا اور اُنھوں نے اصرار کر کے رقم خود ہی لے لی تو ٹونک جا کر شرمندگی کا اظہار کرتے تھے، اِس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ رقم خود کبھی نہیں لوں گا۔ اِس معاملے کا مولانا نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا، شاید اِس لیے کہ معاوضہ کے پردے میں مالی امداد مقصود تھی جسے قبول کرنے پر اختر شیرانی جیسا عظیم شاعر مجبور تھا۔

سنہ ۴۸ء میں اختر شیرانی کے متعلق افواہیں اُڑیں کہ اُنھیں قتل کر دیا گیا ہے لیکن وہ غلط نکلیں۔ البتہ سنہ ۴۹ء میں سچ مُچ سناؤنی آئی کہ اُن کا لاہور میں بے کسی کے عالم میں انتقال ہو گیا! یہ عمر اُن کے مرنے کی نہیں تھی، حالانکہ آلامِ حیات نے اُن کے دِلِ زندہ کو عالمِ شباب ہی میں سوگوار کر دیا تھا۔ اختر شیرانی کو اپنی جواں مرگی اور بے نام موت کا خود بھی یقین تھا اور وہ غالباً اِس کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ اُن کے کلام میں جا بجا ایسے اِشارے ملتے ہیں:

اخترؔ اِس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تُربت تو تُربت کا نشاں کوئی نہ ہو

(''نایاب ہیں ہم'')

❁❁❁❁❁❁

عاشق حسین بٹالوی

اختر شیرانی

آج کہتے ہیں مر گیا اختر
آہ وہ عشق پیشہ شعر طراز

رسالہ ''ہمایوں'' کے ابتدائی دور کا ذِکر ہے جب مولانا تاجور نجیب آبادی اُس کے جائنٹ ایڈیٹر تھے، گرمیوں کی لمبی تعطیل میں لاہور کے کالج بند ہوئے تو مولانا اپنے وطن تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے ''ہمایوں'' کی ترتیب و تدوین کا کام اختر شیرانی کے سپرد کر گئے۔ اُسی زمانے میں اختر کے تین مضامین ''ہمایوں'' میں شائع ہوئے جن میں ایک افسانہ تھا جس کا عنوان تھا ''پیکِ نغمہ'' اور دو سوانحی خاکے تھے۔ ایک ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور دوسرا مولوی سیّد احمد مؤلف ''فرہنگِ آصفیہ'' کا۔ اِن مضامین کے علاوہ ایک نظم بھی چھپی جس کا عنوان تھا ''چاندنی رات میں مغلیہ شہزادوں کی چوگان بازی''۔ اختر شیرانی کو غالباً لاہور کے بعض لوگ پہلے بھی جانتے ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والا طبقہ اختر کے نام سے اُس وقت آشنا ہوا جب اُن کی یہ نظم اور تین مضامین یکے بعد دیگرے ''ہمایوں'' میں شائع ہوئے۔

اُنھی دِنوں کا واقعہ ہے، میں ایک روز بڑے ڈاک خانہ کے چوک میں کھڑا تھا اور میرے دوست ہادی حسین سابق ایڈیٹر ''ہزار داستان'' بھی میرے ساتھ تھے کہ ایک تیز و طرّار نوجوان ہمارے پاس سے گزرا جو سر سے ننگا تھا لیکن بال بڑے سلیقے سے آراستہ کیے ہوئے تھے۔ جسم پر چھوٹا کوٹ اور کھُلی موہری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور چہرہ صحت و شباب کی چمک سے روشن تھا۔ ہادی حسین نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ ہیں اختر شیرانی''۔

اختؔر کی یہ پہلی جھلک اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد بھی اُنھیں سرِ راہے گاہے دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن گفتگو کی نوبت کبھی نہ آئی۔ اُن کا کلام بھی اکثر رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ بالخصوص وحیدؔ گیلانی مرحوم کے ''قوسِ قزح'' میں اُن کی بیشتر نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ خود اختؔر نے بھی ایک رسالہ ''بہارستان'' جاری کر رکھا تھا جس کے بعض پرچے میری نظر سے بھی گزرے تھے۔

اختؔر کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے دو تین برس بعد کا ذکر ہے، گرمیوں کی ایک شام کو میں ہوا خوری کے لیے شملہ پہاڑی پر ٹہل رہا تھا کہ خلافِ توقع سامنے سے اختؔر نمودار ہوئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بے تکلّفی سے مصافحہ کیا۔ ہم چونکہ ایک دوسرے کے نام سے بخوبی واقف تھے اِس لیے جب باغ میں ٹہلتے ہوئے اِس طرح اچانک ملاقات ہوگئی تو اِس بات کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ کوئی شخص تعارف کی رسم ادا کرتا تو ہم ہاتھ ملاتے۔ اس ملاقات میں چند منٹ باتیں بھی ہوئیں اور پھر ہم جدا ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں اختؔر نے ''خیالستان'' جاری کیا تو مجھ کو میرے وطن یعنی بٹالہ کے پتے سے خط لکھ کر مضمون کی فرمائش کی۔ مجھے اُس زمانے میں قصّے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا اور جنوری ۱۹۳۰ء کے ''ہمایوں'' کے سالگرہ نمبر میں میری ایک کہانی ''زندگی'' شائع ہوئی تھی جو اختؔر کو بہت پسند آئی تھی۔ اُنھوں نے اسی قسم کی کہانی ''خیالستان'' کے لیے بھی طلب کی۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں ایک افسانہ ''روح کی بیداری'' بھیج دیا جسے اختؔر نے ایک بڑے لمبے تعریفی نوٹ کے ساتھ ''خیالستان'' میں شائع کیا۔ اُس کے بعد گویا میرے اور اختؔر کے باقاعدہ دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک میں لاہور کی ریلوے روڈ کی مہر چند سٹریٹ میں مقیم تھا۔ مہر چند سٹریٹ میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ کی قطار میں آخری مکان میرا تھا۔ براندرتھ روڈ سے بھی اس طرف آنے کا راستہ تھا۔ اُس زمانے میں میرے مکان سے متّصل اسلامیہ کالج کا ''ہیلی'' ہوسٹل تھا۔ اختؔر فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے جو میرے مکان سے بمشکل دس پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اِس لیے ہمیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے میں ہر وقت آسانی تھی۔ اِس پانچ سال کے عرصے کو میری اور اختؔر کی دوستی کے شباب کا زمانہ کہنا چاہیے۔

اختؔر اپنے والد حافظ محمود شیرانی کے ساتھ رہتے تھے۔ جون ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک اسلامیہ کالج میں فارسی کے لیکچرر تھے۔ اور ۱۹۳۰ء کے بعد اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تھے۔ حافظ صاحب کا شمار ہندوستان کے فُضَلائے اجلّ میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے اپنی ساری عمر علم کی تحصیل و ترویج میں بسر کر دی۔ شبلؔی کی ''شعرالعجم'' پر حافظ صاحب نے جو تنقید لکھی تھی اُس کا جواب اعظم گڑھ کے اکابر اپنی متحدہ کوشش سے بھی نہ دے سکے تھے۔ حافظ صاحب کے لہجے میں اگر چہ کہیں کہیں تلخی آ گئی تھی لیکن اِس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو وہ تنقید آج بھی ایک بھاری پتھر کی طرح اپنی جگہ قائم ہے جسے کوئی شخص ہلا نہیں سکا۔ فارسی ادب پر حافظ صاحب کی نظر حیرت انگیز طور پر وسیع تھی۔ افسوس کے اُن کے نتائج فکر کو انگریزی میں قلم بند نہ کیا جا سکا۔ ورنہ انگلستان کے مشہور مستشرقین براؤنؔ اور نکلسنؔ بھی اُن کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

حافظ صاحب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک مسلسل نو سال انگلستان میں مقیم رہے۔ اُن کے والد نے جو ریاست ٹونک کے بہت بڑے رئیس تھے، اپنے بچے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ لیکن تعجّب کی بات ہے کہ حافظ محمود شیرانی اُس وقت انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ صرف فارسی میں منشی فاضل کے درجے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی اُنھوں نے انگلستان آ کر سیکھی۔

یہاں آئے ہوئے اُنھیں بمشکل سال بھر ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا اور بھائیوں نے جائیداد پر قابض ہو کر روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔ حافظ صاحب کو پردیس میں سخت تنگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُسی زمانے میں علّامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر عبداللہ ہارون، سہروردی اور سر سلطان احمد وغیرہ بھی بغرضِ تعلیم لندن میں مقیم تھے اور حافظ صاحب سے اُن سب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ علّامہ اقبالؔ اور سر عبدالقادر کی کوشش سے حافظ صاحب کو انڈیا آفس لائبریری میں سر ٹامس آرنلڈ کے تحت ایک ملازمت مل گئی جس سے نان و نمک کی سبیل پیدا ہو گئی۔

اِس کے علاوہ حافظ صاحب نے محض اپنی قابلیت کی بنا پر لندن کی مشہور پبلشنگ فرم ''لیوزک'' کے ہاں بھی ملازمت حاصل کر لی۔ ''لیوزک'' ایک بین الاقوامی شہرت کا اِدارہ ہے جو گزشتہ ستّر سال سے

انگلستان میں مشرقی علوم کی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ فارسی، عربی، سنسکرت اور چینی زبان کی بہترین کتابیں خواہ کسی ملک میں طبع ہوئی ہوں ''لیوزک'' کے ہاں مل سکتی ہیں۔ برٹش میوزیم کے عین سامنے ''لیوزک'' کا دفتر آج بھی موجود ہے۔

انڈیا آفس لائبریری اور ''لیوزک'' نے حافظ محمود شیرانی کو فکرِ معاش سے تو بے نیاز کر دیا لیکن وطن کی یاد اُن کے دل سے محو نہ ہو سکی۔ آخر نو سال کے قیام کے بعد وہ واپس ہندوستان چلے گئے۔ اُن کا اِرادہ تھا کہ ٹونک میں کچھ عرصہ ٹھہر کر اور اپنے عزیزوں سے مل کر واپس انگلستان چلے جائیں گے لیکن اُنھیں وہاں پہنچے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی اور واپس انگلستان جانے کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔

جب یہ محاربۂ عظیم ختم ہوا تو حافظ صاحب نے انگلستان جانے کا اِرادہ ترک کر دیا۔ اور اس کی بجائے لاہور جا کر اسلامیہ کالج میں نوکری کر لی۔ اس ملازمت کے حصول میں اُن کی زیادہ مدد سر عبدالقادر اور علامہ اقبالؒ نے کی۔ اُن کے پاس سوائے منشی فاضل کے اور کوئی تعلیمی سند نہ تھی لیکن سر عبدالقادر اور علّامہ اقبال اُن کے علمی تبحّر سے خوب واقف تھے اِس لیے ان حضرات کی سعی و کوشش سے تمام مشکلیں رفع ہو گئیں۔

اب حافظ صاحب کا کُنبہ بھی لاہور آ گیا تھا اور اخترؔ کو اُنھوں نے اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا۔ حافظ صاحب کا اِرادہ تھا کہ اخترؔ کو منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد باقاعدہ انگریزی تعلیم دلائیں گے لیکن اُن کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ اخترؔ کو شعر وسُخن کا شوق ٹونک ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ لاہور کی فضا نے اِس شوق کو اور تیز کر دیا۔ چنانچہ اُنھوں نے منشی فاضل کے جھنجھٹ سے فارغ ہو کر باقاعدہ شعر و ادب کو اپنا واحد مشغلہ بنا لیا۔ ابتدا میں مولانا تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لی لیکن پھر اُن کا ذوقِ سلیم ہی اُن کی رہنمائی و رہبری کے لیے کافی ثابت ہوا۔

اختر کا نام محمد داؤد خاں تھا۔ لیکن وہ اخترؔ شیرانی کے نام سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ اور بہت کم لوگوں کو اُن کا اصل نام معلوم تھا۔ ''شیرانی'' افغانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اختر چونکہ شیرانی

الاصل تھے اِس لیے اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے قبیلے کا نام بھی چسپاں کر لیا، تا کہ امتیازی شان باقی رہے۔

۱۹۲۶ء تک اختؔر نے شراب نہیں چکھی تھی۔ اُسی سال مولانا تاجوؔر نجیب آبادی نے لاہور کی مشہور فرم عطر چند کپور اینڈ سنز کے سرمائے اور خان بہادر شیخ نور الٰہی کی اعانت سے ایک اُردو مرکز قائم کیا تا کہ اُردو نظم و نثر کے تمام ذخیرے کی چھان پھٹک کر کے اُس میں سے بہترین اور جان دار حصّے کو الگ کر لیا جائے۔ اِس کام کے لیے اُنھوں نے جگؔر مراد آبادی، اصغرؔ گونڈوی، فہیمؔ بیگ چغتائی، یاسؔ عظیم آبادی (جو بعد میں یگانہ لکھنوی کہلانے لگے تھے) اور مہر محمد خاں شہابؔ مالیر کوٹلوی کو لاہور بلایا۔ اختؔر شیرانی اور فاخرؔ ہریانوی بھی باقاعدہ اُردو مرکز سے منسلک ہو گئے تھے۔

اُنھی دِنوں سیمابؔ اکبر آبادی اور ساغر نظامی نے بھی لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ چنانچہ اِن دُور و نزدیک کے سخنورانِ کامل کی نغمہ سنجیوں سے لاہور کی فضائیں گونجنے لگی جیسے برات میں یکا یک بہت سی شہنائیاں بجنے لگتی ہیں۔ ہر طرف شعر خوانی کی محفلیں منعقد ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ہر شام کہیں نہ کہیں مشاعرہ ضرور ہوتا تھا۔ جہاں طوطیانِ خوش گفتار اپنے نغموں سے سامعین کو وجد میں لاتے تھے۔ سر محمد شفیع اور سر عبدالقادر جیسے بزرگوں کو اِن مشاعروں کی صدارت کرنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ علّامہ اقبالؔ کے دولت کدے پر بھی گاہے گاہے جگؔر، اصغرؔ، یاسؔ اور سیماب جمع ہوتے تھے۔ لاہور کی ادبی تاریخ میں یہ مختصر سا دَورِ زرّیں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا تاجوؔر نے اپنی زندگی میں کوئی ٹھوس علمی یا ادبی کام نہیں کیا۔ لیکن اہلِ پنجاب پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ تازہ رہے گا کہ اُنھوں نے اِس صوبہ کے نوجوانوں میں شعر و اَدب کا مذاق خوب پیدا کیا۔ اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت آسان تھا لیکن بہت مؤثر بھی ثابت ہوا۔ یعنی مشاعرے۔ مولانا تاجوؔر بہت بڑے ''مشاعرہ باز'' تھے۔ اور اُن کے اہتمام سے لاہور میں بڑے ٹھاٹھ کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جن سے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں شعر سمجھنے اور شعر کہنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

جگؔر مراد آبادی اُس زمانے میں جی کھول کر شراب پیتے تھے۔ اور اُن کی صحبت نے اختؔر کو بھی

اِس بلائے بے درماں کا شکار کر دیا۔ چنانچہ آگے چل کر یہ حالت ہوئی کہ اخترؔ اور شراب لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ اخترؔ کو شراب سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔

اخترؔ کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو دنیائے سُخن میں اقبالؔ کا طُوطی بول رہا تھا۔ اور ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا شاعر اقبالؔ کی پیروی کرنا باعثِ فخر ہی نہیں بلکہ موجبِ ثواب بھی سمجھتا تھا۔ ادھر ''ترکِ موالات'' اور ''خلافت'' کی تحریکوں نے بھی قومی شاعری کو فروغ دینے میں بڑا حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی اُردو شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو اُس میں نام نہاد ''فلسفہ''، ''قوم پرستی''، ''انقلاب پسندی'' اور ''استعمار دشمنی'' کی وہ بھرمار نظر آتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہندوستان کے شاعروں نے قسم کھالی تھی کہ سب کچھ کہیں گے لیکن شعر نہیں کہیں گے۔

اِنتہا یہ ہے کہ سیمابؔ اکبر آبادی اور احسنؔ مارہروی جیسے کُہنہ مشق اُستادوں نے بھی اپنا رنگ ترک کر کے اقبالؔ کی نقل میں گویا بزعمِ خود ''فلسفہ'' کو شعر کا جامہ پہنانا شروع کر دیا تھا۔ جوشؔ ملیح آبادی فطری طور پر رامش و رنگ اور عیش و طرب کے شاعر ہیں اور اُن کے کلام کا وہی حصّہ باقی رہنے کے قابل ہے جس میں اُنھوں نے مئے کُہنہ و معشوقِ جواں کی شان میں دل آویز قصیدے لکھے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ جوشؔ بھی قبولِ عام حاصل کرنے کے شوق میں روشِ عام کا شکار ہو گئے۔ اور اُنھوں نے ''انقلاب۔ انقلاب'' کے ارزاں اور بے معنی نعرے لگانا شروع کر دیے۔ اِس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ہمارے ہاں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوگئی، جس نے رہی سہی شاعری کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔

اِس ماحول میں اگر اختر شیرانی بھی اِسی رو میں بہہ جاتے تو کچھ تعجّب کی بات نہ تھی۔ میری نگاہ میں اخترؔ کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ اُنھوں نے ایسی فضا میں سانس لینے کے باوجود جہاں شعوری ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور سے بھی لوگ اقبالؔ کی پیروی کرنے پر مجبور تھے، اِس نوع کی شاعری کرنے سے گریز کیا اور اُس کی بجائے اپنی فطرت کے حقیقی نقش و نگار سے اُردو شاعری کے ایوان کو آراستہ کرنا شروع کیا۔

مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا ہے جس کا ذکر کیے بغیر آگے چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ مولانا محمد علی

اور مولانا شوکت علی کے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی گوہرؔ مذہب میں احمدی عقائد رکھتے تھے اور مستقل طور پر قادیان میں مقیم تھے۔ میرے والدِ مرحوم سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ جب کبھی قادیان سے بٹالہ آتے ہمارے ہاں ضرور تشریف لاتے تھے۔

مولانا ذوالفقار علی گوہرؔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ اور ہمیشہ اپنے اُستاد کا ذکر بڑی محبّت اور عزّت سے کرتے تھے۔ داغ کم و بیش چوبیس سال رام پور میں رہے۔ گوہر کا وطن بھی رام پور تھا اِس لیے اُنھیں داغ کی بے شمار باتیں یاد تھیں۔ ایک دفعہ داغ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے: ''میں نے ایک روز عرض کیا کہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ نئی تعلیم نے انگریزی خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ قومی نوحہ خوانی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ نیچرل شاعری پر لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ حضرتِ اُستاد نے فرمایا ''نیچرل شاعری کیسی ہوتی ہے؟ کچھ سُناؤ۔'' میں نے مسدّسِ حالیؔ کے کچھ بند سُنائے۔ سُن کر خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا ''کبھی کبھی سُنا دیا کرو لیکن یہ چیز میرے بس کی نہیں ہے۔''

داغ کے اِس جواب میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے اچھا شعر کہنے والے صرف اِس لیے تباہ ہو گئے کہ اُنھوں نے اپنے حقیقی رنگ اور فطری جوہر سے ہٹ کر صرف عارضی واہ واہ حاصل کرنے کے لیے ''عوامی'' اور ''قومی'' شاعری کا بہروپ بھرنا شروع کر دیا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے سب سے بڑا نقصان جو ہمیں پہنچایا وہ یہی تھا کہ بعض نہایت خوش فکر و خوش گو شاعر جنھیں مبدأ فیاض سے شعر کا نکھرا ہوا مذاق عطا ہوا تھا ''انقلاب'' اور ''مزدور'' کے چکر میں پڑ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتیں ضائع کر بیٹھے۔

داغ خوب جانتے تھے کہ وہ مسدّسِ حالی کی قسم کی چیز لکھنے کے اہل نہیں اور یہی بات اُن کی صحیح شاعرانہ بصیرت کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ میں اختر شیرانی کی شاعرانہ عظمت کا اِس لیے قائل ہوں کہ اُنھوں نے قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے شوق میں وقت کی راگنی نہیں گائی۔ اور اقبالؔ کا رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی وہبی قوت سے کام لے کر شاعری کے دھارے کا رخ بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔ اختر کی کامیابی کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ایک عرصہ دراز تک اُردو کے نوخیز شعراء نے اُن ہی کی

پیروی کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

اختر کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آتا ہے اور وہ لفظ ہے ''سلمیٰ''۔ اِس نام نے اختؔر کی ذات اور اُن کے کلام کے ساتھ بہت سی حکایتیں، روایتیں اور داستانیں وابستہ کر دی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اِس نام کی آڑ میں اپنا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ اور بعض ستم ظریف تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اخترؔ جب رات کو ''سلمیٰ'' سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔

اخترؔ سے میری دوستی کم وبیش بیس سال تک چلتی رہی۔ میں نے اِس دوران میں اُن سے ایک مرتبہ بھی ''سلمیٰ'' کے متعلق استفسار نہیں کیا کہ یہ اُن کا سراسر ذاتی اور نجی معاملہ ہے جس میں کسی دوسرے شخص کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ایک روز اخترؔ نے خود ہی یہ قصّہ چھیڑ دیا۔ اور کسی قدر تعجّب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دوستانہ بے تکلّفی کے باوجود ''سلمیٰ'' کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا۔''

میں نے عرض کیا: ''یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے دخل درمعقولات کا کوئی حق نہیں۔ یوں بھی آپ کی نجّی زندگی کے بارے میں جستجو کرنے کی جرأت مجھے کیوں کر ہوسکتی ہے۔''

اخترؔ اِس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اور جب دوسرے روز میرے ہاں آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک کاپی تھی۔ کہنے لگے: ''یہ کاپی میری حیاتِ معاشقہ کی مکمل داستان ہے۔ اِسے ضرور ملاحظہ فرمائیے گا۔ اِس میں میرے اور ''سلمیٰ'' کے تمام خطوط موجود ہیں۔ اخفائے راز کے لیے میں نے اپنا نام کوکب رکھا ہے۔''

وہ کاپی بہت دِنوں میری میز کی دراز میں پڑی رہی۔ آخر ایک روز میں نے اُسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے صفحے پر عنوان درج تھا ''ایک شاعر کا خواب''۔ اس کے بعد کوکب اور سلمیٰ کے خطوط درج تھے۔ میں نے بمشکل چند صفحے پڑھے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوکب اور سلمیٰ کے خطوط لکھنے والی ہستی ایک ہی ہے۔ دونوں طرف بالکل ایک ہی قسم کی مجلاّ ومطلاّ عبارت درج تھی۔ وہی حسین وجمیل ترکیبیں، وہی پُرشکوہ استعارے، وہی دل آویز محاورے اور وہی مرصّع الفاظ بار بار دہرائے جارہے تھے۔ میں اخترؔ

کے اندازِ تحریر سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ جو خطوط ''سلمیٰ'' سے منسوب کیے گئے تھے وہ تمام تر اخترؔ کے اپنے لکھے ہوئے تھے۔ اخترؔ کو ایک زمانے میں فیضیؔ کے کلام سے بہت ربط رہ چکا تھا۔ چنانچہ ''سلمیٰ'' کے خطوط میں جگہ جگہ فیضیؔ کے اشعار درج تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ''شاعر کا خواب'' سراسر اخترؔ کے اپنے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کی ورق گردانی کے بعد میں نے وہ کاپی جوں کی توں دراز میں بند کر دی۔ چند روز بعد اخترؔ ملے اور کاپی کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا ''حضرت! مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔''

اخترؔ ہنس پڑے اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میرے اور اخترؔ کے درمیان ''سلمیٰ'' سے متعلق کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے اِس بات سے انکار نہیں کہ اختر کو عنفوانِ شباب میں ضرور کہیں عشق ہوا ہوگا۔ اور یہ غالباً اُسی عشق کی چنگاری تھی جس نے آگے چل کر اُن کی شاعری کو شعلوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے ''ہیر رانجھا''، ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''شیریں فرہاد'' کی طرح اختر و سلمیٰ کے عشق کی فرضی تفصیلات مرتّب کر ڈالی ہیں اور جو اخترؔ کی شاعری کے خود ساختہ نقّاد بن کر اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ فلاں نظم اُس وقت لکھی تھی جب سلمیٰ کا پہلا خط اُنھیں ملا تھا۔ فلاں نظم اُس وقت لکھی تھی جب سلمیٰ کے دشمنوں کا مزاج ناساز تھا۔ فلاں غزل اُس وقت لکھی تھی جب اختر کو سلمیٰ نے یہ ڈانٹ پلائی تھی کہ برملا اظہارِ عشق کیوں کرتے ہو اور فلاں نظم اُس وقت لکھی تھی جب اختر کی درِ جاناں پر طلبی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اخترؔ نے جب ''خیالستان'' میں ''سلمیٰ'' کا نام لے لے کر نظمیں لکھنا شروع کیں تو خلیقیؔ دہلوی نے کہ اخترؔ کے دوست بھی تھے ''خیالستان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کو ایک بڑا دلچسپ خط لکھا تھا۔ خلیقیؔ ایک خاص اندازِ نگارش کے مالک تھے جو آج سے چالیس پچاس سال قبل اُن کی اور ل۔ احمد اکبر آبادی، نیاز فتح پوری اور دل گیر اکبر آبادی کی کوششوں سے ہمارے ہاں رائج ہوا تھا۔ طرزِ تحریر سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو خلیقیؔ نے اس خط میں بعض باتیں بڑے پتے کی لکھی تھیں۔ لیکن اخترؔ نے اُنھیں قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ خلیقیؔ نے لکھا تھا:

''کچھ نوادِرادب ہیں جن پر جوانیاں حریص ہیں اور بڑھاپے ملول! مگر اے اِبن عم! یہ اقتضایائے غزل خوانی ہیں یا رعایاتِ جوانی۔ سلمیٰ موضوعِ شعری ہے یا جگر کا تبخالہ؟ یہ ہجومِ ریشم وکم خواب کوئی نظم کا بند ہے یا خروشِ دل؟ کچھ بھی ہو اِرتقائے ادبی کے لیے خوب ہے مگر میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ رابطہ پُرشور اور تعلق پُر اَز ہجوم بلا ہوگیا ہے۔ یہ مَے اب مینا

سے چھلکنے لگی ہے۔ اگر آگ نہ دبے تو کم سے کم تو دبائے چلو۔ زندگی کام کی ہوجائے گی۔ جذبات میں عُلو ہوگا۔ شعر میں ایک کیفیت ِ بالیدگی اختیار کرے گا۔ اور پھر تم ایسا کہنے لگو گے جیسا کہ ایسے لوگ کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر سیر میں گم ہوگئے، ہائے ہو میں صرف کر ڈالا تو پھر یہ سب کچھ چیخ پکار میں ختم ہوجائے گا.......... مجھے تراوشِ چشمِ محبوب ہے۔ اِس قدر بھی کہ پانی کے ساتھ خون شامل ہونے لگے۔ مگر اِس کے ساتھ یہ طلبِ دامن وآستیں نہیں بھاتی۔ تعلق پسند ہے، مگر یہ جوابِ تعلق کی جستجو محبوب نہیں! طرزِ نگارش کو حسین بنائیے۔ مگر یہ سلمیٰ سے منسوب حکایات وواردات؟''

اپریل ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے ایک روز اختؔر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ ''میرا بچہ بہت بیمار ہے اور بیوی کا اصرار ہے کہ حکیم نیرّ واسطی اُسے آکر دیکھیں۔ آپ حکیم صاحب کے بہت دوست ہیں، چل کر حکیم صاحب کو لائیے۔ میں نے سُنا ہے وہ کسی مریض کو دیکھنے اُس کے مکان پر نہیں جاتے۔''

میں نے پوچھا: ''آپ کی حکیم صاحب سے شناسائی نہیں ہے کیا؟''

بولے: ''میں صرف ایک بار اُن سے ملا ہوں۔ میر نور احمد کی اہلیہ بیمار تھیں، اُن کی نبض دِکھانا تھی۔''

میں اور اختؔر اُس شام حکیم صاحب کے دولت کدے پر چونے منڈی میں حاضر ہوئے۔ اختؔر اپنے ساتھ ''خیالستان'' کی مکمّل جلد بھی حکیم صاحب کے لیے بطورِ تحفہ لے گئے۔ حکیم صاحب اختر کے مکان پر تشریف لائے۔ بچے کو دیکھا اور نسخہ لکھ دیا۔ اِس کے بعد اختؔر اور حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے، جو روز بروز اُستوار ہوتے گئے اور انجامِ کار حکیم صاحب نے جس دردمندی وبے نفسی سے اختؔر کی خدمت کی، جس خلوصِ بے پایاں سے اختؔر کے ناز اُٹھائے اور جس ذوق وشوق سے اختؔر کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی اُس کی مثال دوستی کی دُنیا میں محال ہے۔

کئی بار ایسا ہُوا کہ اخترؔ کو اُن کے والد نے گھر سے نکال دیا تو وہ سیدھے حکیم صاحب کے دولت کدہ پر چلے گئے اور مہینوں وہاں رہے۔ جاڑوں کے موسم میں وہ شراب کے نشے میں دھت آدھی رات کو آ کر حکیم صاحب کو جگا دیتے تھے۔ حکیم صاحب اُٹھ بیٹھتے اور اُسی وقت اخترؔ کے لیے پلنگ اور بستر تیار کیا جاتا اور جب تک اخترؔ آرام سے نہ سو جاتے تھے حکیم صاحب جاگتے رہتے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اخترؔ کے دوستوں میں سے کوئی شخص اِس ایثار، حوصلے اور خندہ پیشانی سے اخترؔ کی ناز برداری کرنے کو تیار نہ تھا۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں ایک روز میں نے اور اخترؔ نے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی تجویز سوچی۔ اخترؔ گزشتہ آٹھ دس سال میں یکے بعد دیگرے تین رسالے ''انتخاب''، ''بہارستان'' اور ''خیالستان'' نکال کر بند کر چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ اُن سے بدظن ہو چکے ہیں اور اب کسی نئے رسالہ کی خریداری قبول نہیں کریں گے۔ اِس لیے اُن کی خواہش تھی کہ اگر ہم نے نیا رسالہ جاری کیا تو سرِورق پر صرف میرا یعنی راقم التّحریر کا نام بطور ایڈیٹر کے درج ہونا چاہیے۔ مجھے اُن کی اِس رائے سے اختلاف تھا۔ اِس لیے کہ اخترؔ شیرانی کے نام میں ایک ایسا جادو تھا کہ ہزار بدگمانیوں کے باوجود لوگ اس رسالہ پر ٹُوٹ ٹُوٹ گرتے تھے جس کے ایڈیٹر اخترؔ ہوں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سرِورق پر ہم دونوں کے نام ہوں گے۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں ''رومان'' کا پہلا پرچہ نکلا، جس میں اخترؔ کی دو مشہور نظمیں ''بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ'' اور ''نشیدِ آغاز'' شائع ہوئیں۔ میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اخترؔ شیرانی کے نام کی وجہ سے رسالہ بے حد مقبول ہوا۔ پہلا پرچہ دو ہفتے کے اندر ختم ہو گیا اور ایجنٹوں کے تقاضے شروع ہو گئے کہ اور پرچہ بھیجیے۔

اُس زمانے میں آغا حشرؔ کاشمیری بھی لاہور میں مقیم تھے اور اُنھوں نے ریس کورس روڈ پر ایک کرایہ کی کوٹھی لے رکھی تھی۔ میں اور اخترؔ رومان کا پہلا پرچہ آغا حشرؔ کی خدمت میں پیش کرنے اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوئے تو اُنھوں نے بڑی مسرّت سے یہ ادبی تحفہ قبول فرمایا اور دیر تک ''رومان'' کے مضامین نظم و نثر پر نظر ڈالتے رہے۔ رسالہ کے سرِورق پر اخترؔ کا شعر درج تھا:

ذرے ذرے کا دل اِک محشرِ نظارہ ہے　　ساری دنیا مرے رومان کا گہوارہ ہے

آغا یہ شعر پڑھ کر چیں بہ جبیں ہوئے اور کہنے لگے: ''بہت بھدّا شعر درج کیا تم نے۔ کس کا شعر ہے یہ؟''

اخترؔ جھینپنے والی اسامی تو نہ تھے لیکن آغا کے اِس فقرے کے سامنے وہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ میں نے عرض کیا: ''اختر کا شعر ہے۔''

آغا نے اپنے قلم سے وہ شعر کاٹ دیا اور فرمایا: ''آئندہ یہ شعر درج کرو۔'':

کہو زاہد سے کیوں ہے اِس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیلِ اخترؔ میں

چنانچہ جب تک رومان جاری رہا آغا حشرؔ کا یہ عطیہ رسالے کے سرِ ورق کی زینت بنا رہا۔
''رومان'' کو جاری ہوئے بمشکل دو مہینے گزرے تھے کہ ایک روز اخترؔ نے یونہی باتوں باتوں میں کہا کہ ''مائرؔ نے کلکتہ سے ایک نظم بھیجی ہے جس میں اُنھوں نے علاّمہ اقبال کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔''

میں نے بغیر نظم دیکھے ہوئے کہہ دیا کہ ''اِس قسم کی چیزیں ''رومان'' میں ہرگز شائع نہیں ہوں گی۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ میر نور بخش مائرؔ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے۔ اچھّے خوش حال آدمی تھے۔ شعر بھی اچھے خاصے کہتے تھے اور اخترؔ کے بڑے عزیز دوست تھے۔ میں نے مائرؔ کو آج تک نہیں دیکھا۔ اُس زمانے میں وہ سخت قسم کے کانگریسی خیال کے آدمی تھے۔

جولائی کا پرچہ شائع ہو کر جب میرے ہاتھ میں پہنچا تو اُسے دیکھتے ہی میرا رنگ فق ہوگیا۔ مائرؔ کی وہ نظم بڑی آب وتاب سے اس میں موجود تھی جس کا عنوان تھا:

علاّمہ اقبال کے نام ---------- ایک وطن پرست کا پیغام

''بالِ جبریل کو دیکھ کر''

جب میں نے پوری نظم پڑھی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اب میری اور اختر کی خیر نہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جائے گا۔ رُبع صدی کی پُرانی بات ہے تاہم اس نظم کا ایک بند یہاں درج کرتا ہوں:

تجھے فلسطین و قُرطبہ سے بڑی محبت ہے، جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اُسی نے پالا ، اُسی نے پوسا، اُسی نے بخشی تجھے جوانی
تُو دل کی آنکھوں سے دیکھ اِن کو ، یہ کارنامے ہیں مخلصانہ
اگر یہ جنّت ہے، جنّتی تُو ، اگر ہے دوزخ ، ہے دوزخی تُو
یہ قول ہے قولِ عاشقانہ ، یہ راز ہے رازِ محرمانہ
وطن اسیر و غلام تیرا، کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے، تری خموشی ہے مجرمانہ
زبان کھولے کہ چُپ رہے تُو ، جو کام ہونا ہے، ہو رہے گا
وطن پرستوں میں یہ خموشی بنے گی نفرت کا تازیانہ
مثالِ فکرِ فرنگ تُو نے دِلوں کو درسِ ہوس دیا ہے
تجھے فقیری سے واسطہ کیا کہ روح تیری ہے قیصرانہ
وہ خون آشام، تیرا شاہیں، کبوتروں کی ہوس ہے جس کو
وہ خون رکھنے کا گرم جس کو ملا ہے کیا خوب اِک بہانہ
بلائے قوت ہے تیری حکمت، جسے تلاشِ شکار ہر دم
کبھی یہ ضربِ نپولین ہے، کبھی بہ طرفِ سکندرانہ

نظم چھپتے ہی لاہور کے اخباروں میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم پر چاروں طرف سے گالیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ میں نے اختر سے کہا کہ اب کم از کم دو ہفتے گھر سے باہر نہ نکلنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ وہ بدستور ہنستے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما تو ہماری جان میں جان آئی۔

مجھے شرم کے مارے علّامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ حُسنِ اتفاق

سے مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی لاہور تشریف لائے۔ وہ میرے شفیق و مہربان اُستاد تھے، اور کرم فرما دوست بھی تھے۔ مولانا کا قاعدہ تھا کہ جتنے دن لاہور میں قیام فرماتے، روزانہ شام کو دو گھنٹے علّامہ مرحوم کے پاس بسر کرتے تھے۔ میں نے مولانا سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھیں اس واقعہ سے سخت افسوس ہوا۔ تاہم اُنھوں نے ایک شام میری موجودگی میں ڈاکٹر صاحب سے میری بے گناہی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور مجھے اطمینان ہوا۔

''رومان'' تقریباً تین سال جاری رہا۔ دفتر اخترؔ کے مکان میں تھا۔ رسالہ کی ترتیب و تدوین کا کام ہم دونوں کر لیتے تھے۔ صرف ایک چپراسی ملازم رکھا ہوا تھا جو ڈاک خانے، مطبع اور دفتری کی دُکان کے چکّر کاٹتا رہتا تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ سیاسی مصروفیتوں نے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اِدھر اخترؔ کی شراب نوشی میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ سارا انظام بگڑ کر رہ گیا۔ پہلے تو پرچہ کی اشاعت میں بے قاعدگی پیدا ہوئی، پھر خریدار ٹوٹنے شروع ہوئے اور آخر میں ایجنٹوں نے پیسے بھیجنے بند کر دیے۔ چنانچہ تین سال کی مختصر سی زندگی کے بعد ''رومان'' نے بھی عدم کی راہ لی۔

اِس تین سال کے عرصے میں اخترؔ کی بعض بے نظیر نظمیں ''رومان'' میں چھپیں۔ مثلاً ''بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ''، ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر''، ''آج کی رات''، ''آنسو''، ''چلی گئیں''، ''بعض رومانی لمحات کی یاد''، ''چودھویں سالگرہ کا تحفہ'' اور ''شاعر کی تُربت''۔

اخترؔ کی شاعری کا آفتاب نصف النّہار پر تھا۔ اگرچہ ''اے عشق کہیں لے چل''، ''تیتری''، ''او دیس سے آنے والے بتا''، ''ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے''، ''وکٹوریہ میموریل میں''، ''بستی کی لڑکیوں میں''، ''اے سرزمین گجرات'' اِس سے قبل شائع ہو کر ہندوستان بھر میں ایک تہلکہ مچا چکی تھیں۔ لیکن اب اخترؔ کی شاعری میں عیش و طرب کے نغمے کی بجائے آہستہ آہستہ المیہ عنصر بڑھ رہا تھا۔ جس نے اُن کے کلام میں ایک میٹھا درد پیدا کر دیا تھا۔

''اے عشق ہمیں برباد نہ کر'' جب رومان میں شائع ہوئی تو ایک دوست نے کلکتہ سے خط لکھا کہ خدا کے لیے ایسی دردناک نظمیں شائع نہ کیجئے۔ روتے روتے ہمارا بُرا حال ہوگیا ہے۔

اِس نظم کے سولہ بند ہیں۔ آئیے ہم اور آپ دو ایک بند مل کر پڑھیں:

آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذبِ نہاں پر رو دینا
آہنگِ طرب پر جُھک جانا، آوازِ فغاں پر رو دینا
بربط کی صدا پر رو دینا، مُطرب کے بیاں پر رو دینا
احساس کو غم بنیاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
وہ راز ہے یہ غم آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں، آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا دل کو بھا جائے تو کوئی خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ رنگ اُردو شاعری میں موجود نہیں تھا۔ اختؔر شیرانی نے اِس کی ابتدا کی اور اُنھیں کے ساتھ اِس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ ''بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ'' کے دو بند ملاحظہ فرمائیے:

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں
فضائے روضۂ جنّت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیّت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیّت بُھلا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے
خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دی ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے
دمِ اخیر تو غم سے چُھڑا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

یہ صحیح ہے کہ اخترؔ کے ہاں عشق کا وہ رچا ہوا سوز وگداز نہیں، جس نے میرؔ کے شعر کو نشتر بنا دیا تھا۔ وجہ غالباً وہی ہے جس کی طرف خلیقیؔ دہلوی نے اپنے خط میں اشارہ کیا تھا۔ اخترؔ نے عشق میں وہ ریاض نہیں کیا جو میرؔ نے کیا تھا۔ زندگی کی بھٹّی میں پڑ کر اخترؔ کے حواس درد سے کراہتے ضرور رہے تھے لیکن اُن کی رُوح اس آگ میں جل کر اور پگھل کر خاکستر نہ ہو سکی۔

''رومان'' ہی کے زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ اخترؔ اور میں بھی وہاں مدعو تھے۔ لاہور میں کشمیری پنڈتوں کے چند خاندان آباد تھے۔ مشاعرے میں عین ہمارے سامنے انھی پنڈتوں کے گھرانے کی ایک نوجوان خاتون بیٹھی تھیں۔ کشمیری پنڈتوں کے حُسن کا جواب تو یورپ میں بھی نہیں۔ اخترؔ بے چارے اُس خاتون کو دیکھ کر مسحور سے ہو گئے تھے اور نگاہیں اُس طرف سے ہٹاتے ہی نہ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: ''طبیعت بے قابو ہو رہی ہے۔''

میں نے عرض کیا: ''کچھ پروا نہیں۔ کان شاعر کی طرف رکھیے اور آنکھ پنڈتانی کی طرف۔''

جب مشاعرے کی نشست بہت طویل ہوگئی تو وہ خاتون اُٹھ کر چلی گئیں۔ چند روز بعد اخترؔ ملے تو اُنھوں نے ایک نظم سُنائی جو اُس محفل کی یاد میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظم اخترؔ کی بڑی پیاری نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

سرشار آنکھ، نیند کی مستی، خمارِ حُسن
لاکھوں شراب خانے لُٹا کر چلی گئیں
یوناں کے شوخ و شنگ کماں دار کی طرح
ننھا سا ایک تیر چلا کر چلی گئیں
کعبے کا راستہ مرے دل سے بُھلا دیا
بیت الصّنم کی راہ دکھا کر چلی گئیں
رنگیں لباس کی نظر آشوبیاں نہ پوچھ

محفل پہ اپنا رنگ جما کر چلی گئیں
کب آئیں، کب گئیں، مجھے اختؔر خبر نہیں
ہاں اتنا ہوش ہے کہ بس آ کر چلی گئیں

اختؔر نے اپنی مشہور نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' ۱۹۲۹ء میں لکھی تھی۔ اُنھی دِنوں لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں مولانا تاجورؔ کے اہتمام سے مشاعرہ ہوا جہاں اختؔر کی فرمائش پر نازشؔ رضوی نے یہ نظم ترنّم سے سُنائی۔ نازشؔ کی بھی جوانی کا زمانہ تھا اور اُن کی آواز میں بلا کا جادو بھرا ہوا تھا۔ اختؔر کی نظم اور نازشؔ کا ترنّم ان دونوں چیزوں نے محفل کی محفل کو مدہوش کر دیا تھا۔ اِس نظم نے اختؔر کی شہرت کو بجلی کے پر لگا کر ہندوستان بھر میں پھیلا دیا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں لاہور کے تانگے والے بھی اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر بلند آواز میں الاپتے تھے:

''اے عشق کہیں لے چل۔''

۱۹۳۳ء کے آخر میں اختر نے ''او دیس سے آنے والے بتا'' لکھی جسے دیکھ کر بڑے بڑے ''کافروں'' کو بھی اختر کی شاعری پر ایمان لانا پڑا۔ لاہور کے بعض نوجوانوں کو یہ نظم پوری حفظ تھی۔ میں نے ایک منتخب محفل میں گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم کو جو بعد میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے آئی۔سی۔ایس ہو گئے تھے یہ نظم زبانی سُناتے ہوئے دیکھا تھا۔

اختؔر اپنے کلام پر بڑی محنت کرتے تھے۔ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے ہفتوں پہلے وہ اپنے خیالات کا تانا بانا دماغ میں تیار کرتے رہتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال کا اُنھیں حیرت انگیز سلیقہ تھا۔ اُن کی نظمیں ''تیتری''، ''برکھارت''، ''(مسوری جاتے ہوئے)''، ''وادیٔ گنگا میں ایک رات'' اور ''انتظار'' اُن کی قادر الکلامی کا ادنیٰ ثبوت ہیں۔

ابھی دو مہینے ہوئے اِٹلی میں بائرنؔ کے مجسّمے کی نقاب کشائی کی رسم ادا کی گئی تھی تو انگلستان کی فضا پھر سے بائرنؔ کے نام سے گونج اُٹھی تھی۔ اور لندن کے اخباروں میں بائرنؔ کی شاعری پر دھڑا دھڑ مقالے چھپنے لگے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ اگر اس ملک کے باشندے اُردو سے واقف

ہوتے تو میں بائرنؔ کے کلام کے پہلو بہ پہلو اخترؔ کی چند نظمیں رکھ کر اُن لوگوں سے پوچھتا کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ جذبات نگاری اور جوشِ بیان کے اعتبار سے اخترؔ کے سامنے بائرنؔ کا کیا مقام ہے۔

اگر کبھی کسی دیانت کیش مؤرخ نے ادبِ اُردو کی تاریخ لکھتے وقت پنجاب کے موجہاتِ عظمت بیان کیے تو پانچ باتوں کو کبھی نظرانداز نہیں کر سکے گا۔ اوّل یہ کہ آزادؔ اور حالیؔ نے کرنل ہالرائیڈ کے زیرِ ہدایت لاہور میں جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ دوم یہ کہ اقبالؔ نے قومی شاعری کا وہ صُور پھونکا جس نے پورے ہندوستان کے تن مُردہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ سوم یہ کہ شیخ عبدالقادر نے لاہور سے ''مخزن'' جاری کر کے پہلی مرتبہ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اُردو ادب کا شوق پیدا کیا تھا۔ چہارم یہ کہ مولانا ظفرعلی خاں نے اُردو میں ایک ایسی ہنگامی شاعری کو رواج دیا تھا جس کے وہ اِمام بلکہ پیغمبر تھے اور ہندوستان بھر میں کوئی شخص اِس فن میں اُن کا حریف نہ بن سکا۔ پنجم یہ کہ لاہور سے اخترؔ شیرانی کی رومانی شاعری کا آفتاب طلوع ہوا۔ جس سے پورے ہندوستان کے در و دیوار جگمگا اُٹھے تھے اور اِس صنف میں کوئی شخص اخترؔ کا ہم پلہ ثابت نہ ہوا۔

۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی ملازمت کی میعاد پوری ہوگئی تو وہ اپنے کُنبے کو لے کر جس میں اخترؔ کے بیوی بچے بھی شامل تھے ٹونک چلے گئے۔ لیکن اخترؔ بدستور لاہور میں پڑے رہے۔ فلیمنگ روڈ کا مکان چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور اخترؔ اب شاہ ابوالمعالی کے قبرستان کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے شراب ترک کر رکھی تھی۔ اِس لیے ظاہری وضع قطع بہت اچھی ہوگئی تھی۔ روزانہ حجامت بناتے اور غسل کرتے تھے۔ کپڑے بھی نسبتاً صاف سُتھرے پہننے لگے تھے۔ گفتگو میں متانت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ میں چند مرتبہ اُس مکان میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ کھانا دونوں وقت کسی دوست کے ہاں سے آتا تھا۔

دو ایک مہینے گزرنے پائے تھے کہ اخترؔ نے مولانا تاجورؔ کے رسالہ ''شاہکار'' کی ایڈیٹری قبول کر لی۔ اِس خبر سے اخترؔ کے تمام دوستوں کو افسوس ہوا۔ بالخصوص اُن کے والد کو تو سخت رنج پہنچا۔ مولانا تاجورؔ نے گزشتہ کئی سال سے حافظ محمود شیرانی کے خلاف جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور تعلقات کی کشیدگی کا

یہ عالم تھا کہ حافظ صاحب اور مولانا تاجورؔ کے درمیان سلام وکلام کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ بہر حال ملازمت کا یہ تعلّق بمشکل سال بھر نبھ سکا۔ اور پھر اخترؔ بھی ٹونک چلے گئے۔

۱۹۴۸ء میں وہ یکا یک لاہور آ گئے اور حکیم صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ میں ملاقات کو گیا تو دیکھا کہ بہت کچھ بدل چکے تھے۔ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتے تھے اور گفتگو میں کوئی ربط یا سلیقہ نہیں تھا۔ کہنے لگے ''میں کسی روز آپ سے ملنے ماڈل ٹاؤن آؤں گا۔'' میں نے عرض کیا: ''سر آنکھوں پر، آئیے۔ اِس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی۔

چنانچہ وہ ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے مکان پر تشریف لے ہی آئے۔ بوتل اُن کی جیب میں تھی۔ کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجّب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا: ''یہ بدعت کب سے شروع کی ہے؟'' کہنے لگے: ''فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا۔ اِس لیے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔'' پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یکا یک کہنے لگے: ''اب زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ آپ نے بھی تو زندگی کا اُتار چڑھاؤ خوب دیکھ لیا ہے، چلیے اب آگے چلیں۔'' میں نے ہنس کر غالب کا یہ شعر پڑھ دیا:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مُجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

شعر سُن کر آبدیدہ ہو گئے اور زار زار رونے لگے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ستمبر کے اوائل میں میں لاہور سے باہر سفر میں تھا کہ اچانک اخبار میں دیکھا کہ اخترؔ شیرانی سخت بیمار ہیں اور اُنھیں بے ہوشی کے عالم میں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ میرے دل نے بے اختیار گواہی دی کہ اب اخترؔ زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ تیسرے ہی روز اُن کی موت کی خبر پڑھ لی۔

اخترؔ کے مرض الموت میں حکیم صاحب نے جس محبّت وشفقت اور خلوص ومودّت سے اخترؔ کا علاج کیا اور جس دردمندی سے راتوں کو جاگ جاگ کر اختر کی تیمارداری کی اُس کی مثال اِس خودغرض وجفاپیشہ دنیا میں ملنی محال ہے۔ راہِ وفا میں حکیم صاحب جیسا ثابت قدم دوست مشکل ہی سے ملے گا۔ اُنھوں

نے اپنا مکان، اپنا آرام، اپنا روپیہ سب کچھ اخترؔ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب بھی وہ سال بہ سال اخترؔ کی یاد میں ایک محفلِ سوز و ساز منعقد کرتے ہیں جہاں شعر و نغمہ کی روحانی غذا کے علاوہ حاضرین کے کام و دہان کی تواضع بھی نہایت پُرتکلّف کھانے سے کی جاتی ہے۔

دنیا کے ہر بڑے فن کار کے آرٹ کی طرح اخترؔ کی شاعری کو بھی شہرت و گمنامی کے مختلف ادوار میں سے گزرنا پڑے گا۔ اِس لیے مجھے یہ سُن کر چنداں حیرت نہیں ہوئی کہ آج ہمارے ملک کے لوگ اخترؔ کو بھولتے جا رہے ہیں۔ غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے اساتذہ بھی شہرت و گم نامی کے اِس مدوجزر سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ دلیل اپنی جگہ درست سہی کہ وہ سماجی پس منظر جس میں اختر کی رومانی شاعری کو فروغ حاصل ہوا تھا باقی نہیں رہا۔ لیکن میں اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل موجود ہے اور اس میں محبّت کی حرماں نصیبی اور عشق کی سوختہ سامانی کی ٹیسیں اُٹھتی ہیں، اختر کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ خود اخترؔ کی پیش گوئی موجود ہے:

جب تلک عشق کے ہونٹوں پہ فغاں باقی ہے
میرے نغموں کا زمانے میں نشاں باقی ہے

مُدّت ہوئی جب میں لاہور میں تھا اور کبھی کبھار فلیمنگ روڈ سے گزرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو آنکھیں بے اختیار اُس بالا خانہ کی طرف اُٹھ جاتی تھیں جہاں اخترؔ نے اپنی زندگی کے بیس سال گزارے تھے اور جہاں سے رومانی شاعری کا وہ آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی ضیا پاشیوں نے کشمیر سے لے کر مدراس تک پورے برِّعظیم کو منوّر کر دیا تھا۔ خدا جانے اب اُس مکان میں کون رہتا ہے اور وہ اخترؔ کے نام سے بھی واقف ہے یا نہیں!

سَلَامٌ عَلٰی نَجْدٍ وَّ مِنْ حَلَّ بِالنَّجْدِ

(''چند یادیں چند تاثرات'')

❁❁❁❁❁❁

ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید

اخترؔ شیرانی

اخترؔ شیرانی کیا تھا۔کھویا کھویا سا اِک جوانِ خموش۔مشاعرے میں آتا تو شراب کے نشے میں مدہوش۔جھومتا جھامتا،لڑکھڑاتا،کلام سُناتا تو ٹھہر ٹھہر کر اور وہ بھی نامکمل۔لیکن شاعری میں ایسا نام پایا کہ اپنے دَور کے بڑے بڑے شاعروں کو پچھاڑ دیا۔وہ اُردو زبان کے قد آور محقق حافظ محمود شیرانی کا فرزند تھا لیکن باپ سے مختلف مزاج اور ذوق پایا تھا۔دو ہی مشغلے تھے۔شاعری اور شراب نوشی۔کہتے ہیں کہ جب احباب کے ساتھ مل کر شراب کی محفل آراستہ کرتا تھا تو پہلے کمرے کے فرش اور دیواروں پر شراب کا ہلکا چھڑکاؤ کرتا تھا تاکہ ایک خاص فضا پیدا ہو جائے۔اِس عادت سے محرومی کی وجہ سے میں اُن کے زیادہ قریب نہ آسکا لیکن مجھے اِتنا معلوم ہے کہ شراب کی حاجت اُنھیں کس قدر بے چین کر دیتی تھی۔میں ایک سرکاری ہفت روزے کی ادارت کے زمانے میں معاوضے پر اُن کی نظمیں چھاپا کرتا تھا۔ایک دفعہ معاوضہ لینے آئے۔معلوم ہوا کہ ابھی بل پاس نہیں ہوا۔وہ رو پڑے،کہنے لگے:”میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔اِس پر میں نے مجبوراً اُنھیں دفتر سے پیشگی رقم دلا دی۔افسوس،اِسی شرابِ خانہ خراب نے اُنھیں عین عالم شباب میں موت سے ہم کنار کر دیا۔

بیسویں صدی کی تیسری تہائی کا آغاز ہوا تو اُردو شاعری میں حقیقت پسندی کا رجحان زیادہ ہمہ گیر انداز میں اُبھرا۔اِس حقیقت پسندی نے دو روپ لیے۔ایک،جسے ترقی پسندی کا نام مِلا،دوسرا،جو رومانیت کے نام سے مشہور ہوا۔ترقی پسند شعراء نے سرمایہ و محنت کی آویزش اور عوام کی معاشی تمنّاؤں اور آرزوؤں کو شعر و شاعری کا موضوع بنایا اور رومانیت کے علم برداروں نے کلاسیکی محبوب اور کلاسیکی عشق کو چھوڑ کر ایک نئے انداز کے واشگاف رومان کو رواج دیا۔اِس تحریک کے علمبردار اخترؔ شیرانی تھے۔اُردو

شاعری میں محبوب کی جنس کو ملفوف رکھا جاتا تھا اور اگر باہر لایا جاتا تو اس سے یا تو امرد پرستی مترشح ہوتی، یا طوائف پرستی۔ اختر شیرانی نے عورت سے عشق کو موضوع بنایا اور عورت بھی ایسی، جو معاشرے میں عام نظر آتی تھی۔ پُرانی شاعری میں ''غزل'' کے لغوی معنی تو عورت سے خطاب تھا لیکن تانیث سے بڑی احتیاط سے گریز کیا جاتا تھا۔ اختر شیرانی نے عورت کو کھلم کُھلا خطاب کیا۔ غزل میں، گیت میں، نظم میں، وہ محبت کا اظہار ملفوف انداز میں نہیں، واشگاف انداز میں کرتے تھے اور احساسات کی شِدّت اور خواہشات کی حقیقت کو منظرِ عام پر لانے میں کوئی حجاب روا نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت غنائیت تھی۔ حفیظؔ جالندھری نے ''نغمہ زار'' اور ''سوز و ساز'' میں غنائیت کو پروان چڑھایا لیکن یہ نقطۂ عروج کو پہنچی تو اخترؔ شیرانی کی شاعری میں۔ رومان سے اُن کا اِتنا گہرا تعلّق تھا کہ ایک ادبی مجلّہ نکالا تو اُس کا نام بھی ''رومان'' رکھا اور برسوں یہ رسالہ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۴۶ء اِس اعتبار سے اخترؔ شیرانی کے لیے خوش نصیبی کا سال تھا کہ ایک سال کے اندر اندر اُس کے کلام کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آگئے۔

آج کے زمانے میں فلمی گیت زبان زدِ عام ہو جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں شاعروں کا کلام زبان زدِ عام ہوتا تھا۔ اقبالؔ تو خیر بہت بڑے شاعر تھے۔ قوم کو جگانے والے اور اُبھارنے والے شاعر تھے اِس لیے اُن کا کلام تو مقبول ہونا ہی تھا۔ حفیظؔ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' بھی اپنے زمانے میں خوب ہر دلعزیز ہوا۔ اس میں شعری محاسن تو ٹانواں ٹانواں تھے لیکن اسلام سے محبّت کی بنا پر اور ماضی کی یاد کے حوالے سے اِسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ اخترؔ شیرانی پہلے رومانی شاعر تھے جن کی بعض نظموں نے لوک گیتوں کی طرح قبولِ عام پایا۔ مثلاً:

'او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا، کس حال میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن، ایمانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا

❁❁❁❁❁❁

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے، اِس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل
آنکھوں تلے پھرتی ہے، اِک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا
جنّت کی طرح روشن، شاداب نما دنیا
للہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

احساسات کے واشگاف اظہار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

روپہلی چاندنی نے رات کو کُھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے
سُنہری دھوپ کی کِرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مُشکیں بہار دیکھا ہے
سُنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے
مِری آغوش میں ہو گا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے سرمئی کاکل، وہ روئے نازنیں اُس کا

وہ رخسارِ حسین اُس کے، وہ حُسنِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
تمنّا و حیا کی کش مکش کیوں کر مِٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گُدگُداؤں گا
اور اُس کے لعل لب سے کس طرح بوسے چُراؤں گا
وہ پھُولوں اور ستاروں کو بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

سلمیٰ کون تھی، جس کا نام اختؔر شیرانی نے بار بار لیا ہے۔ کہتے ہیں وہ گجرات کی ایک لڑکی تھی جس سے اختر کو بے حد پیار تھا لیکن اختؔر نے کسی ایک کا نام تو نہیں لیا۔ عذرا اور ریحانہ سے محبّت کے گیت بھی گائے اور ایک نظم ''میری داستانِ حیات'' میں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کے علاوہ نسرین، پروین، شمسہ، ثُریا، ناہید کے نام بھی لیے! اختر شیرانی اپنے دَور کے نوجوانوں میں اِتنے مقبول تھے کہ ہر نوجوان نے اُن سے اثر قبول کیا۔ وہی عورت سے خطاب، وہی غنائیت، وہی واشگاف اندازِ محبت۔ وہی رومان پروری!

(''وے صورتیں اِلٰہی'')

۞۞۞۞۞۞

میرزا ادیب

برگِ آوارہ

آپ تو جانتے ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

جی نہیں ۔ یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے ۔آپ اختر شیرانی ہی ہوں گے؟ ہمیں کیا؟ اُردو ادب کی تاریخ میں آپ کا نام ضرور دیکھا ہے، مگر ادب کی تاریخ میں تو ہزاروں ناموں کے تذکرے مل جاتے ہیں ۔ اِس میں آپ کو کیا اِمتیاز حاصل ہے؟ اچھا تو آپ اختر شیرانی ہیں ۔خیر آپ تشریف لے ہی آئے ہیں تو ماضی کے ان گوشوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں جن میں یادوں کی ایک وسیع دُنیا آباد ہے ۔

اختر شیرانی! آج آپ فرماتے ہیں ۔آپ تو جانتے ہی ہوں گے مجھ کو، اِس لہجے میں اپنی ذات پر وہ گہرا اعتماد نہیں ملتا جو ادب کی ایک آفاقی شخصیت سے قدرتاً وابستہ ہوتا ہے ۔آپ کو کہنا چاہیے تھا:'' آپ مجھے جانتے ہیں ۔ یہ جانتے ہوں گے کیوں؟ اُردو کے معمولی شاعروں نے بھی اپنے بارے میں وہ دعوے کیے ہیں کہ اگر اِن دعووں میں ذرہ برابر بھی صداقت ہوتی تو آج اُن کے نام تاریخ کے صفحات پر ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوتے، مگر یہ نام تو بے نور ہو چکے ہیں ۔شاعرانہ اَنا تو ہر شاعر کے لیے جائز سمجھی جاتی ہے اور آپ تو تھے ابو المعانی اختر شیرانی الافغانی اور آغا حشر کاشمیری نے آپ ہی کے متعلق تو کہا تھا:

کہو زاہد سے کیوں ہے اِس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

یہ شعر آپ کے ادبی ماہنامے ''رومان'' کی پیشانی پر چمکتا رہتا تھا ۔

یہ درست ہے کہ آج لوگ آپ کو نہیں جانتے اور جانتے بھی ہیں تو بہت کم جانتے ہیں، مگر آج

سے پینتیس چھتیس برس پیشتر آپ حقیقی معنوں میں اُردو کے نہایت مقبول شاعر تھے۔ اور آپ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ آپ جدھر سے بھی گزرتے تھے اُردو اَدب کے عام قارئین بالخصوص نوجوان طالب علم اور طالبات کا ایک ہجوم آپ کی طرف اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہتا تھا: ''وہ جاتے ہیں اختر شیرانی۔'' میرا خیال ہے جو مقبولیت اُس دَور میں آپ کو حاصل تھی وہ موجودہ دور میں شاید فلمی ستاروں ہی کو ملی ہے۔ لوگوں نے آپ کے باب میں عجیب عجیب رومانی تصوّرات قائم کر رکھے تھے، اختر شیرانی اور سلمیٰ۔ دو نام اپنے اندر کیسی سحر انگیز کشش رکھتے تھے۔ موجودہ نسل اس سے بہت کم واقف ہے۔

ہاں تو اُس دور میں پوچھتے تھے یہ سلمیٰ کون ہے؟

کہنے والے کہتے تھے یہ ایک تصوراتی شخصیت ہے۔ مادی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں، لیکن جب سلمیٰ کے نام کے ساتھ ''رومان'' میں اور ''رومان'' سے پہلے ''خیالستان'' میں اِس قسم کی باتیں شائع ہوئی تھیں ''سلمیٰ کی فرمائش پر''، ''سلمیٰ کی صحت یابی پر'' تو کہنے والے یہ کہنے لگے تھے: ''نہیں یار! یہ کوئی خیالی ہستی نہیں ہے، اس کا اپنا وجود مادی دُنیا میں پایا جاتا ہے اور اختر شیرانی نے ایک رات کسی وادی میں اپنی سلمیٰ کے ساتھ ملاقات کرنے سے پیشتر یہ شعر کہا تھا:

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

اختر شیرانی! اُس دَور میں کیسے کیسے تصوّرات آپ کی رومانوی شخصیت کے گرد بنے ہوئے تھے۔ آج کتنے لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں؟

مجھے خوب یاد ہے جب آپ کی نظم ''سلمیٰ سے دل لگا کر بدنام ہو رہا ہوں'' چھپی تھی تو دنیائے ادب میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ لڑکے آپ کی یہ نظم پڑھتے تھے اور کسی ایسی لڑکی کو اپنی سلمیٰ تصوّر کر لیتے تھے جو کسی تقریب میں ایک آدھ جھلک دِکھا کر غائب ہو گئی تھی یا جسے وہ صبح سویرے اپنے محلّے میں سے اسکول یا کالج کو جاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ اس لڑکی سے اُنھوں نے دل لگا لیا تھا اور اب خیال ہی خیال میں بدنام ہو رہے تھے۔ دوسری طرف لڑکیاں تھیں جو اس رسالے کو خرید لائی تھیں جس میں یہ نظم چھپی تھی۔ یہ رسالہ اُن کے تکیوں کے نیچے چُھپا ہوتا تھا۔ جب کمرے میں کوئی نہیں ہوتا تھا تو نازک نازک ہاتھ تکیوں کو

کھسکا کر رسالے کو نکالتے تھے اور مدھم سُروں میں یہ شعر گائے جاتے تھے:

سلمیٰ سے دل لگا کر بدنام ہو رہا ہوں

اور ان ہی لمحوں میں وہ کسی شاہد، محمود، سلیم یا ارشد سے پوچھتی تھیں:

تم کون ہوتے ہو ہمیں بدنام کرنے والے

اس کا جواب نہیں ملتا تھا کیونکہ عین اُسی وقت دروازے میں سے کوئی اندر آجاتا تھا اور رسالہ فوراََ تکیے کے نیچے چلا جاتا تھا۔

میں یہ واقعہ بھول نہیں سکتا کہ جس زمانے میں آپ کی مشہور ترین نظم ''اے عشق کہیں لے چل،، کسی ہفت روزہ پرچے میں چھپی تھی تو ایک ہا کر نے مجھے روک کر کہا تھا: ''یہ پرچہ ضرور خرید یے، اِس میں اختر شیرانی کی بہت ہی اچھی نظم چھپی ہے۔'' نوجوان اور بوڑھے بھی گھروں کے اندر یہ نظم گنگناتے رہتے تھے۔

اے عشق! کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے

یہ نظم میرے اسکول کے اُستاد اور ن۔م۔راشد کے ماموں وحید گیلانی کے رسالے ''قوسِ قزح،، میں بڑی تزئین کے ساتھ چھپی تھی۔اُس دَور میں آج کے ن۔م۔راشد، راشد وحیدی کہلاتے تھے۔

یہ نظم اشاعت پذیر ہوتے ہی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔اگر میں یہ کہوں کہ اس نظم کو طوفانی مقبولیت حاصل ہوئی تھی تو اِس میں قطعاََ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا! یہ اُس دَور کا ذکر ہے جب اُردو شاعری کی ساری فضا پر علامہ اقبال کا گہرا سایہ پھیل چکا تھا اور پھیلتا ہی چلا جارہا تھا۔اِس گہرے سائے میں کوئی شاعر اپنی شاعری کی قندیل لے کر بلند ہونے کی کوشش کرتا تھا تو تھوڑی مُدّت بعد ہی یہ شاعری کی قندیل محض ایک جگنو بن کر پُرفشاں نظر آتی تھی۔لیکن اِس ماحول میں ایک قندیل ایسی بھی تھی جو مسلسل نور فشاں تھی۔جو برابر روشنی بکھیر رہی تھی۔جو اس طویل سائے سے بالکل بے نیاز تھی۔یہ قندیل آپ کی شاعری تھی۔

اختر شیرانی! اُس زمانے میں آپ کی شاعری ایک ایسی آواز بن گئی تھی جو اقبال کی گھن گرج

میں بھی گونج رہی تھی۔ رات دن گونجتی رہتی تھی۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک نے ایسے رجحانات کو ہوا دی جو رومانوی عناصر سے کسی صورت میں بھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ اپنی شاعری کے مزاج کے اعتبار سے نہ صرف رومانی شاعر تھے، بلکہ سب سے بڑے رومانی شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اس تحریک نے آپ کی مقبولیت پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا، لیکن آپ بدستور اپنے رنگین خوابوں کے غبارے بنا بنا کر دنیائے ادب کی فضاؤں میں چھوڑتے رہے۔ آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی اس تحریک کا ساتھ نہ دیا۔ اسی زمانے میں آپ نے وہ نظم لکھی جس کا عنوان تھا: ''او دیس سے آنے والے بتا'' اور وہ نظم بھی جو آپ نے ایک ایسی خاتون کے بارے میں لکھی تھی ''جس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا میں شاعرانہ زندگی گزارنے کے لیے آئی ہے۔'' کچھ خلوتیانِ راز کہتے تھے کہ یہ نظم آپ نے حجاب اسمٰعیل کو مخاطب کر کے لکھی تھی، مگر میں اِس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آپ کی زندگی محبت سے عبارت تھی۔ آپ نے خود کہا تھا نا:

محبّت کے لیے آیا ہوں دنیا کی محفل میں — محبّت خون بن کے لہلہاتی ہے مرے دل میں

ہر اِک شاعر مقدّر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے — محبّت کا جنوں تنہا مرے حصّے میں آیا ہے

تو آپ کے حصّے میں صرف محبت کا جنون آیا تھا۔ محبّت انسانی زندگی کا سب سے طاقت ور جذبہ ہے اور آپ نے اِسی جذبہ کو اپنی شاعری کی رگ رگ میں بھر دیا تھا۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو عنفوانِ شباب کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھیں، اُنھیں آپ کی شاعری نے پاگل کر دیا تھا۔ جواں نسل آپ کے شعر پڑھ پڑھ کر پاگل ہوتی جاتی تھی۔ پاگل ہو ہو کر آپ کے شعر پڑھتی تھی۔

مگر یہ دَور ختم ہو گیا! آپ لوگوں کے دِلوں سے نکل کر تاریخ کے صفحات میں آسودۂ خواب ہو گئے۔ آپ کی قندیل کا شعلۂ بے تاب بھی بے جان ہو گیا۔

یہ وقت بڑی ظالم چیز ہے اختر شیرانی! بہت ظالم چیز ہے۔ ایک دَور میں ہم ایک عظیم فنکار کی عظمت کے مینار کو اُفق تک بلند ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، مگر ایک خاص مُدّت کے بعد یہ مینار دیکھتے ہی

دیکھتے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے دھندلکوں میں ایک ہیولیٰ سا دکھائی دینے لگتا تھا۔ کتنے شاعر تھے جو اپنے اپنے ہاتھوں میں اپنے اُفکار کے فروزاں چراغ لے کر نکلے تھے۔ ان چراغوں کی بڑھتی ہوئی روشنی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مستقبل کے ایوانوں میں بھی اِسی طرح ضیاافروز رہیں گے، مگر ابھی وقت نے چند ہی کروٹیں لی ہوں گی کہ ایسی آندھیاں چلیں جنھوں نے بیشتر چراغ بجھا دیے۔ قیامت یہ ہوئی بعض چراغ ہاتھوں میں بھی سلامت نہ رہ سکے۔ ہوا کے طوفانی جھونکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے اور ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کا چراغ بُجھ نہیں سکا، مگر یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آپ ادب کے موڑ پر کھڑے ہیں، آپ کے چراغ کی لَو کے اِرد گرد رنگین روشنی کا ایک حلقہ تھرتھرا رہا تھا، لیکن آج کی نسل ہے کہ اس طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔

میں اِسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں دسویں کا طالب علم تھا۔ ہمارے دینیات کے اُستاد محمد عبداللہ فاروقی کو معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں۔ ایک دن اُنھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ مجھ سے میری کئی نظمیں سُنیں اور کہا: ''شاگرد کس کے ہو؟'' میں نے جواب دیا: ''کسی کا نہیں۔'' بولے: ''اختر شیرانی کے ہاں چلو گے؟'' میرے لیے یہ بات ایک مژدۂ جاں فزا سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ عرض کیا: ''بڑی خوشی سے۔'' اور چند روز بعد وہ مجھے فلیمنگ روڈ پر، برف والے چوک کے پاس ایک کٹڑی میں لے گئے۔ کٹڑی میں داخل ہونے کے بعد بائیں طرف مُڑے اور آواز دی: ''اختر صاحب!'' اُوپر سے کیا آواز آئی، میں نہیں سُن سکا۔ میرے محترم اُستاد نے مجھے پیچھے پیچھے چلنے کا اِشارہ کیا۔ کچھ سیڑھیوں پر سے گزرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ اُستاد نے فرمایا: ''ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ اُنھیں گئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک شخص کمرے میں آیا۔ پست قد۔ رنگ گہرا سانولا اور چہرہ، یہ بڑا سا۔ مجھے یہ چہرہ دیکھ کر کچھ ایسا احساس ہوا کہ یہ اختر شیرانی کے یہاں کوئی نوکر ہے۔

میں نے اُس شخص کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور کرسی میں بیٹھا سوچتا رہا، میرے اُستاد اختر صاحب کو ساتھ لے کر اِدھر آئیں گے۔ اِتنے میں وہ آ گئے۔

''ارے میرزا یہ کیا! اختر آ گئے ہیں اور تم کُرسی پر بیٹھے ہو!'' میرے دل و دماغ میں ایک نشتر سا چُبھ گیا۔ بڑا دکھ ہوا۔ اِس بات کا نہیں کہ میں نے اپنے ہونے والے اُستاد کا احترام نہیں کیا تھا، بلکہ اِس چیز کا کہ اِتنا بڑا شاعر اور شکل اِتنی غیر شاعرانہ! اگر آپ مجھے کہیں اور ملتے تو میں پہلی نظر میں ہی یہ اندازہ کر لیتا کہ آپ ابھی ابھی کسی اکھاڑے میں کُشتی لڑ کر باہر آئے ہیں۔ آپ نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا اور میری طرف بڑھنے لگے۔ میں کُرسی سے الگ ہو کر مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ ''معافی مانگو۔'' میرے اُستاد نے کہا۔

''لاحولَ وِلا۔'' یہ آپ کی آواز تھی۔

اُستاد نے میرا تعارف آپ سے کرایا۔

''میرا بہت عزیز شاگرد ہے۔ شاعری کا شوق ہے اِسے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ مشورہ دے دیا کیجئے۔''

''لاحولَ ولا۔''

آپ نے جب دوسری بار لاحول پڑھی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

آپ نے اور میرے اُستاد، دونوں نے یقیناً سمجھ لیا ہو گا کہ میں بڑا بدتمیز ہوں۔

میں نے دیکھا کہ میرے اُستاد کے چہرے پر ملال کے آثار چھا گئے ہیں، مگر آپ کے چہرے پر کوئی ایسا اَثر نہیں تھا جس سے معلوم ہوتا کہ آپ نے میری حرکت کا بُرا مانا ہے۔

''میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ بابا کے کچھ مہمان آئے ہیں۔'' آپ نے فرمایا اور دروازے سے باہر نکل گئے۔

''میرزا'' میرے اُستاد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جی جناب!''

''اختر شیرانی صاحب جو کچھ پوچھیں اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ سمجھ لیا؟''

تو گویا ابھی آزمائش کا دَور آنے والا ہے۔ میں نے اُن کے سوال کا جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دروازے میں سے داخل ہوں تو بائیں دیوار کے ساتھ ایک

چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی سے کچھ فاصلے پر ایک میز تھی جس پر کچھ کاغذات نظر آرہے تھے۔ کچھ رسالے تھے، چینی کی ایک چھوٹی سی پلیٹ تھی جس کے اُوپر پان کا ایک ٹکڑا نہ جانے کب سے پڑا تھا۔ پڑا پڑا سوکھ چُکا تھا۔ میز کے آگے بمشکل تین کرسیوں کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔

میں نے اپنے دل میں سوچا، اِتنا بڑا شاعر اِتنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر شعر لکھتا ہے، مگر ان کی شکل کیسی ہے؟ شاعر تو دبلے پتلے ہوتے ہیں اور یہ۔ سچ! میں آپ کی شکل دیکھ کر بہت مایوس ہوا تھا۔ واقعہ یہ نہیں کہ میں نے جس انسان کو دیکھا تھا اُس میں تو ذرہ برابر بھی شعریت یا لطافت نہیں تھی۔ بال تراشیدہ تھے۔ مونچھوں کی شکل کچھ یوں تھی، ناک کے نیچے بالوں کے دو باریک خطوط آ کر اُوپر کے ہونٹ پر دائیں بائیں پھیل گئے تھے اور دیکھنے میں بڑے بھلے لگتے تھے۔ لباس ریشمی قمیص اور پاجامہ۔ میں پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چارپائی پر تکیہ دِکھائی دے رہا تھا، ایک طرف سے جلا ہوا۔ ویسے بستر صاف سُتھرا تھا۔

اِتنے میں میرے اُستاد اور آپ ایک ساتھ کمرے کے اندر آئے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کمرے میں بٹھا کر فاروقی صاحب بھی چلے گئے تھے۔

میں مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

آپ بے ساختہ ہنس پڑے۔ ''لاحول۔ بیٹھے رہیے۔'' اور میں بیٹھ گیا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی آپ نے میز پر پڑی ہوئی پلیٹ اُٹھائی۔ دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے پان کو چُھوا اور پھر بیزاری کے عالم میں پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے بلند آواز میں بولے:

''کالے''

''ارے یہ کیا ہوا اختر!'' میرے اُستاد فاروقی صاحب نے آپ کی بائیں ہاتھ کی اُنگلی کی طرف اشارہ کیا جس پر پٹی بندھی تھی۔

''مولانا! یہ سگریٹ کی نوازش ہے۔'' آپ نے مسکرا کر کہا۔

''پھر رات کو سگریٹ پیتے پیتے سو گئے تھے؟''

’’جی ہاں۔ یہ حادثہ ایک مرتبہ پھر ہوا ہے۔آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔‘‘

’’نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’نہیں ہونا چاہیے،لیکن ہوگا۔‘‘اور یہ کہہ کر آپ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ایک دبلا پتلا سا نوجوان کمرے کے اندآیا۔اُس نے ویسی ہی ایک پلیٹ ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جیسی میز پر پڑی تھی۔پلیٹ پر پان کا ایک ٹکڑا پڑا تھا اور پلیٹ کے کنارے کے قریب ایک حصّے پر چونا ایک بڑے سے سفید دھبے کی صورت میں نظر آرہا تھا۔

نوجوان نے پلیٹ آپ کے سامنے رکھ دی۔آپ نے پان اُٹھایا،اُسے لپیٹا اور مُنہ میں ڈال کر چونا اپنی اُنگلی پر جمانے لگے۔یہ اُنگلی اپنے مُنہ کی طرف لے گئے۔سُرخ زبان نکالی اور اُنگلی زبان پر پھیر دی۔ادھر میرے اُستاد بھی اپنے اکلوتے ہاتھ سے سنہری ڈبیا میں سے پان کا ٹکڑا نکال رہے تھے۔

’’مولانا! آپ نے میری اُنگلی دیکھ لی اور ادھر توجہ نہیں کی!‘‘ آپ نے اپنے تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

’’تکیہ بھی جلا ڈالا؟‘‘

’’اُنگلی جل سکتی ہے مولانا! تو تکیہ کیوں نہیں جل سکتا؟‘‘ آپ نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

نوجوان نے دوسری پلیٹ اُٹھالی۔

’’کیا حال ہے کالے خاں!‘‘فاروقی صاحب نے نوجوان سے پوچھا۔

’’مولانا! آپ کیا سمجھتے ہیں، جرائم پیشہ آدمی ہے۔‘‘ آپ نے رہا سہا چونا بھی اُنگلی کی نوک پر سمیٹتے ہوئے کہا۔

’’کیا جرم کیا اِس بے چارے نے؟‘‘

’’جُرم نہیں، جرائم کہیے مولانا!‘‘

’’کیوں کالے خاں!‘‘فاروقی صاحب نے نوجوان سے پوچھا۔

’’بھائی جان ہی جانیں۔‘‘اور کالے خاں نے اِسی میں اپنی بہتری سمجھی کہ دونوں پلیٹیں لے کر

کھسک جائے اور وہ کھسک گیا۔ اُس کے جانے کے بعد آپ نے میری طرف ذرا غور سے دیکھا۔

''پڑھتے نہیں؟''

جواب فاروقی صاحب نے دیا۔

''میرا بہت عزیز شاگرد ہے۔ دینیات کے پرچے میں اچھے نمبر لیتا ہے۔''

آپ نے ہنس کر کہا: ''یہ تو اِن کی جرائم پیشگی ہے۔ شاعری کو دینیات سے کیا واسطہ؟''

مولانا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اور یہ جو اِتنے عالم فاضل لوگ ہیں، مولانا روم، سعدی، عطّار۔''

آپ نے جھٹ فقرہ کاٹ کر کہا: ''ان میں حافظ شاعر تھا اور یہ نام آپ کو پسند نہیں کیوں مولانا!''

''میں نے کب کہا پسند نہیں، مگر یہ نام، مولانا روم۔''

''جرائم پیشہ لوگ تھے۔''

''لاحولَ ولا۔ توبہ کرو۔''

''توبہ، سو بار توبہ۔ اور کہیے۔''

''تمھارے بابا سے کہوں گا کہ آپ کے فرزندِ ارجمند کے یہ خیالات ہیں۔''

آپ نے مناسب سمجھا کہ موضوعِ گفتگو بدل دیا جائے، چنانچہ مجھ سے پوچھا: ''آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟''

مولانا شاید کچھ اچھے مُوڈ میں نہیں تھے۔ بولے: ''آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟''

''مولانا! میں شعر اِس لیے کہتا ہوں کہ جرائم پیشہ آدمی ہوں۔'' اور یہ کہتے ہوئے آپ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ آپ کا قہقہہ ابھی گونج ہی رہا تھا کہ کالے خاں نے دروازے پر آ کر اطلاع دی۔

''آپ کو یاد فرمایا جا رہا ہے۔''

آپ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ ''اصل میں ٹونک سے کچھ مہمان آئے ہیں۔ بابا چاہتے ہیں کہ اُنھیں ذرا لاہور کی سیر کرا دوں اور یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ آج وہ جرائم پیشہ بشیر ہندی بھی نہیں آیا۔''

آپ چلے گئے۔ میں بھی چلا آیا۔

آپ کی شکل وصورت تو غیر شاعرانہ تھی ہی باتیں بھی کچھ ایسی تھیں کہ میں اِس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا آپ ہی اختر شیرانی ہیں۔ کتنا فضول خیال تھا میرا۔ میرے اُستاد نے خود مجھے ان کے یہاں پہنچایا تھا اور کہا تھا: ''اختر صاحب کو دیکھ کر تم کھڑے نہیں ہوئے۔'' اس کے بعد یہ سوچنا کہ یہ اختر شیرانی تھے یا نہیں، کتنی فضول بات ہے۔ میں نے اپنے اندر شرمندگی محسوس کی، مگر شرمندگی کا یہ احساس چند لمحوں کے بعد ختم ہو گیا۔

''یہ ہر شخص کو جرائم پیشہ کیوں سمجھ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی تو جرائم پیشہ کہتے ہیں اور پھر قہقہے۔'' ذہن میں خیال کی وہی لہر دوڑ گئی جس سے میں نے دو تین منٹ پہلے پیچھا چھڑایا تھا۔

جب تک میں اسکول میں رہا آپ سے زیادہ ملاقات نہ ہو سکی، مگر جب دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں دخلہ لیا تو ملاقات میں سہولت حاصل ہو گئی۔

جس پیریڈ میں فرصت ہوتی، میں کالج کی حدود سے باہر نکلتا۔ کتابیں بغل میں دابے احاطہ فیروز دین میں پہنچتا۔ آپ جس کٹڑی میں رہتے تھے اُس کا نام احاطہ فیروز دین تھا۔ احاطے کے پھاٹک میں سے گزر کر دائیں جانب گھوم کر پکارتا:

''اختر صاحب!''

اُوپر سے آپ کی آواز آتی ''آؤ۔'' اور میں اُوپر چلا جاتا۔

آپ بہت کم مجھے تنہا ملے۔ کئی لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ آپ نے چارپائی اُٹھوا دی تھی، اِس لیے اور کرسیوں کی بھی گنجائش نکل آئی تھی۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اُس زمانے میں وہ کون لوگ تھے جو آپ کے ہاں بار بار ملتے تھے۔ میرا خیال ہے آپ کے زیادہ ملنے والوں میں ایک تو تھے عاشق بٹالوی، اور دوسرے بشیر ہندی اور نواب جنھیں آپ نواب زیب النّساء کہتے تھے۔ یہ صاحب خواتین کے رسالے ''زیب النّساء'' کے مالک تھے۔

یہ آخری صاحب مجھے بالکل پسند نہیں تھے۔ آتے تھے جو جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے اور میں

چاہتا تھا کہ ذرا تنہائی ہو تو وہ نظم جو لکھ کر لایا ہوں آپ کے سامنے پیش کر دوں اور یہ صاحب ٹلنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔

یہ مَے نوشی کی لت کب پڑی تھی آپ کو؟ آپ کی اِس بُری عادت نے آپ کے والدِ گرامی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔ اُن کی دِلی خواہش تھی کہ آپ اُن جیسے عالم فاضل ہوں، تنقیدِ شعر العجم جیسا تحقیقی کارنامہ انجام دیں۔ علمی تحقیقات کی روشنی میں ثابت کریں کہ فردوسی نے سلطان محمود کے خلاف کوئی ہجو نہیں لکھی تھی اور یہ ہجو جو فردوسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے کسی اور شاعر کی ہے۔ یا آپ پنجاب میں اُردو کی بُنیاد یں ڈھونڈتے اور ایک نیا لسانی نظریہ قائم کر کے ماہرین لسانیات کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتے۔ آپ اُن کی واحد اولاد تھے۔ اِس لیے اُن کی ساری توجہات کا مرکز صرف آپ تھے۔ آپ نے ایک روز خود بتایا تھا کہ بابا نے میرے لیے ٹونک میں آٹھ اُستادوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک اُستاد فارسی پڑھاتا تھا، ایک عربی، ایک انگریزی۔ ایک اُستاد کی ڈیوٹی تھی کہ وہ آپ کو خوش خطی سکھائے اور ایک اُستاد ایسا بھی تھا جو آپ کو ورزش کراتا تھا۔ پہلوانی کے گُر سِکھاتا تھا۔

’’آپ کو ورزش کراتا تھا؛ اختر صاحب!‘‘

’’ہاں مرزا! میں باقاعدہ اکھاڑے میں جاتا تھا۔ پہلوانوں کے شاگردوں سے کُشتی لڑتا تھا۔ میں نے کئی پہلوانوں کو چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ بڑی طاقت تھی مجھ میں، دیکھ نہیں رہے میرا ڈیل ڈول۔‘‘

واقعی آپ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کوئی شخص بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ اُردو کے سب سے بڑے رومانی شاعر اختر شیرانی ہیں۔ ہاں یاد آیا ایک بار اِسلامیہ کالج کے عقبی دروازے سے کچھ دور آپ جا رہے تھے۔ شاید عرب ہوٹل جانے کا اِرادہ تھا آپ کا۔ اُس وقت میرے پاس میرا ایک کلاس فیلو بھی کھڑا تھا۔

میں نے اُس سے کہا: ’’وہ دیکھو اختر شیرانی!‘‘

’’وہ لمبا آدمی۔ اِتنا لمبا آدمی اختر شیرانی!‘‘

''نہیں بھائی وہ لمبا آدمی نہیں۔وہ میانہ قد کا آدمی۔''

''ارے یہ پہلوان!'' اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ اپنی شکل وصورت، قد وقامت سے تو پہلوان دِکھائی دیتے ہیں، مگر ہیں شاعر۔

آپ کے باباجان آپ کو ایک اسکالر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔اِس لیے اُنھوں نے آپ کی تربیت میں اِتنی دلچسپی لی تھی،لیکن یہ تربیت آپ پر کچھ بھی اثر نہ ڈال سکی۔نہیں اختر صاحب! میں صریحاً غلط کہہ رہا ہوں کہ یہ تربیت آپ پر کچھ بھی اثر نہ ڈال سکی۔اِس تربیت کی وجہ سے آپ میں علم کی گہری محبّت پیدا ہوئی۔مطالعے سے آپ کی طبیعت کبھی بھرتی ہی نہیں تھی۔اِسی تربیت کی وجہ سے آپ کے اندر شریفانہ زندگی کا احساس پیدا ہوا تھا،اِسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کی روح ہمیشہ پاکیزہ رہی۔آپ کی رگوں میں ایک افغانی خاندان کا لہو رواں دواں تھا۔شراب کی لہریں اِس میں کبھی شامل نہ ہوسکیں۔زندگی کی اعلیٰ قدروں سے آپ کی وابستگی ناقابل شکست تھی۔آپ شاعر تھے،مگر آپ بڑے انسان بھی تھے۔

باباجان آپ سے نالاں تھے۔کبھی کبھی آپ سے حد درجہ بےزار ہوجاتے تھے۔میں آپ کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔میں نے دیکھا کہ جب بھی آپ اپنے باباجان کا ذکر کرتے تھے ادب واحترام سے آپ کی آنکھیں فوراً جھک جاتی تھیں۔کسی وقت بھی آپ نے اپنے والد کے خلاف شکایت کا ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔جب کوئی شخص آپ کے باباجان کی ناراضی کا ذکر کرتا تو آپ کہتے:

''قصور میرا ہے۔ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔وہ جو کچھ مجھے بنانا چاہتے تھے میں بن نہیں سکا۔''

اپنے باباجان کا آپ کتنا احترام کرتے تھے،یہ میں جانتا ہوں۔آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں،فکرِ سُخَن میں محو ہوں،دوستوں سے پورے انہماک سے گفتگو کر رہے ہوں یا چوری چُھپے اپنے شغل میں ڈوبے ہوں،اِتنے میں دوسرے کمرے سے آواز آتی: ''داوَد!''

آپ کا سارا پیکر کانپ سا جاتا۔سب کچھ چھوڑ کر اُٹھ بیٹھتے تھے۔

''باباجان بلا رہے ہیں۔''اور اسی لمحے آپ کمرے سے نکل جاتے۔چند منٹ کے بعد واپس آ جاتے۔کوئی پوچھتا:

''کیا ہے اختر صاحب!''

''ایک فرمائشی نظم کہنا ہے۔''

آپ اپنے بابا جان کے اِرشاد کی تعمیل میں صرف فرمائشیٔ نظم ہی نہیں کہتے تھے اور بھی کئی کام کرتے تھے۔ مثلاً یونیورسٹی سے پرچے لانا، کسی دکاندار کا قرض ادا کرنا۔ وہ شکار کے لیے تیار ہوتے تو اُن کے کسی ساتھی کو اس کی اطلاع دینی۔ یہ کام آپ کے فرائض میں شامل تھے۔

شکار میں بابا جان کے ساتھی بالعموم محمد اقبال رہتے تھے۔ یہ ڈاکٹر محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ اُنھیں بابا جان سے اِتنی محبّت تھی کہ اُنھوں نے بھی اپنے بیٹے کا نام داؤد رکھا تھا۔ آپ بھی داؤد تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کے صاحب زادے بڑے ہو کر داؤد رہبر بنے اور آپ اختر شیرانی۔

اپنے بیٹوں کا ایک ہی نام رکھنا اِس بات کا محرّک تھا کہ ان دونوں بزرگوں کو آپس میں بڑی گہری موانست اور محبّت تھی، مگر حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ دونوں داؤد اپنے باپوں کی اُمیدوں پر پورے نہ اُتر سکے۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

آپ محمد داؤد خان، اُردو کے عظیم رومانی شاعر، لیکن اس چیز کو حرزِ جاں بناتے ہوئے جس سے آپ کے بابا جان کو سخت نفرت تھی۔

اور یہ محمد داؤد۔ فاضل باپ کا فاضل بیٹا۔ بہت تعلیم یافتہ۔ اُردو کا خوب صورت انشا پرداز، مگر اس شے کو چھوڑ گیا جو اُس کے باپ کے لیے سب کچھ تھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال سخت گیر قسم کے مسلمان آدمی تھے اور اُن کے فرزند نے بیرونِ ملک جا کر باپ کی عظیم ترین متاع کو کسی گرجے کے اندر صلیب پر چڑھا دیا تھا۔

آپ کے بابا جان کو زندگی میں دو شوق تھے۔ صرف دو شوق۔

ایک شوق تھا پرانے سکّے فراہم کرنا۔ سکّوں کی پہچان جو اُن کو تھی، وہ کسی اور کو نہیں تھی۔ جب کوئی سِکّہ اُن کے سامنے لایا جاتا تو دو تین لمحے غور کرنے کے بعد بتا دیتے تھے کہ یہ سِکّہ کس عہد کا ہے۔ کس ملک میں رائج تھا اور جس ملک میں رائج تھا اُس پر کس بادشاہ کی حکمرانی تھی۔

سِکّوں کے علاوہ اُنھیں تحریر شناسی سے بھی وافر حِصّہ ملا تھا۔ ہر تحریر کو دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اس کا تعلق کس زمانے سے ہے اور اس تحریر کے رسم الخط کو اِصطلاحاً کیا کہتے ہیں۔

نوادرات کی پرکھ اُن میں کمال درجے کی تھی۔ عجائب گھروں کے مہتمم جب کوئی چیز خریدنے کا اِرادہ کرتے تھے تو حافظ محمود شیرانی سے ضرور مشورہ کرتے تھے، کیونکہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان اُنھی کو تھی۔

ویسے تو میں نے اُنھیں کئی بار مطالعے میں غرق دیکھا تھا، ایک بار اُن سے بہت مختصر گفتگو بھی ہوئی تھی۔

ایک روز میں آپ کے کمرے میں بیٹھا تھا، آپ کسی ضروری کام کے لیے باہر چلے گئے تھے۔

اُدھر سے آواز آئی: ''داوٗد!''

میں تنہا کمرے میں تھا۔ یہ فرض میرا تھا کہ باباجان کو آپ کی عدم موجودگی کی اطلاع دوں؛ چنانچہ میں دوسرے کمرے میں گیا اور اُن کو بتایا: ''اختر صاحب ذرا باہر گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔''

باباجان نے سر اُٹھا کر میری طرف ایک لمحے کے لیے دیکھا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔

باباجان سے ایک اور مرتبہ ملاقات ہوئی۔

میرے خسر صاحب نے مجھے فارسی کا ایک خط دیا کہ اس کا ترجمہ کر دوں۔ یہ معاملہ میری قابلیت سے ماورا تھا۔ خط کے حروف شکستہ تھے۔ میں حروف ہی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ترجمہ رہا ایک طرف۔ نہ جانے کس کس کے پاس گیا کہ یہ میرے بھرم کا معاملہ تھا، مگر سب نے بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر رکھ دیا۔

یکا یک مجھے باباجان کا خیال آ گیا۔ اُسی وقت میں آپ کے پاس پہنچا۔

''اختر صاحب! یہ مصیبت ہے۔''

''باباجان کے پاس چلے جاؤ۔''

''آپ بھی ساتھ چلیں۔''

''میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ چلے جاؤ۔''

اور میں اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بابا جان نے ایک لمحے کے لیے تحریر دیکھی۔ آنکھوں پر محدّب شیشہ لگایا اور دوسرے ہی لمحے تحریر فرفر پڑھنی شروع کر دی۔

اُنھوں نے مزید مہربانی یہ کی کہ اپنے ہاتھ سے ایک کاغذ پر اُردو ترجمہ لکھ دیا۔ میں نے گھر آ کر ترجمے کے حروف صاف طور پر لکھے اور خُسر کے سامنے پیش کر کے اپنے علم و فضیلت کی دھاک بٹھا دی۔

بابا جان کو دوسرا شوق، شکار تھا۔ آٹھویں دسویں روز شکار پر جاتے تھے۔ ایک بار وہ جنگلی گائے شکار کر کے لائے تھے اور اُس کی ران کا ایک حصّہ مجھے بھی ملا تھا۔

''اختر صاحب''

''آؤ۔''

میں اُوپر چلا جاتا ہوں۔

آپ دیوار سے کمر لگائے ایک رجسٹر زانو پر رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ آپ کے ہونٹ بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے، کچھ گُنگنا رہے تھے اور جب اس موڈ میں ہوتے تھے تو اپنے پاس بیٹھنے والوں کو یکسر فراموش کر دیتے تھے۔ میں تنہا تھا۔ اُس دن اتفاق سے آپ کے کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ چند منٹ بعد آپ نے مجھ پر سرسری نظر ڈالی۔

''میرزا! تم جرائم پیشہ ہوتے جا رہے ہو!''

''کیسے!''

''اِتنے دن کہاں رہے!''

''جی وہ۔ کالج میں رہا۔ ''بلیک شرٹ'' کا ترجمہ مکمّل ہو گیا ہے؟''

آپ نے یا تو میرا سوال سُنا ہی نہیں تھا یا اُسے نظر انداز کر دیا تھا۔

''بلیک شرٹ'' کے ترجمہ کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اس سے میں ایک حد تک واقف ہوں۔ آپ

کا کوئی ناشر دوست اِس انگریزی ناول کا اُردو ترجمہ شائع کرنا چاہتا تھا۔میرا خیال ہے آپ ہی نے اُسے اِس کا ترجمہ شائع کرنے کی رائے دی ہوگی۔اختر صاحب! میں نے اپنی زندگی میں کئی کثیر المطالعہ شخص دیکھے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ جس تیزی سے آپ کتاب پڑھ لیتے تھے وہ کسی اور کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ضخیم سے ضخیم ناول کو آپ نے دو تین راتوں میں ختم کیا تھا۔نہ جانے آپ رات کو کب تک جاگتے رہتے تھے۔جس کتاب کا بھی مطالعہ شروع کر دیتے تھے اُسے ختم کیے بغیر چھوڑتے ہی نہیں تھے۔مجھے یاد ہے کہ الیگزنڈر ڈوماس کا ناول ''تھری مسکٹیرز'' میں آپ کے لیے کالج کی لائبریری سے ایشو کروا کر لے گیا تھا۔ اور غالباً تیسرے دن آپ نے یہ واپس کر دیا تھا۔میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اِتنا ضخیم ناول آپ تین راتوں میں ختم کر دیں گے۔آپ کے لیے کتنی ہی کتابیں میں نے کالج کی لائبریری سے اِیشو کروائی تھیں۔

آپ نے ہر کتاب زیادہ سے زیادہ چوتھے دن واپس کر دی تھی۔جس روز آپ کے تکیے کے اوپر رات کو پڑھنے کے لیے کوئی نئی کتاب نہیں ہوتی تھی تو آپ قدرے بے چین نظر آتے تھے۔اُس دن جو بھی آپ کا دوست آپ کے پاس آتا تھا اس سے کوئی کتاب لانے کے لیے ضرور کہتے اور اکثر اوقات آپ کی فرمائش پوری ہو جاتی تھی۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ ''بلیک شرٹ'' کا ترجمہ آپ نے اپنے ذِمہ لیا تھا۔شاید دو تین ابتدائی ابواب کا ترجمہ آپ نے کر بھی دیا تھا۔اُس کے بعد یہ ناول آپ کے دوستوں کے ہاتھوں میں پہنچنے لگا۔

آپ نے مجھ سے کہا تھا: ''اس کے کچھ صفحات کا ترجمہ کر دو۔'' اور میں نے ناول کے کم و بیش چوتھائی حصّے کو اُردو میں منتقل کر دیا تھا۔''بلیک شرٹ'' کے ترجمے کا خیال آتا ہے تو ایک لمبوترے چہرے والا گورا سا شخص بھی میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔محمود مؤرخ کو شاید میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔میں نے محمود مؤرخ سے کبھی بات نہیں کی۔وہ خوف ناک حد تک بہرا تھا۔ثقل سماعت نے اُس کی خوب صورت شخصیت کو داغ دار کر رکھا تھا۔اُس سے بات کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے اور اُس کی ہتھیلی پر اپنی اُنگلیوں سے بات لکھنے کی کوشش کرتے تھے جو اُس سے کہنا

ہوتی تھی ۔وہ بلا کا ذہین انسان تھا۔فوراً سمجھ لیتا تھا کہ آپ اُس سے کیا کہنا چاہتے ہیں ۔

محمود مؤرخ کسی انگریزی اخبار میں کام کرتا تھا۔ ’’بلیک شرٹ‘‘ کا بیشتر ترجمہ اُس نے کیا تھا۔

آپ نے ایک اور کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ یہ ایک ڈرامہ تھا ’’ضحاک‘‘ اور اسے آپ نے انگریزی سے نہیں فارسی سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔المانوی مصنّف گوئٹے کے ایک نہایت دردناک ناول ’’نوجوان ورتھر کی داستانِ غم‘‘ کا ترجمہ بھی آپ نے شروع کیا تھا۔میرا خیال ہے آپ یہ ترجمہ مکمّل نہیں کر سکے تھے ۔ادھورا رہ گیا تھا۔ یہ ناول آپ کو بے حد پسند تھا۔لوگ آپ کو ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں،مگر آپ کے نثر پاروں کا حُسن بھی اپنی جگہ برقرار ہے ۔آپ نے جو افسانے لکھے تھے اور جو ’’خیالستان‘‘ اور ’’رومان‘‘ میں بڑے اہتمام کے ساتھ چھپے تھے،جمالیاتی سحر طرازی کی بنا پر اُردو اَدب میں ان کا بھی اپنا الگ مقام متعیّن ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر تاثیرؔ کو آپ کی نثر پسند نہیں تھی ۔وہ کہتے تھے آپ سر سے پاؤں تک شاعر ہیں،مگر نثر نگاری میں بدمذاق ہیں ۔میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ بدمذاق سے ڈاکٹر صاحب کی کیا مراد تھی؟

اُس زمانے میں رومانوی نثر کا عام دستور تھا۔اُردو ادب کی وہ جاندار تحریک جسے رومانیت کہا جاتا ہے،اُس کے نامور اور بڑے مصنّف زندہ تھے ۔ان مصنّفوں کی فہرست میں نمایاں نام یہ ہیں: سجاد حیدر یلدرم،جنھوں نے تُرکی ادب سے اس انداز میں خوشہ چینی کی کہ اُن کی تحریریں رومانوی ادب کا شاہکار سمجھی جا سکتی ہیں ۔سجاد حیدر کے علاوہ سُلطان حیدر جوشؔ تھے جن کے ناول ’’ابومسلم‘‘ نے اُس زمانے میں دھاک بٹھا دی تھی ۔سُلطان حیدر جوشؔ کے اندازِ فکر پر آسکر وائلڈ کی گہری چھاپ ہے ۔سلطان حیدر جوشؔ نے ’’ابومسلم‘‘ کی ابتدا میں کم و بیش وہی اقوال درج کر دیے ہیں جن میں عہدِ وکٹوریہ کے اس ذہین ترین مصنّف کی روح پرتو افگن ہے ۔جوش کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے کہ اس نے شررؔ وغیرہ سے بالکل الگ ہٹ کر اسلامی رنگ کا ناول لکھا ہے ۔اس ناول کی خوبی اس کے پلاٹ اور واقعات کی ترتیب میں نہیں، مصنف کی اِس شدید جمالیاتی حس میں ہے جس کا اِظہار اُنھوں نے ’’ابومسلم‘‘ کے صفحات پر کیا ہے ۔پھر سجاد انصاری تھے جن کی نظروں میں زندگی کی سب سے بڑی قدر نسوانی حُسن ہے ۔اُن کی تحریروں کا مجموعہ ’’محشرِ

خیال‘‘ اُردو کے رومانوی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اور’’ادبستان‘‘ کے مصنّف خلیقی دہلوی تھے۔ اختر صاحب خلیقی دہلوی آپ کے عزیز دوست تھے۔دہلی سے ایک مرتبہ آپ کے ہاں آئے تھے۔بڑے بارعب آدمی تھے۔ایک اور شخص تھے رفیعی اجمیری۔ان کا تعلق بھی رومانوی دبستان سے تھے۔اُن کے علاوہ نیاز فتح پوری تھے۔قاضی عبدالغفار خان تھے۔مہدی حسن افادی الاقتصادی وفات پا چکے تھے،لیکن اُنھوں نے اپنی تحریروں سے جو اثرات چھوڑے تھے وہ زندہ و پائندہ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے’’الہلال‘‘ کی وساطت سے جس جذباتی اور بلند آہنگ اندازِ نگارش کی بُنیاد ڈالی تھی،اُس پر نئی نئی عمارتیں کھڑی کی جارہی تھیں اور جذباتی شِدّت پسندی تو رومانیت کی جان ہے۔ شدید قسم کی جذباتیت نہ ہو تو نثر پارہ رومانی نثر کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا!

ایسے ماحول میں آپ کیسی نثر لکھ سکتے تھے اور پھر آپ تو تھے ہی رومانوی فکر و اسلوب کے شاعر۔

اختر صاحب! آپ کی چارپائی کے اُوپر یہ جو تصویر لگی تھی،میرے لیے ایک سوال بن گئی تھی۔ اس تصویر میں افغانستان کے سابق تاجدار امان اللہ خاں اور اُن کی بیگم ثریّا نظر آتی تھی۔امان اللہ خاں نے یوروپی لباس پہن رکھا تھا اور یہی حال اُن کی بیگم کا بھی تھا۔معلوم نہیں یہ تصویر آپ نے کہاں سے حاصل کی تھی،شاید کسی انگریزی میگزین میں سے نکالی تھی۔

آپ کو معلوم ہے اختر صاحب!ایک روز میں نے آپ سے کہا تھا:

’’اختر صاحب! کوئی خدمت بتائیں۔‘‘اس پر آپ نے کہا تھا:’’میرزا تم بڑے اچھے آدمی ہو۔‘‘ میں نے اصرار کیا کہ اچھے آدمی سے کوئی اچھا کام لیں تو آپ نے میز پر پڑے ہوئے کاغذوں میں سے یہ تصویر نکالی تھی۔

’’میرزا اگر تکلیف نہ ہو تو اِس پر فریم لگوادو۔‘‘

بشیر ہندی پاس بیٹھے تھے’’میں لگوادوں گا مولانا!‘‘

’’نہیں تم جرائم پیشہ ہو۔کئی بار کہا ہے فریم لگوادو۔تصویر لے کر ہی نہیں گئے۔ہمارا میرزا لگوا

لائے گا۔ ہاں میرزا تمھاری جیب میں پیسے ہیں؟"

"ہاں جی۔"

"پیسے خرچ کر دینا۔ کچھ زیادہ ہیں تو ہمیں بھی دے دو۔ تمھارا قرض بمع سُود کے ادا کر دیا جائے گا۔"

آپ نے مجھ سے ساڑھے تین روپے لیے تھے اور میں خوب جانتا تھا ان روپوں کی آپ کو کیوں اور کیا ضرورت تھی۔ اختر صاحب! آپ نے میرے، تابش صدیقی اور اپنے دوسرے شاگردوں کے سامنے کبھی شراب کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اِس معاملے میں آپ انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے، مگر ہم میں سے ہر ایک کو معلوم تھا کہ آپ کی بلانوشی کی وجہ سے آپ کے اور آپ کے بابا جان کے درمیان تعلقات روز بروز بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔

میں تصویر لے گیا اور تیسرے دن فریم لگوا کر لے آیا۔

"کتنے پیسے؟"

"میں نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لوگے؟"

"میں چاہتا ہوں آپ پر قرض رہے۔"

"میرزا! اب تم کچھ زیادہ جرائم پیشہ ہوتے جا رہے ہو۔" اور یہ کہہ کر آپ پان چبانے لگے۔

تو میرا سوال یہ ہے اختر صاحب! عورت کے بارے میں آپ کے کم و بیش وہی خیالات تھے جو ہمارے بزرگوں کے تھے۔ پردے کے آپ قائل تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب فطرت کی ہر خوب صورت شے پردے میں ہے، اگر عورت پردے میں ہے تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ تو آپ چاہتے تھے کہ عورت پردے میں رہے۔ پھر وہ بے پردہ ثریّا کی تصویر آپ نے کیوں دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھی؟

یہ سوال میں نے آپ سے پوچھنا چاہا تھا، مگر نہیں پوچھ سکا تھا۔ اس طرح ایک اور سوال بھی

ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے میرا تعارف ایک ایسے صاحب سے کرایا تھا جسے آپ مولانا زبور کہتے تھے۔ اچھے بھلے آدمی تھے، گٹھا گٹھا سا جسم، پیشانی بڑی روشن اور ٹھوڑی پر کالی ڈاڑھی۔

ڈاڑھی نے اُنھیں جوانی ہی کے عالم میں بزرگ بنا دیا تھا۔

یہ صاحب بڑے خوش مزاج معلوم ہوتے تھے، میں نے اُنھیں دو تین بار آپ کے ہاں دیکھا تھا۔ اُن کی موجودگی میں آپ کِھل اُٹھتے تھے، بے تحاشا قہقہے لگاتے تھے۔ اور ان قہقہوں کے جواب میں مولانا صرف مسکراتے رہتے تھے۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ آپ بے حد ملول اور غمگین ہیں۔ میں دیر تک آپ کے پاس بیٹھا رہا، مگر آپ نے میری طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھا۔

معلوم نہیں اُس وقت کون صاحب آئے۔ اُنھوں نے آتے ہی پوچھا:

''اختر صاحب! اِس حادثے پر بہت دُکھ ہوا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ جب آپ نے اُن صاحب کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''مجھے ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گیا ہے۔''

''بہت افسوس ہوا سُن کر۔''

''اب ماتم کے سوا میرے لیے رہ کیا گیا ہے؟ آپ نے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آہستہ سے اُن صاحب کو مخاطب کیا:

''کیا ہوا ہے؟''

''آپ کو معلوم نہیں۔ مولانا زبور نے خودکُشی کر لی ہے۔''

مولانا زبور نے خودکُشی کیوں کی۔ یہ سوال کئی روز تک مجھے پریشان کرتا رہا، مگر آپ سے جب

بھی سوال کرنا چاہتا تھا یہ سوچ کر چُپ ہو جاتا تھا کہ مولانا زبور کا نام آتے ہیں آپ کی حالت متغیّر ہو جاتی ہے۔ میں آپ سے کبھی نہ پوچھ سکا کہ مولانا زبور نے خودکُشی کیوں کی تھی؟

اختر صاحب! مجھے جب بھی آپ کی انتہائی خوب صورت اور مؤثر نظم ''او دیس سے آنے والے بتا ''یاد آتی ہے تو ایک چھوٹے سے قد کا شخص بے اختیار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ شخص آپ کے عزیزوں میں سے تھا۔ مہندی باغ، ریاست ٹونک سے آیا تھا۔ دبلا پتلا آدمی، چھوٹی سی کالی ڈاڑھی۔ آپ اُس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ جس وقت بھی باباجان کے کمرے سے نکل کر آپ کے پاس آتا تھا، آپ فوراً تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ اِس نظم میں آپ نے اُسی کو مخاطب کیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک یہ نظم مکمّل نہیں ہوئی تھی، آپ قدرے کھوئے کھوئے نظر آتے تھے۔ اور مجھے یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ یہ نظم میری اور آپ کے کئی احباب کی موجودگی میں بشیر ہندی نے سُنائی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظم کے محرّک اُس وقت شریکِ محفل تھے یا نہیں بہر حال بشیر ہندی نے نظم سُنانے سے پہلے کہا تھا:

''مولانا! اجازت ہو تو عرض کروں؟

''کیا عرض کرنا چاہتے ہو بشیر؟ آپ نے پوچھا۔

''جو آپ نے فرمایا ہے۔ میں فرما نہیں سکتا۔ عرض کر سکتا ہوں۔''

اِس کے جواب میں آپ نے مسکراہٹ کے اظہار ہی کو کافی سمجھا اور بشیر ہندی نظم سُنانے لگا۔ مجمع میں جو شخص سب سے زیادہ دلچسپی سے نظم کے اشعار سُن رہا تھا وہ آپ تھے۔ آپ پر خود رفتگی کا عالم طاری تھا۔ میں آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ یکا یک میرے سارے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ ہُوا صرف یہ تھا کہ جب بشیر ہندی نظم کے ایک خاص بند پر پہنچے تو آپ بے اختیار ہو گئے اور اسی کیفیت میں آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے سینے پر مارے اور آپ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ دیکھنے والوں نے آپ کو دیکھا۔ دیکھا اور خاموش رہے۔ بشیر ہندی لہک اُٹھا۔ ہاں تو وہ خاص بند کون سا تھا، مجھے یاد ہے:

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں   باقی ہے ہماری چاہ بتا

کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے — یاروں میں کوئی آہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا — للہ بتا ، للہ بتا
اور دیس سے آنے والے بتا

اور جب بشیر ہندی نے یہ بند سُنایا:

مرجانہ تھا جس کا نام بتا — وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن — وہ جانِ وطن کس حال میں ہے
وہ سروِ چمن ، وہ رشکِ وطن — وہ سیم بدن کس حال میں ہے
او دیس سے آنے والے بتا

میں اُس وقت آپ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اِس بند پر آپ آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ سینے پر بڑے زور سے دو ہتّڑ ماریں گے اور میں ذہنی طور پر اس حادثے کے لیے تیار بھی ہو چکا تھا۔ بشیر ہندی نے بھی یہ بند آہستہ آہستہ سُنایا اور بار بار کنکھیوں سے آپ کی طرف دیکھا، مگر یہ کیا آپ پر تو کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ یہ کیا بات تھی۔ آخر یاروں کے ذکر پر تو آپ بے قرار ہو گئے اور اس غنچہ دہن کے تذکرے پر آپ پر کُچھ بھی اثر نہ ہوا۔

کیا آپ کو اُس شخص کا احترام مقصود تھا جس نے نظم لکھنے کے لیے آپ کو تحریک کی تھی؟ نظم ختم ہو گئی تو میں تابش صدیقی کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔

''تابش! یہ مرجانہ کون ہے؟''

''میرزا! تم مرجانہ کا پوچھ رہے ہو، میں پوچھتا ہوں۔ یہ۔ یہ سلمٰی کون ہے، یہ عذرا کون ہے، وہ سندھ والی کون ہے۔ میرزا۔ یار میرزا''

''کہو کیا معاملہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''میرزا! اختر صاحب سب پر ہاتھ مار رہے ہیں۔ ہمارے لیے بھی کوئی چھوڑیں گے یا نہیں؟''

میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

''ہاتھ مار رہے ہیں۔''

''اور کیا میرزا۔تم۔یار! ہے نا ایک بات۔''

''اختر صاحب سے ذکر کروں گا!'' میں نے دھمکی دی۔

''خبردار میں تمھارا لہو پی جاؤں گا۔''

اور مجھے یاد ہے اُس دن تابش نے مجھے ڈھیر سا وہ گڑ دیا تھا جو وہ چند روز پہلے اپنے گھر سے لایا تھا۔

شام کے سائے لمبے ہو گئے تھے جب میں تابش کے گھر سے باہر نکلا۔

''دیکھو میرزا''

''ہوں''

''اختر صاحب سے تم کہو گے تو نہیں ۔۔۔ یار اختر صاحب کی ہر وہ ہماری اُستانی ہوتی ہے۔''

تو اختر صاحب! آپ کی ہر وہ ہماری اُستانی ہوتی ہے، مگر آپ نے کبھی اپنی 'وہ'' کا حال نہیں بتایا تھا۔

ایک بار حمید نظامی نے ہم دونوں سے پوچھا: ''تم لوگ مدت سے اختر صاحب کے ہاں جا رہے ہو، بتاؤ یہ سلمیٰ کون ہے۔''

میں نے تابش کی طرف دیکھا اور تابش نے میری طرف۔

''جانتے ہیں، لیکن بتائیں گے نہیں، کیوں تابش!''

''اور کیا، اپنے اُستاد کا راز کیسے بتا دیں؟''

بات ختم ہو گئی۔نظامی نے راز معلوم کرنے پر اصرار نہ کیا، مگر میں نے دل میں سوچ لیا کہ نظامی نے ہماری توہین کی ہے یہ کہہ کر تم اختر صاحب کے ہاں مُدّت سے جا رہے ہو، مگر تم اختر صاحب کی سلمیٰ سے واقف نہیں ہو۔میں نے دل میں تہیّہ کر لیا تھا کہ جب بھی کبھی آپ کو تنہا پاؤں گا تو یہ بات ضرور آپ سے

پوچھوں گا۔

اور ایک دن۔

''اختر صاحب!''

''ہوں۔''

''آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''ہوں۔''

''آپ بتائیں گے نا؟''

''ہوں۔''

آپ کی اِس ہوں ہوں نے مجھ پر بڑا خوش گوار اثر ڈالا۔

''اختر صاحب! یہ کون ہے۔۔۔۔میرا مطلب ہے یہ۔۔۔۔جس کا ذکر اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔''

آپ مسکرائے، پھر ''ہوں'' کہا اور ماچس جلا کر سگریٹ سُلگانے لگے۔ آپ سمجھ گئے تھے نا کہ میں کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

''اختر صاحب!''

''ہوں۔''

''اختر صاحب'' اور یکا یک میری کمزور آواز نیچے سے آتی ہوئی بھاری بھرکم، اختر صاحب کہتی ہوئی آواز سے ٹکرا گئی۔

''آؤ''

میں نے اس مہلت کو غنیمت جانا۔

''اختر صاحب! یہ سلمیٰ وغیرہ کون ہے؟''

''سلمیٰ کو تو میں خود بھی نہیں جانتا؛ البتہ اس کو جانتا ہوں۔ یہ ''وغیرہ'' بتاؤں کون ہے؟''

اور آپ ''وغیرہ'' کے بارے میں بھی کچھ نہ بتا سکے۔ ایک دم بہت سے لوگ آ گئے۔ یہ بشیر ہندی۔ اختر صاحب! یہ آپ کا محبوب شاگرد تھا۔ محبوب شاگرد سے زیادہ بے تکلّف دوست، مگر میں نہیں سمجھتا کہ بشیر ہندی سے زیادہ کسی اور کو آپ سے عقیدت ہو گی۔

بشیر ہندی آپ کو ہمیشہ مولانا کہتے تھے۔ خبر نہیں آپ میں اُنھوں نے مولانائیت کس قسم کی پائی تھی۔

بشیر کو آپ سے کتنی عقیدت تھی۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ بشیر ایک نیم فلمی، نیم ادبی پرچہ نکالتے تھے ''فلمستان'' نام تھا اس کا۔ بڑے اچھے معیار کا پرچہ تھا۔ ہسپتال روڈ پر گیلانی پریس تھا۔ یہیں یہ پرچہ چھپتا تھا۔

ایک زمانے میں اس پرچے کے صفحات پر بشیر ہندی نے آغا حشر کاشمیری کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ اِس مہم میں محمود نظامی بھی اُن کے شریکِ کار تھے۔ آغا صاحب اُس زمانے میں کلکتے کی کسی کمپنی سے وابستہ تھے۔

آغا صاحب سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے اور بشیر ہندی آپ کے شاگرد تھے، لیکن آپ نے اِس معاملے میں کوئی دخل نہ دیا۔ آغا صاحب نے بشیر کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا کیس کر دیا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ ایک مرتبہ آغا صاحب مقدمے کے سلسلے میں لاہور آئے، کیونکہ مقدمہ لاہور کی ایک عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ پس پردہ کیا واقعہ ہوا میں نہیں جانتا، مگر یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ آپ نے بشیر ہندی کے نام ایک خط لکھا۔ خط کے الفاظ کچھ اِس قسم کے تھے:

بشیر!

میں اب تک خاموش رہا ہوں، مگر اب تمھیں حکم دیتا ہوں کہ آغا صاحب کے خلاف جو مقدمہ چل رہا ہے اس سے علیحدگی اختیار کر لو۔

تمھارا اختر

اور بشیر ہندی نے ایک لمحہ تأمل کے بغیر مقدمے سے علیحدگی اِختیار کر لی اور مقدمہ ختم ہو گیا۔

اختر صاحب! آپ کو معلوم ہے بشیر ہندی نے جب آغا حشر کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا تھا تو لوگوں نے کیا کیا باتیں بنائی تھیں؟ کسی نے کہا تھا مقدمے میں کوئی جان ہی نہیں ہے۔ بشیر ہندی اسے واپس لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا تھا آغا حشر نے بشیر کو بڑی زبردست قسم کی دھمکی دی ہے اور بشیر نے خوف زدہ ہو کر مقدمے سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، مگر واقعہ نہ وہ تھا اور نہ یہ تھا۔ بشیر ہندی کو میں نے ہر موقع پر ایک صاحبِ کردار آدمی پایا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو ٹوٹ تو سکتے ہیں جھک نہیں سکتے۔ بشیر نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی اور چون و چرا کیے بغیر۔ میں نے کہا ہے بشیر ہندی واقعی صاحبِ کردار آدمی ہے۔ سعادت حسن منٹو سے اُس کی سخت مخاصمت تھی۔ بشیر نے منٹو کے برخلاف بہت کچھ لکھا تھا اور منٹو ہفت روزہ ''مصوّر''، بمبئی کے ''بال کی کھال'' میں آئے دن بشیر کی چٹکی لیتا رہتا تھا۔ منٹو لاہور آ گیا۔ جب بھی اُن دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہی رہے، لیکن بشیر کو میں نے منٹو کے جنازے پر سب سے زیادہ غمگین پایا تھا اور جب منٹو کو سپردِ خاک کر چکے تو بشیر نے روہانسی آواز میں کہا تھا:

''ہم منٹو کو نہیں، اُردو افسانے کو دفن کر چکے ہیں۔''

بشیر ہندی آپ کو مخاطب کیا کرتا تھا، مگر اختر صاحب! عجیب بات ہے، بشیر آج کل خود مولانا بن چکا ہے۔ کچھ مدّت گزری میں نے اُسے قبرستان میں دیکھا تھا۔ میں کسی کے جنازے کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ بشیر کو میں نے دیکھا۔ پہلی نظر میں تو پہچان ہی نہ سکا۔ عجیب حُلیہ بنا رکھا تھا اُس نے، پیشانی پر سجدوں کا گہرا نشان، سادہ سا کُرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے اور ہاتھ میں تسبیح۔

بذلہ سنج بشیر ہندی صوفی کیوں کر بن گیا!

میں ان محرکات سے واقف نہیں ہوں جن کی بنا پر خوش پوش، خوش خوراک اور لطیفہ باز بشیر ہندی ایک دم انتہائی سنجیدہ انسان بن گیا۔ ہو سکتا ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ بشیر نے لبنان کے فلسفی مصنّف خلیل جبران کا جو بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، یہ اُسی کا نتیجہ ہو۔ نہ صرف مطالعہ کیا تھا، بلکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے اُردو پڑھنے والوں کو خلیل جبران سے ''پاگل'' کے ذریعے متعارف کرایا تھا۔

بہر حال بشیر ہندی کو میں نے اس کے بعد اب تک کہیں نہیں دیکھا!

اختر صاحب آپ کو یاد ہے نا آغا حشر سے ملاقات!

کچھ دِنوں سے سُنا جا رہا تھا کہ آغا حشر لاہور آ رہے ہیں اور اب یہیں رہیں گے۔میں آغا حشر سے بہت متأثر تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ آغا صاحب سے آپ کے تعلقات دیرینہ ہی نہیں بڑے خوش گوار بھی ہیں۔آغا صاحب آپ کی شاعری کے بڑے مدّاح تھے،اُن کے جو خط ''رومان'' میں چھپتے تھے وہ اِس بات کی شہادت دے رہے تھے۔میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب آغا صاحب لاہور میں آئیں گے تو آپ سے ضرور کہوں گا کہ اُن سے میری ملاقات کرائیے۔اُن کے ہاں جائیے تو مجھے بھی ساتھ لے جائیے۔

ایک روز میں نے کہا تھا:

''آغا حشر لاہور میں آ رہے ہیں!''

''آ رہے ہیں۔میں نے بھی سُنا ہے!''

''مجھے اُن سے ملنے کی بڑی آرزو ہے۔''

''ہوں۔''

اور آپ نے ''ہوں'' کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی۔

میں نے اخبار میں پڑھا کہ آغا حشر لاہور میں آ گئے ہیں اور سب سے پہلے اپنے مشہور ہندی کھیل ''بھیشم پرتگیا'' کو فلمی صورت دیں گے۔یہ خبر پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔دوسرے دن آپ کے ہاں گیا تو آپ گھر میں نہیں تھے۔میری بے تابی کچھ اِس درجہ بڑھ گئی تھی کہ میں اُس دن شام کو بھی آپ کے ہاں چلا گیا۔اِس سے پہلے میں شام کے وقت آپ کے ہاں غالباً کبھی نہیں گیا تھا۔

اتفاق سے آپ موجود تھے۔مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے:

''میرزا! آغا حشر سے ملو گے؟''

''جی کیوں نہیں!''

''تو چلو۔''

جب ہمارا تانگہ داتا دربار کے پیچھے قطب روڈ پر حکیم احمد شجاع کی کوٹھی پر پہنچا تو اندھیرا کافی گہرا

ہو چکا تھا۔ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ آغا صاحب نے کس کوٹھی میں قیام کیا ہے۔ صرف اِتنا معلوم تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے قرب و جوار میں آغا صاحب کی رہائش کا انتظام کرا دیا ہے۔

ہم حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اُن سے آغا صاحب کی قیام گاہ کا پتہ پوچھا۔

حکیم صاحب نے پہلے تو خیر مقدم میں بڑی گرم جوشی دکھائی اور اُس کے بعد گفتگو میں وہ گرم جوشی دکھائی کے رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور اُن کی گفتگو کا سیل رواں تھا کہ آپ کی ہر معذرت خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اُس وقت آپ کو ایک ترکیب سُوجھ گئی۔

حکیم صاحب! میرا جی تو چاہتا ہے کہ یہاں سے اُٹھ کر کہیں نہ جاؤں، مگر یہ میرزا گھر سے اجازت لے کر نہیں آیا۔ دیر سے پہنچا تو اِسے جوتے پڑیں گے۔''

حکیم صاحب نے میری طرف دیکھا۔

''وزنی جوتے ہیں یا ہلکے؟''

''جی وزنی تو نہیں، مگر ہلکے بھی نہیں!''

حکیم صاحب کو یہ بات پسند آ گئی اور اُنھوں نے آغا حشر کا پتہ بتا دیا۔

''سامنے جائیے۔ سفید رنگ کی کوٹھی ہے۔ چلے جائیں گے یا میں ساتھ چلوں؟''

''چلے جائیں گے حکیم صاحب!'' آپ نے فرمایا۔

میں نے آغا حشر کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ ایک عجیب مسحور کُن شخصیت تھی اُن کی، سرخ و سفید چہرہ، لمبا قد، مگر اُن کی ایک آنکھ۔

میں اِس حادثے کے لیے تیار تھا، کیونکہ بشیر ہندی اپنے کسی مضمون میں اس آنکھ کی صورت گری کر چکے تھے؛ البتہ میرے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ آغا صاحب جب گفتگو کرتے تھے تو مجھے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخاطب مجھ سے ہیں یا آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ آغا صاحب کی اس اوّلیں ملاقات کی تین باتیں مجھے اب تک یاد ہیں۔

آغا صاحب نے دورانِ گفتگو میں کہا تھا:

''میں شاعری میں لکھنؤ کے شعراء کی تقلید کرتا ہوں۔''

اور جب اُردو افسانے کی بات چل نکلی تو اُنھوں نے فرمایا:

''میں نے بڑی کہانیاں پڑھی ہیں، مگر جو حُسن منشی پریم چند کے افسانوں میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔''

اس کی مثال اُنھوں نے یوں دی تھی:

باقی افسانہ نگاروں نے عورت کے پستان پر ریشم کی انگیا چڑھائی ہے اور منشی پریم چند نے اس پر کھدّر کی انگیا۔ اس میں سادگی ہے۔ حُسن تو پستان میں ہوتا ہے، انگیا کے کپڑے میں نہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اُس وقت آغا صاحب نے اپنے شاہکار ڈرامے کا ایک پورا منظر بھی سُنایا تھا۔

یہ وہ منظر تھا جس میں رستم کی محبوب بیوی تہمینہ اپنے شوہر کی جدائی کی کیفیت بیان کرتی ہے۔ آغا صاحب کی آواز میں بڑی گرج تھی۔ ہر مکالمے کا اثر اُن کے چہرے پر بھرپور انداز میں واضح ہوتا جاتا تھا۔ آغا صاحب نے جب یہ فقرہ کہا تھا: ''عورت محبت کا نشہ بن کر تمام عمر ہوش میں نہیں آتی اور مرد پیالہ ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس شراب کی لذّت اور سرُور کو فراموش کر دیتا ہے۔'' تو آپ نے بے اختیار داد دی تھی۔

آغا صاحب نے ایک اور بات بھی کہی تھی۔ صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہیں، مگر ان الفاظ کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے 'کامک' کو اپنے ڈرامے سے الگ رکھا ہے۔ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ 'کامک' کو ڈرامے کا جزو کیوں نہیں بنایا گیا۔ میرا جواب یہ ہے کہ ''میں نے 'کامک' ان پڑھ عوام کو ہنسانے کے لیے لکھے ہیں۔ آگے چل کر جب میرے ڈرامے چھپیں گے تو ان کامکوں کو الگ کر دیا جائے گا اور اس سے میرے ڈراموں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

آغا صاحب پتلی پتلی بسکٹیں کھاتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ مجھے اُن کا لباس بھول گیا ہے صرف یہ یاد رہا ہے کہ وہ نیلے رنگ کی ریشمی تہبند پہنے ہوئے تھے۔

آغا صاحب سے میری دوسری ملاقات چڑیا گھر کے قریب ایک بنگلے میں ہوئی۔ اسے ملاقات

نہیں کہنا چاہیے۔ میں آغا صاحب کو صرف دیکھ سکا۔ زیادہ قریب سے بھی نہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو ملاقاتی کمرے میں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں سید امتیاز علی تاج بھی تھے۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک خاتون پیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے وہاں آئی۔

سید امتیاز علی تاج اس خاتون کو دیکھ کر بولے:

''آغا صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

خاتون بڑے دل کش انداز سے مسکرائی، پھر کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی:

''نہ بابا! پارہ چڑھا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خاتون برِّصغیر کی نامور مغنّیہ مختار بیگم تھیں۔

آغا صاحب آئے۔ نہ جانے کس پر برس رہے تھے اور کس بے چارے کی ماں کے ساتھ کیسے کیسے خوف ناک قسم کے رشتے قائم کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

آغا صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ایک لڑکا بھاگا ہوا آیا۔

''جی وہ آ گیا ہے۔''

آغا صاحب جو ذرا خاموش ہو گئے تھے پھر کسی کو مغلّظات سنانے لگے۔ اُن کا لب و لہجہ وہی تھا جو 'رستم و سہراب' کا منظر سناتے وقت محسوس ہوا تھا۔

عجیب گالیاں تھیں۔ گالیاں کیا تھیں مغلّظات کے ''ادبِ عالیہ'' کے شاہ پارے تھے اور مختار بیگم کو میں نے اے۔ آر۔ کاردار کی معروف فلم 'عورت کا پیار' میں دیکھا تھا۔ اُس فلم میں اُس نے ایک غزل اِتنے خوب صورت انداز سے گائی تھی کہ فلم کے ریلیز ہوتے ہی سارے برِّصغیر میں مشہور ہو گئی تھی۔ اُس وقت غزل سُن کر میں نے اس کے دو تین شعر ذہن میں محفوظ کر لیے تھے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے اور آج تک محفوظ ہیں۔

چوری کہیں کُھلے نہ نسیمِ بہار کی　　خوشبو اُڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اے میرے دل کے چاند، مرے دل کی روشنی　　آ اور صبح کر دے شبِ انتظار کی

اے حشرؔ دیکھنا کہ یہ ہے چودھویں کا چاند　　یا آسماں کے ہاتھ میں تصویر یار کی

فریدہ خانم نے بھی ایک تقریب میں یہ غزل سُنائی، مگر مختار بیگم کی بلندیوں کو نہ پہنچ سکی۔

آغا حشر کو تیسری مرتبہ میں نے موچی دروازے کے سٹیج پر دیکھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے یومِ پیدائش پر ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اخباروں کے ذریعے لوگوں کو اطلاع مل چکی تھی کہ آغا حشر بھی اِس جلسے میں تقریر کریں گے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں پہنچ چکے تھے۔ اختر صاحب! اِس جلسے کے لیے آپ نے بے حد موٴثر نعت لکھی تھی اور یہ نعت جلسے میں کسی نے پڑھ کر سُنائی تھی۔

آغا حشر نے زیادہ سے زیادہ دو منٹ تقریر کی تھی اور ان دو منٹوں میں ہی مجمع کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ تقریر کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔

''اِس مجمع کو دیکھ کر آج اللہ کے ہونٹوں پر بھی بے اِختیار مسکراہٹ آ گئی ہے۔''

آغا صاحب نے اپنی اِسی تقریر میں کہا تھا: ''میں لاہور ہی کی خاکِ پاک میں دفن ہونے کے لیے آیا ہوں'' اور اُن کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ وہ لاہور ہی کی خاکِ پاک میں دفن ہو گئے۔

اختر صاحب! اب رخصت۔

میں نے آپ کو یاد کیا، آپ آ گئے۔ اسی حالت میں جس میں مَیں نے آپ کو بار بار دیکھا تھا۔ احاطہ فیروز دین کے ایک دو منزلہ مکان کے ایک کمرے میں کُرسی میں یا چارپائی کے اوپر بیٹھے ہوئے، سگریٹ پیتے ہوئے، پان چباتے ہوئے یا ''رومان'' کے لیے مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے۔

آپ آ گئے۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں نے اپنے حافظے کی مدد سے آپ کے کچھ واقعات یاد کیے ہیں۔ آپ کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا وہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ میری حیثیت تو ایک شاگرد اور ایک عقیدت مند کی ہے۔ میں نے اِس حیثیت سے کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں جانتا ہوں، میں نے آپ کی ذات کے متعلق بہت کم لکھا ہے، لیکن جن واقعات و حادثات کا عینی شاہد نہیں ہوں......... میں نے اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔ ایک صاحب نے جو آپ کی زندگی کے آخری دِنوں میں آپ سے بہت قریب تھے مجھ سے کہا تھا: ''میں اختر مرحوم کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔''

مگر میں نے اُن سے ملاقات کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ میں تو اختر صاحب! اپنے اُس ماضی کو آواز دینا چاہتا تھا جو آپ کے ساتھ گزرا تھا۔ اس ماضی میں مَیں نے آپ سے فیضان حاصل کیا۔ آپ کے قریب رہ کر آپ کی باتیں سُنیں۔ آپ کے توسط سے کئی لوگوں سے واقف ہوا۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ یہ ماضی اس طرح دوسروں کے سامنے آئے جس طرح میرے دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔

اختر صاحب! میں آپ کی شاعری کا ناقد نہیں ہوں، لیکن یہ بات ضرور کہوں گا کہ لوگوں نے شاعری کی۔ آپ نے شاعری کی بھی، برتی بھی۔ آپ کی دنیا شعر کی دنیا تھی۔ شاعری نے آپ کو جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا جس طرح آپ نے شاعری کو اپنے اسلوبِ حیات میں منتقل کر لیا تھا، اس میں آپ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

شاعری آپ کی زندگی تھی اور آپ کی زندگی شاعری۔

صرف ایک ایسی ہستی تھی۔۔۔۔ جو آپ کے اسلوبِ حیات کو بدل سکتی تھی اور وہ ہستی تھی بابا جان کی۔ مگر بابا جان بھی آپ کو بدلنے اور بقول آپ کے، اپنے آپ کو راہِ راست پر لانے میں شکست کھا گئے۔ دُنیا میں اور کون آپ کو راہِ راست پر لا سکتا تھا؟

میری بڑی خواہش تھی کہ آپ وہ ہو جائیں جو بابا جان چاہتے تھے۔ اور شاید آپ کو یاد ہو، ایک بار آپ آل انڈیا ریڈیو لاہور کے دفتر میں آئے تو آپ کی ٹانگیں نشے کی وجہ سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ ایسی حالت میں ذمے دار لوگ بالخصوص وہ لوگ جو سرکاری عہدوں پر فائز تھے، آپ سے ملاقات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ آپ سیڑھیاں طے کر کے اُوپر آ گئے ہیں۔ میں آپ کو نظر آ گیا تو زور سے بولے: ''میرزا!''

میں حاضرِ خدمت ہو گیا۔

''میرزا وہ چیک (CHEQUE)۔ کرشن چندر نے مجھ سے شعر پڑھوائے تھے، تمھیں معلوم ہے۔''

مجھے معلوم تھا کرشن چندر نے آپ کو اُس پروگرام میں شامل کیا تھا جس کا عنوان تھا: ''شاعر کی

اپنی زبانی''۔میں اُس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کا سٹاف آرٹسٹ تھا۔

کرشن چندر نے بتایا تھا: ''میں اختر صاحب کو بڑی مشکل سے اسٹوڈیوز میں لایا۔ان کے جو جی میں آیا انھوں نے مائیک کے سامنے کہہ دیا۔میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اختر صاحب سے پروگرام کروا کر ہی چھوڑوں گا۔''

میں نے محسوس کیا۔کرشن چندر کی آواز میں ذاتی دُکھ کا احساس بھی تھا۔

''اختر صاحب! آپ اپنے آپ کو کیوں نہیں پہچانتے؟''میں نے بڑی جرأت سے کام لے کر کہا۔

کیا آپ نے میرا فقرہ سُن لیا تھا اور عمداً اغماض برتا تھا؟ آپ خاموش کیوں رہے تھے؟ آپ نے مجھ سے کچھ کہا کیوں نہیں تھا؟ آپ خفا ہو گئے تھے کہ آج میرزا بھی مجھ سے یہ بات کہہ رہا ہے۔

آپ نہیں جانتے بعد میں مجھے اپنے اِس فقرے پر کتنی ندامت ہوئی تھی اور اب تک ہے۔میں نے چاہا تھا کہ اپنی گستاخی کی معافی مانگ لوں؛ چنانچہ ایک بار حکیم نیّر واسطی صاحب کے یہاں گیا بھی تھا یہی مقصد لے کر۔اُس زمانے میں آپ اپنے عزیز دوست، ہمدرد اور ساتھی حکیم نیّر واسطی کے ہاں فروکش تھے۔

آپ اُوپر کے کمرے میں ایک پلنگ پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔

میں نے پوچھا: ''اختر صاحب! کیا حال ہے؟''

''ہوں۔''

''اختر صاحب! وہ ریڈیو۔''

یہ جرائم پیشہ لوگ میرا چیک کیوں نہیں دیتے؟''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا اختر صاحب اُس دن۔۔۔۔''

کیا آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اپنی گُستاخی کی معافی مانگنے کے لیے آیا ہوں؟ آپ نے مجھے کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔اُسی لمحے کہنے لگے:

''نواب زیب النّساء کہاں ہے؟''

''وہ کہیں اُدھر رہتے ہیں۔۔۔۔شاہ عالمی دروازے کے پاس۔''

اُسی وقت حکیم صاحب آگئے اور میں اُن کی موجودگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ یوں ایک خلش میرے دل میں ہی رہ گئی اور یہ خلش اب بھی محسوس ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد میں آپ سے کبھی نہ مل سکا۔

آپ چلے گئے!

''او دیس سے آنے والے بتا۔''

آپ نے تو اپنے دیس سے آنے والے سے پوچھ لیا: ''کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔''

اختر صاحب! میں کس سے پوچھ سکتا ہوں کہ کس حال میں ہے اختر اپنا۔

آپ کی زندگی کا آخری حادثہ موت تھی؟

نہیں۔

نہیں۔ جی ہاں نہیں۔ آپ کی زندگی کا حادثہ یہ تھا کہ آپ اُس دن فوت ہوئے جس دن بانیٔ پاکستان کا انتقال ہوا تھا۔ آپ کا حادثۂ موت بابائے قوم کے حادثۂ موت کی ''وسعت'' میں ڈوب گیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کا جنازہ کب اُٹھا اور آپ نے کن دوستوں اور شاگردوں کے کندھوں پر سوار ہو کر آخری سفر طے کیا۔

میرا ایک عزیز دوست عبدالغنی جو ریڈیو پاکستان لاہور میں کام کرتا ہے، آپ کے جنازے میں شامل ہوا تھا۔

آپ کے آخری سفر کی رُوداد مجھے عبدالغنی نے سُنائی ہے۔

کوئی بڑا آدمی فوت ہوتا ہے تو اُس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگتی ہیں۔ آپ کے متعلق یہ سُنا گیا کہ جب آپ کا جنازہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا تو ایک نقاب پوش خاتون آئی اور اُس نے کہا:

''خدا کے لیے جنازہ ٹھہرا لیں۔ مجھے آخری بار اختر صاحب کا دیدار کر لینے دیں۔''

لوگوں نے اُس خاتون کی آرزو کے پیشِ نظر جنازہ زمین پر رکھ دیا اور جب آپ کا چہرہ ننگا کیا گیا تو وہ خاتون چیخ مار کر آپ سے لپٹ گئی۔ پھر لوگوں نے بمشکل تمام اُس خاتون کو الگ کیا اور جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔

دیکھنے والوں اور سُننے والوں نے کہا، یہ سلمیٰ تھی جو آپ کے دیدار کے لیے بے تابانہ چلی تھی، مگر عبدالغنی نے کہا ہے:

''ایسا کوئی حادثہ یا واقعہ پیش نہیں آیا۔ کسی خاتون نے جنازے کو نہیں روکا تھا۔ جنازے کے ساتھ صرف چند لوگ تھے اور جنازہ آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

(''ناخن کا قرض)

❁❁❁❁❁❁

حکیم ڈاکٹر سیّد محمود احمد برکاتی

اختر شیرانی مرحوم

رات کا وقت تھا۔(۱) چچا کے وسیع مردانے کے صحن میں محفلِ احباب آراستہ تھی۔اختر صاحب اور چچا کے دو ایک مشترک احباب جمع تھے۔ہم دو ایک نوعمر بھی اختر صاحب کی محبت وعقیدت کی وجہ سے اپنا رات کا مطالعہ چھوڑ کر شریکِ محفل تھے۔ہماری موجودگی کے باعث مدرسے کے ایک نوجوان طالب علم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔مردانے کے بیرونی دروازے کے برابر ایک کھانچا سا تھا۔جس میں ایک طاق بھی تھا۔اختر صاحب نے مردانے میں داخل ہوتے وقت شیروانی کی جیب سے ایک اڈّھا نکال کر اس طاق میں رکھ دیا تھا۔وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر گوشے میں جاتے اور ایک منٹ بعد واپس آجاتے۔ میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ بار بار اُدھر کیوں جاتے ہیں۔مگر وہ مدرسے کے مولوی صاحب تاڑ گئے اور اُن کی رگِ جہاد پھڑک اُٹھی۔وہ اُٹھ کر طاق کی طرف چلے۔معاً اختر صاحب کو بھی تنبّہ ہوا اور وہ مولوی صاحب کے پیچھے لپکے۔مولوی صاحب نے جیسے ہی اختر صاحب کو اپنے تعاقب میں پایا وہ طاق سے بوتل اُٹھا کر باہر کی طرف دوڑ پڑے۔گھر کے سامنے ہی مسجد تھی۔(۲) جس کی کُرسی اونچی تھی۔مولوی صاحب اُس کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ہم بھی پیچھے پیچھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ہم نے دیکھا کہ اختر صاحب بھی سیڑھیاں چڑھنا چاہتے تھے۔مگر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک ایک جھٹکے سے رک گئے۔تقریباً ۶۵۔۷۰ سال پہلے کی بات ہے۔مگر اب تک یہ منظر یاد ہے کہ جیسے ہی

(۱) شفاء الملک حکیم ظہیر احمد برکاتی کا تعلق حضرت سید احمد شہید کے معتمدِ خاص شیخ ولی محمد پھلتی کے اخلاف سے تھا۔وہ ٹونک کے معروف فاضل حکیم مولانا برکات احمد کے بھانجے تھے۔۱۳۲۲ھ (۰۵۔۱۹۰۴ء) میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔عالم دین اور ماہر طبیب تھے۔نواب صاحب ٹونک کے معالج خاص اور دارالعلوم خلیلیہ کے مہتمم رہے۔۱۹۶۰ء تک ٹونک میں مطب قائم رکھا۔پھر جے پور میں برکاتی دواخانہ کے نام سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔۲ فروری ۱۹۸۷ء کو جے پور میں وفات پائی اور ٹونک لے جا کر اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (مظہر)

(۲) مسجد حکیم برکات احمد جو عرفِ عام میں ہٹّو کی مسجد کہلاتی تھی۔ (مظہر)

اُنھوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اُن کے قدم پکڑ لیے بلکہ جکڑ لیے۔ پھر فوراً ہی اس پہلی سیڑھی سے بھی نیچے اُتر آئے۔ اور خاص تیور کے ساتھ کرارے لہجے میں کہا:

''مولوی صاحب! نیچے آجاؤ، شرم کرو شرم، اس ناپاک بوتل کو لے کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مجھے دیکھو۔ اللہ کے فضل سے ایک سیڑھی سے آگے نہیں بڑھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹے۔ سب بزرگ گھر کے پھاٹک پر کھڑے تھے اور اس منظر سے ششدر سے تھے۔ اب اختر صاحب ایک خاص عالم میں چچا کی طرف متوجہ ہوئے:

''ظہیر میاں! آپ طلبہ کو علمِ دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کو تربیت بھی دیا کیجئے۔ شراب ناپاک ہے، حرام ہے، گندی چیز ہے۔ میں سیاہ کار شرابی ہوں مگر شراب کی حُرمت کا قائل ہوں بالکل اسی طرح جیسے آپ اور یہ طلبہ اور علماء ہیں۔ بزرگوں کی تربیت کام آئی اور گناہ گار اور مدہوش ہونے کے باوجود میں مسجد کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکا اور یہ مولوی صاحب مسجد میں داخل ہو گئے۔''

اب مولوی صاحب بھی نیچے اُتر آئے تھے اور حیران حیران سے، سہمے سہمے سے کھڑے تھے۔ اختر صاحب بولے:

''مولوی صاحب! بوتل نالی میں پھینک دو۔ اب یہ میرے کام کی نہیں رہی۔ میں گندہ آدمی ہوں میرے مقدر میں گندگی لکھی ہے۔ یہ بوتل تمھارے طفیل مسجد میں ہو آئی ہے اب میرے کام کی نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور اُن کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری۔ بوتل بکھر گئی، شراب بہہ گئی۔

اس واقعے پر ماہ و سال کی کم و بیش ستّر تہیں چڑھ چکی ہیں اور ان گردشوں نے میرے حافظے پر خوب مشق کرم کی ہے۔ اِس کے باوجود مجھے یہ سب کچھ اِس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اختر صاحب کی آواز یاد ہے، اپنی حیرت یاد ہے، اور اُس وقت کا یہ اَثر اب تک یاد ہے کہ اُن کا ایمان بڑا قوی تھا۔ وہ بادہ خوار تھے اور اُس وقت بھی نشے میں تھے۔ ایک شخص اُن کی بوتل لے کر بھاگ رہا تھا اور وہ پوری طاقت سے اُس کا پیچھا کر رہے تھے کہ اُس سے چھین لیں۔ اسی کوشش میں وہ مسجد کی سیڑھی پر بھی چڑھ گئے۔ مگر صرف ایک سیڑھی پر۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکے اور پھر اس پہلی سیڑھی سے بھی فوراً اُتر گئے

اور اس کے بعد اُنھوں نے جو باتیں کیں وہ ہوش وحواس کی باتیں تھیں، ایک مسلمان کی سی باتیں تھیں، جس کے دل میں شراب کی حُرمت کا وہی عقیدہ تھا اور مسجد کے تقدّس کا وہی جذبہ تھا جو ایک مسلمان کے دل میں ہوتا ہے۔ اس بوتل کے مسجد کے در تک لے جانے پر اُن کا ملال دیدنی تھا۔

اسی مردانے کا ایک اور واقعہ بھی حافظے کی لوح سے محو نہیں کیا جاسکا، جو اُن کی ایمانی کیفیت اور ذکرِ رسول ﷺ کے احترام کا ثبوت ہے۔ چچا سے اُن کے دیرینہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ اُس زمانے میں اختر صاحب کی ایک نعت آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ بالخصوص ہر اِتوار کی صبح کو نشر ہوتی تھی۔

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیرالانامؐ آیا

چچا کو یہ بہت پسند تھی۔ ایک بار اختر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ چچا نے اُن سے یہ نعت سُنانے کی فرمائش کی۔ اختر نے معذرت کی۔ چچا نے اصرار کیا تو بڑی لجاجت سے کہنے لگے:

''ظہیر میاں! آپ کہیں تو کوئی نظم سُنادوں۔ اس وقت نعت نہیں سُنا سکوں گا۔ میں پھر آؤں گا اور یہ نعت ضرور سُناؤں گا مگر اِس وقت نہیں۔'' انکار کی وجہ سب لوگ سمجھ گئے۔ گویا نعتِ رسولؐ کے لیے جس طہارتِ جسم و ذہن کی ضرورت ہے اور حضورِ قلب کی جو کیفیت، اس کے لیے، اُن کی نظر میں مطلوب تھی، اس وقت وہ اس سے محروم تھے۔

اختر صاحب کا نام تو میں نے بہت ہی کم عمری میں سُن لیا تھا اور اُن کے ماہنامہ ''رومان'' کے شماروں کی ورق گردانی بھی کرلی تھی، جو ہمارے یہاں آتا تھا۔ پھر یہ معلوم ہوگیا کہ وہ اپنے ہی شہر کے ہیں، شاعر ہیں، بہت مشہور ہیں۔ کچھ دن بعد جب ہر چیز پڑھنے کی لت اور شعر و ادب سے فطری والہانہ شغف کی بنا پر اُن کی نظمیں پڑھنے میں آئیں تو خوب خوب جھوما ہوں۔ اُن دِنوں حافظہ، جو آج کل بے جان ہوگیا ہے، اتنا ہی جاندار تھا، اِس لیے طویل طویل نظمیں نوکِ زبان پر تھیں۔ ''رومان'' کے علاوہ دوسرے رسائل کے فائلوں میں بھی اختر صاحب کی نظمیں پڑھیں مثلاً مولانا آزاد کے ''البلاغ'' میں اُن کی نظم غالباً ''ماں'' پڑھی تھی۔

اختر صاحب کو دیکھنے کی آرزو ۱۹۴۱ء میں پوری ہوئی جب وہ لاہور کی سکونت ترک کر کے ٹونک آئے۔ اُن کے والد حافظ محمود خاں شیرانی اپنا عہدِ ملازمت ختم کر کے ٹونک آرہے تھے۔ سعادت مندی کا بے مثال نمونہ ہے کہ اختر صاحب بھی لاہور جیسے علمی و ادبی مرکز کو چھوڑ کر، جہاں اُنھوں نے اپنے فن کے علم لہرا رکھے تھے، ٹونک آبسے۔ ایک دن وہ میرے چچا سے ملنے تشریف لے آئے تو اپنے محبوب شاعر کی زیارت ہوئی۔ قد متوسط، بدن بھرا بھرا، رنگ سرخ و سفید، خدوخال دل کش، شیروانی اور چوڑے پائنچے کا پاجامہ، تمباکو نوشی سلسلہ نوشی کی حد تک، عقیدت کے جواب میں شفقت، مرعوبیت کے جواب میں بے تکلفی۔ اُس وقت تک اُن کا ایک ہی مجموعہ ''نغمۂ حرم''(۱) شائع ہوا تھا، وہ بھی خواتین کے لیے۔ اس کی ایک بار اختر صاحب کو ضرورت لاحق ہوگئی۔ اُن کے پاس نہیں تھا۔ وہ میرے پاس نکلا تو یہ باہم تعارف پختہ ہوگیا۔

پھر اُن کا دوسرا مگر درحقیقت پہلا مجموعۂ کلام ''صبحِ بہار'' (۲) چھپا تو شاید ٹونک میں اس کا پہلا خریدار میں تھا۔

اُن کو خبر ہوئی تو اپنی شخصیت میں میری والہیت نے اُنھیں متأثر کیا۔ قریب آنے کی ہمت ہوئی تو میں مختلف ادبی موضوعات پر اُن سے طالب علمانہ سوالات کرتا رہتا اور وہ بزرگانہ شفقت اور معلمانہ توجہ سے جواب دیتے۔ اُن کی شفقت نے کسی قدر گستاخ اور بے تکلّف بھی کر دیا تھا۔ اِس لیے نامناسب سوال بھی کر گزرتا تھا مگر وہ مایوس نہ فرماتے۔ مثلاً اُن کی نظم ''یورہائی نس'' کے سلسلے میں میرے سوال کے جواب میں۔۔۔۔ ''فلاں رئیس کی فلاں صاحب زادی'' کی نشان دہی بھی بے خیالی میں فرما گئے۔ میں نے بھی آج تک اُن کی امانت کا تحفظ کیا ہے۔ اسی طرح ''وادیٔ سندھ سے ایک دعوتِ عشق'' کے سلسلے میں۔۔۔۔ ''فلاں خاندان کی فلاں خاتون'' کی نشان دہی بھی اپنے بھولپن میں اور مجھ سے اپنائیت اور مجھ پر اعتماد کی بنا پر فرما گئے۔ الحمد للہ میں نے بھی ابھی تک اس راز کو راز ہی رکھا ہے۔ اُنھی خاتون کا وہ خط بھی میں نے دیکھا تھا، جس کے جواب میں ''میرا موجودہ مشغلہ'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی گئی تھی۔

(۱) ''نغمۂ حرم'' پہلی بار مکتبہ اُردو، لاہور نے ۱۹۳۹ء میں شائع کی تھی۔ (مظہر)

(۲) ''صبحِ بہار'' پہلی مرتبہ اختر صاحب نے خود چھپوائی تھی اُس کی پرنٹ لائن یوں تھی: ''مسٹر اختر شیرانی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، لاہور سے چھپوا کر ٹونک راج سے شائع کیا: ملنے کا پتہ: میسرز حامد اینڈ سنز، علی گنج، ٹونک راج۔ (مظہر)

اس خط کا جواب بھی میں نے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔

میں اسی تعلق اور عقیدت کی بنا پر جو اُن سے تھی اور شفقت کے سہارے، جو وہ فرماتے تھے، اُن کے دولت کدے پر حاضری دیتا رہتا تھا۔ ایک بار اُن کے والد مرحوم، حافظ محمود خاں شیرانی کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ: آخر وقت میں کسی (شاید والدہ صاحبہ) نے میرے متعلق پوچھا کہ آپ اس سے خوش ہیں تو رو کر فرمانے لگے: ''اس کے علاوہ میرا کون ہے؟''

یہ کہتے ہوئے اختر صاحب کی آواز بھی رندھ گئی۔ پھر فرمانے لگے: ''زندگی میں صرف ایک بار باوا نے ہمیں مُنہ لگایا تھا اور ''تنقیدِ شعر العجم کا مسوّدہ دے کر فرمایا، اس پر ایک نظر ڈال لو۔ میں نے دیکھا تو جہاں جہاں لہجہ سخت ہوگیا، پنسل سے وہاں نرم کر دیا۔ ایک موقع پر اُنھوں نے یہ مصرع تک لکھ دیا تھا۔

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جا است

حافظ صاحب کچھ دن انجمن ترقی اُردو، دہلی میں بھی مولوی عبدالحق کے ساتھ رہے تھے۔ اُس زمانے کا ذکر سُنانے لگے کہ ایک دن ہم دونوں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ مولوی صاحب کو شوخی سوجھی تو حافظ صاحب سے کہنے لگے: ''آپ کو معلوم ہے، اختر بہت مشہور (یا بڑے) شاعر ہیں؟''

باوا مُسکرا کر چپ ہو گئے۔

اُس زمانے میں جگرؔ صاحب کی ایک غزل بہت مقبول تھی:

اے ہجومِ نامرادی دل بہت گھبرائے ہے

''گھبرائے ہے، آئے ہے، جائے ہے'' زمین تھی، مجھے متروکات کا استعمال بہت اکھرا۔ ہم سنوں سے ذکر کیا تو اُنھوں نے حسبِ توقع طنز فرمایا۔ ''ماشاءاللہ آپ اِتنے بڑے شاعر پر اعتراض فرما رہے ہیں؟ مگر یہ بات نہ اُس دور میں دل کو لگی نہ آج تک کبھی یہ سوچا کہ فلاں شخص فلاں فن میں باکمال ہے لہٰذا اُس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اُس کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لیے میں نے اسی زمین میں چند شعر گھڑ لیے۔

اُس کے بارے میں غلط فہمی تھی ہم کو کس قدر
شیر سمجھے تھے اُسے ہم، وہ تو لیکن گائے ہے

دوسروں کے واسطے ہیں اور چیزیں بھی کئی
میرے حصّے میں وہاں بس اِک پیالی چائے ہے
کر رہے ہیں آپ متروکات کو پھر اختیار
اپنا اپنا ذوق ہے اور اپنی اپنی رائے ہے

مختصر یہ کہ میں اِس باب میں حسّاس سا ہو گیا تھا۔

اختر صاحب اور ملک کے چند دیگر شعراء نے ''تک'' کی بجائے اشعار میں ''تلک'' بھی استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے اُن سے بڑے ادب سے عرض کی: ''اساتذہ نے ''تلک'' کو متروکات میں شامل کیا ہے، پھر آپ یہ لفظ کیوں استعمال فرماتے ہیں؟'' فرمایا: '' ''تک'' کی نسبت ''تلک'' کانوں کو بھلا لگتا ہے۔'' اُن کا یہ جواب میرے دل نشین نہیں ہوا۔ چونکہ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ ضرورتِ شعری تھی۔ چنانچہ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا: ''تو پھر آپ گفتگو میں بھی ''تلک'' استعمال کرتے ہوں گے؟'' میری اِس گزارش پر ایک لمحہ تأمل کے بعد وہ کُھل کر ہنسے، لطف اندوز ہوئے اور فرمایا: ''چُبھتا ہوا سوال ہے۔''

اُن کے مزید قرب اور اُن کے مزاج سے تعارف کا ایک نادر موقع یوں ملا کہ ایک بار بھری برسات میں گوٹ (پکنک) کا پروگرام بنا۔ چچا نے اپنے احباب (۱) مولانا فضائی اور اختر صاحب کو مدعو کیا تھا۔ ہم نوعمر بھی بزرگوں کے ساتھ تھے۔ شہر سے دو تین میل دور ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا گھنا باغ تھا اس لیے اُسے اندھیرا باغ کہتے تھے۔ ہم لوگ روانہ ہوئے تھے کہ کالی گھٹا چھا گئی اور ابھی ہماری منزل بھی نہیں آئی تھی کہ گھٹاؤں سے زیادہ صبر نہیں ہو سکا اور وہ ٹوٹ کر برسنے لگیں۔ یہ دیوانہ گر موسم بھلا ہم نوجوانوں سے کیسے برداشت ہوتا چنانچہ ہم لوگ سواریوں سے اُتر پڑے اور بھیگتے ہوئے دھوپ میں

(۱) ابو العرفان مولانا حبیب اللہ خاں فضائی کا شمار زمرہ علماء میں ہوتا تھا۔ وہ اختر صاحب کے لڑکپن کے اُستاد مولوی محمد صابر شاکر کے بھانجے اور اختر کے ہم سبق تھے۔ دونوں میں کمال بے تکلّفی تھی۔ اختر صاحب اُن کو فضائی کی تصحیف کر کے قصائی صاحب کہتے تھے۔ شاعری سے بھی رغبت تھی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک اجمیر سے ماہنامہ ''کیف'' نکالتے رہے۔ اخبار ''اتفاق'' کی ادارت بھی کی۔ سیاسی میدان میں مولانا معین الدین اجمیری کے ساتھ کام کیا۔ مدتوں اجمیر میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ٹونک میں انتقال ہوا۔ (مظہر)

مچاتے، چہلیں کرتے، کھیلتے کودتے، راستہ طے کرنے لگے۔ اختر صاحب کے علاوہ سب لوگ اپنے کپڑے محفوظ رکھنے کی خاطر سواریوں میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ مگر اختر صاحب نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم سے لطف اندوز ہونے میں ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ بھیگتے ہوئے ہنستے ہنساتے چلتے رہے۔ ہمارے ایک ہمجولی ایک گھنے درخت کے نیچے پانی سے پناہ لینے لگے تو اختر صاحب چیخے: ''یہ بچہ بے ذوق بڈھا ہے۔ اِس کو بڑوں کے ساتھ سواری میں بٹھا دو۔ یہ برسات کی، اِن گھنگھور گھٹاؤں کی توہین کر رہا ہے۔'' میں نے گرہ لگائی: ''ناشکرا ہے۔'' بہت خوش ہوئے۔ ''ہاں ناشُکرا بھی ہے۔ کیسی نعمت ہے یہ بارش۔'' اتفاق سے مجھے اختر صاحب کی ایک نظم یاد آ گئی۔

کوہساروں کا ، بیابانوں کا ، گلزاروں کا
مُنہ دھلاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
کُوک کوئل کی ، پپیہے کی صدا ، مور کا شور
غل مچاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

اِس وقت یہی دو شعر یاد آرہے ہیں۔ اُس وقت تو پوری نظم سُنا دی تھی۔ اختر صاحب پر یہ نظم سُن کر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ غرض ہم اس طرح کھیلتے کودتے اختر صاحب کی سربراہی میں منزل پر پہنچے۔ دیکھا کہ سب بزرگ ایک بارہ دری میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ کسی نے کہا: ''اِن سب کے کپڑے خشک ہیں۔'' اختر صاحب چہکے: ''یہ سب خود بھی خشک ہیں۔'' ایک بزرگ نے کہا: ''آپ لوگ تو تربتر ہو رہے ہیں۔'' اختر صاحب نے جواب دیا: ''یہ ظالم گھٹائیں، ایسی موسلا دھار بارش اور اِس جنوں انگیز موسم میں اپنے کپڑے بچانے کے لیے مولانا فضائی کی سی بے ذوقی اور بےحِسی کی ضرورت ہے۔ وہ ہم غریبوں کو کہاں نصیب؟'' پھر وہ اُن بزرگوں کو بیٹھا چھوڑ کر اور ہم نوجوانوں کی ٹولی کو ساتھ لے کر باغ میں اُتر گئے۔ بارش تیز ہوگئی اور ہم سب کا نشہ بھی تیز ہوگیا۔ یہ عرض کر دوں کہ اُس روز اختر صاحب پیے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ایسی موج میں تھے جیسے دو چار جام نہیں، خم کے خم لنڈھا چکے ہوں۔ ہم لوگ جامن توڑ کر لا رہے تھے۔ اور اختر صاحب بھی ہمارے ساتھ کھا رہے تھے۔ اسی اثناء میں بزرگوں کی طرف سے بلاوا

آ گیا۔ اختر صاحب بولے: ’’جاؤ کہہ دو، ہم کھائیں گے نہیں، ہم پی رہے ہیں۔‘‘ مگر ہم نوجوانوں کی آنتیں کلام اللہ کی بہت سی آیات پڑھ چکی تھیں۔ اِس لیے اختر صاحب بادلِ ناخواستہ اس رنگین ماحول سے نکلنے پر راضی ہوئے اور اُوپر جا کر کھانا کھانا پڑا۔

اختر صاحب اُس دن بڑی موج میں تھے۔ اگرچہ کم سُخن تھے مگر اُس روز خوب چہکتے رہے۔ کئی لطیفے اور مشاہیر شعراء کے بہت سے قصّے سُنائے۔ ایک مشہور شاعر کے ترنّم کی نقل مطابق اصل اُتاری، غرض آخر تک چہکتے رہے۔

ایک بار دہلی میں اچانک ملاقات ہوگئی۔ میں اُن دِنوں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ کبھی میں ایسا کرتا تھا کہ ہوسٹل سے رخصت لے کر رات کو اپنے رفیق درس حکیم سیّد اشتیاق احمد مرحوم کے گھر چلا جاتا اور ہم مل کر امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد اسی نیت سے نکلا تھا کہ چاندنی چوک میں اختر صاحب اور مجاز صاحب مل گئے۔ دونوں سرشار تھے اور بازار کا چکر لگا رہے تھے۔ اختر صاحب نے مجاز صاحب سے میرا تعارف کروا دیا اور ہم ایک پارک (غالباً کمپنی باغ) میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ادبی مطالعے کے اظہار کے لیے مجاز صاحب کے چند شعر، اُن کی نظموں کے دو تین بند سُنائے تو مجاز صاحب ترنگ میں آگئے اور کئی نظمیں سُنا ڈالیں۔

اختر صاحب داد کے بجائے ’’شاباش‘‘ کہتے اور مجاز صاحب مسکرا دیتے۔ میں نے کہا: ’’مجاز صاحب! نظم تو آپ نے ایک ہی کہی ہے۔‘‘ کہنے لگے: ’’کون سی؟‘‘ میں نے کہا: ’’خواب گر۔‘‘

اختر صاحب نے وہ نظم نہیں سُنی تھی یا ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ اِس لیے سُنانے کی فرمائش کی۔ مگر مجاز صاحب جانے کیوں ٹال گئے۔ یہ میرا وہ دور تھا کہ ادب خصوصاً شعری ادب کے مطالعے کا جنون سا تھا۔ اُن دِنوں نئے شعراء میں سے شاید ہی کسی کا مجموعہ چھپا ہو اور میں نے حاصل نہ کیا ہو۔ نوعمری کا اتھلا پن بھی تھا کہ جو پڑھا ہے اُس کا اِظہار بھی ہو۔ چنانچہ جوشؔ، جگرؔ، حسرتؔ، فراقؔ، آرزوؔ، اثرؔ، حفیظؔ، پھر میراجیؔ، فیضؔ، ن۔م۔راشد، جاں نثار اخترؔ، جذبیؔ، ساحر وغیرہ نجانے کتنے شاعروں کا نام بتاتا گیا اور پھر یہ بھی بتاتا گیا کہ ان کے مجموعے میرے پاس ہیں، میں نے پڑھے ہیں اور اُن پر اپنی ’’رائے گرامی‘‘ بھی بتاتا گیا۔ مثلاً

میں نے کہا: ''جن جن شاعروں نے پہلے غزل گوئی کی مشق کی ہے وہ نظم میں بھی کامیاب ہیں۔ دیکھیے جاں نثار اختر نے اپنی فلاں نظم میں ایک نئے مضمون اور ایک طویل بات کو ایک شعر میں موزوں کر دیا ہے:

جس طرح اندھیرے میں اُبھرتے ہیں بتدریج
دھلتی ہوئی تصویر کے برعکس نشانات

اِس پر مجاز نے کہا: ''ہاں بھئی، اِس شعر پر تو میں نے اُنھیں داد دی تھی، اور پھر جوش میں آ کر اپنی نظم ''اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو'' خوب لہک لہک کر سُنائی۔

۱۹۴۶ء میں میری شادی کے موقع پر جیسا کہ رواج ہے، دوستوں اور عزیزوں نے میرے سہرے لکھے۔ شہر کے بعض بزرگ شعراء (۱) صولت صاحب، (۲) بسمل صاحب اور (۳) سیف صاحب نے بھی کرم فرمایا۔ اختر صاحب کو بھی معلوم ہوا تو اُنھوں نے بھی از راہِ محبّت ایک سہرا لکھا حال آں کہ اس سے پہلے اُنھوں نے شاید ہی کسی کا سہرا لکھا ہو۔ یہی نہیں، میری بہنوں کی درخواست پر اُن کی طرف سے بھی ایک سہرا لکھا۔ یہ دونوں سہرے ڈاکٹر یونس حسنی نے اختر صاحب پر اپنی کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔

اختر شراب پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ نجانے کیسے اُن کو یہ لت لگی۔ اُن کی پرورش سخت نگہداشت کے ماحول میں ہوئی تھی اِس لیے ایسی کسی لغزش کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ٹونک چھوڑنے کے بعد اُن کو کس قسم کا ماحول ملا کہ یہ کافر مُنہ لگ گئی اور اسی نے آخر اُن کا کام تمام کیا۔ وہ پی کر بہکتے ضرور تھے۔ مگر بے قابو نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹوں کا خیال، بڑوں کا لحاظ، آدابِ محفل، کسی چیز میں فرق نہیں آتا تھا۔ صرف میرا ہی نہیں اور دوسرے کئی حضرات کا بیان ہے کہ نشے کی حالت میں بھی کبھی اُن کی زبان سے خدا، رسول، مذہب، دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ جملہ سُننے میں نہیں آیا۔ اُن کے بزرگ سیّد احمد شہید کی تحریکِ جہاد سے وابستہ رہے تھے اور اُن کے ٹونک منتقل ہونے کا موجب و محرّک بھی یہی تعلق تھا۔

---

(۱) استاد الشعراء سیّد محمود الحسن صولت ٹونکی، ولادت ۱۸۹۸ء، وفات ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء۔ (مظہر)

(۲) حضرت بسمل سعیدی۔ اصل نام سیّد عیسیٰ میاں تھا۔ ولادت ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۲ء)، وفات ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء بمقام دہلی۔ (مظہر) (۳) مولوی محمد شریف خاں سیف ٹونکی، امام الشعراء حافظ عالمگیر ٹونکی کے فرزند اور حکیم سید برکات احمد کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ (مظہر)

اختر صاحب عملی کوتاہی کے باوجود اپنے بزرگوں کی روِش سے سرِ مُو منحرف نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے کردار کا دامن شراب نوشی کے سوا ہر نوع کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ اخلاق و سیرت کے محاسن کے حامل تھے۔ مشرقیت اور قدامت اُن کی اَدا اَدا سے جھلکتی تھی۔ ''نغمۂ حرم'' میں پردے کی حمایت میں اُن کی بڑی مؤثر نظم ہے۔ اُن کی جوانی کے دوست، مشہور کالم نگار نصر اللہ خاں نے لکھا ہے اور مجھ سے زبانی بھی فرمایا کہ اختر ایسے شرمیلے انسان تھے کہ اگر کوئی عورت اُن کے دفتر میں آجاتی تو وہ گھبرا جاتے تھے۔ اُن کے قومی و ملی جذبات کی آئینہ دار وہ نظمیں ہیں جو اُنھوں نے افغانستان کے سلسلے میں لکھی تھیں۔ ''فتحِ کابل'' اور ''آرزوئے یک جوان افغانی'' وغیرہ اُن کی بڑی پُر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں ہیں۔ نعتوں کی ایک خاصی تعداد اُن کی حُبِّ رسول ﷺ کی شاہد ہے۔ میں نے ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ''مجھے بھی دعوت دی گئی تھی مگر بے دینوں اور خدا ناشناس لوگوں کا ساتھ میں کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور اِسی وجہ سے ترقی پسند اہلِ قلم اور نقاد مجھ سے ناخوش اور ہمیشہ برسرِ تنقید رہے یا کم از کم نظر انداز کرتے رہے۔

اختر کی منظومات میں لائے جانے والے اسماء سلمیٰ، ریحانہ، عذرا وغیرہ میرے علم کی حد تک فرضی نام ہیں۔ صرف تخیّل کی کارفرمائیاں ہیں، یہ سب اُن کی ذہنی تخلیق ہیں۔ آب و گِل کی دنیا میں اُن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ''رومان'' میں ایک نظم شائع ہوئی تھی: ''ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے''۔ اس کے بعد ''رومان'' ہی میں ایک گم نام نظم چھپی تھی ''کیوں دیکھے''۔ اس نظم کے متعلق بعض حضرات سے سُنا گیا تھا کہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا کی نظم ہے مگر کراچی میں جب محترمہ سے ملاقات ہوئی اور بار بار ہوتی رہی ہیں اور اُن میں اختر صاحب موضوعِ گفتگو رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اِس قیاس اور سُوءِ ظن کی کوئی اساس نہیں ہے۔ وہ ایک باوقار اور بلند کردار خاتون ہیں۔ اُن کا خاندان ایک شریف و مؤقر و معزز خاندان ہے۔ اختر صاحب کا جب بھی میں نے اُن سے ذکر چھیڑا تو اُن کی باتوں سے اختر صاحب کے ساتھ احترام و عزت کا وہی جذبہ جھلکتا نظر آتا ہے جو ایک نامور اور پسندیدہ شاعر کے لیے کسی قاری کے دل میں ہوتا ہے۔

اختر صاحب ایک بار لکھنؤ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ محترمہ کے گھر بھی اُن کی

دعوت ہوئی تھی۔ مگر اُس دَور میں اُن کے یہاں پردے کا رواج تھا۔ اِس لیے وہ پردے ہی میں رہیں۔ اُس وقت وہ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھیں۔ ایک بار اُنھوں نے اختر صاحب کو آموں کا پارسل بھیجا تھا۔ اختر صاحب نے اُن کے شکریے میں یہ قطعہ لکھا تھا:

حیا نے لکھنؤ سے آم بھیجے
ہمیں بھیجے ، ہمارے نام بھیجے
نہ ہوں کیوں بندۂ بے دام ان کے
کہ بھیجے آم اور بے دام بھیجے

سلمیٰ اور ریحانہ وغیرہ ناموں کے سلسلے میں اپنا یہ خیال بھی عرض کر دوں کہ شاید اختر صاحب نے ابتدائی عمر میں عربوں کی تاریخ اور عربی شاعری کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ایک اثر اُن کا یہ جُرأت مندانہ قدم ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار محبوب کے لیے صیغہ تانیث استعمال کیا۔ بعد میں دوسرے شعراء نے اُن کی تقلید کی۔ یہ نام بھی عربی ادب سے ہی اخذ کیے گئے تھے۔ اِس کے علاوہ اُن کی کئی نظموں میں عربی ماحول جھلکتا ہے، مثلاً ایک نظم ہے: ''میرا ننھا جواں ہوگا'' اس میں ماں کہتی ہے:

''ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا''

اُردو ادب کی تاریخ میں اختر صاحب کا جو مقام ہے وہ میرا موضوع نہیں ہے۔ مختصر عرض ہے کہ وہ جوشؔ اور جگرؔ کے عہد کے صفِ اوّل کے شاعر تھے، غزل سے زیادہ نظم پر توجہ تھی اور رومانی شاعری میں وہ اپنے دور کے بیشتر شعراء سے ممتاز تھے۔ ن۔ م۔ راشد، احمد ندیم قاسمی جیسے متعدد شعراء انھی کی رہنمائی میں آگے بڑھے تھے۔ اُردو شاعری کی حد تک محبوب کی تانیث کی ترویج اُنھی کا کارنامہ تھا۔ اِس خصوص میں اُن کو تقدّم حاصل تھا۔ بعد کا ہر شاعر اِس باب میں اُن کا مقلد کہلائے گا۔

(''جادۂ نسیاں'')

محمد طفیل

اختر شیرانی

میں اپنے کسی کام سے دِلّی گیا ہوا تھا۔ وہ دن تھے ۱۹۴۷ء کے، مگر ابھی پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔لڑائی جھگڑے شروع تھے۔ اکیلا دوکیلا مسلمان اگر کسی ہندو کے ہتھّے چڑھ جاتا تو وہ اُسے ختم کرڈالتے تھے۔۔۔۔کوئی ہندو اور سکھ کسی مسلمان کے ہاتھ آجاتا تھا تو وہ اُسے ٹھکانے لگا دیتا تھا۔غرض اپنے اپنے ''مشن'' کے مطابق سبھی چوکس تھے۔مگر بے چاری انسانیت تھی کہ پڑی کراہ رہی تھی۔

اِنھی حالات میں، مَیں لاہور سے دِلّی گیا تھا۔مسلمانوں کی آبادی میں، ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ وہیں ٹھہرنا مناسب جانا۔ بازار جاتا تو اپنے دائیں بائیں دیکھتا کہ کہیں کوئی اپنا ''فرض'' پورا کرنے تو نہیں آرہا ہے۔

اتفاق کی بات کہ دِلّی میں میرے ایک بڑے ہی قریبی دوست مل گئے۔ وہ لاہور سے ٹونک جانے کے لیے آئے تھے۔تا کہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے حافظ محمود شیرانی کے کتب خانہ کو (مرحوم کی وصیت کے مطابق) لاہور لے جاسکیں۔۔۔۔۔اُنھوں نے مجھے کہا: ''یہاں کا کام ختم کرو اور میرے ساتھ ٹونک چلو۔اختر شیرانی سے ملاقات کرادوں گا۔''

''آپ خدا سے بھی ملاقات کا وعدہ کریں، تو بھی اِن حالات میں آپ کے ساتھ نہ جاسکوں گا۔''

''دیکھو حالات بڑے بُرے ہیں۔ اِس لیے اکیلے سفر نہ کریں۔میرے ساتھ ٹونک چلیں۔ پھر اکٹھے لاہور جائیں گے۔''

بہر حال میں اپنے دوست کی باتوں میں آگیا۔بجائے لاہور واپس ہونے کے، لاہور سے اور دُور ہونے کے لیے ٹونک کا ٹکٹ کٹوالیا۔ٹونک پہنچے۔اختر شیرانی سے ملے۔

اتفاق کی بات کہ اُس وقت اختر بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ بڑے پیار اور بڑی محبّت سے پیش

آئے۔ ہم نہال ہو گئے۔ سفر کی کوفت دور ہو گئی۔ اُنھوں نے یہ بھی وعدہ کیا، کل آپ لوگوں کو کتابیں دے دی جائیں گی۔ ہم خوش!

اختر شیرانی کے داماد نے آ کر خبر سنائی۔ ریڈیو نے بتایا ہے کہ لاہور جل رہا ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ ہم دونوں پریشان ہو گئے۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ مجھے اپنی والدہ اور چھوٹے بھائیوں کا بار بار خیال آتا اور نیند اُچٹ جاتی۔

صبح ہی صبح اختر صاحب کے ایک دوست آ نکلے۔ جسے شکل وصورت اور لباس کے اعتبار سے اختر صاحب کا دوست نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اُنھیں ساتھ لے گئے۔ ہم چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر، اختر صاحب کا انتظار کرتے رہے مگر نہ لوٹے۔ کوئی تین چار بجے لوٹے مگر دُھت!

ہم سے مخاطب ہوئے: ''آپ لوگ کون ہیں اور کیا لینے آئے ہیں؟''

میرے دوست نے کہا: ''آپ نے ہمیں بلایا ہے اور ہم لاہور سے کتابیں لینے آئے ہیں۔''

''میں نے نہیں بلایا۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

ہوائیاں تو ہماری پہلے ہی اُڑی ہوئی تھی، اب طوطے بھی اُڑ گئے۔ اختر صاحب برابر کہتے رہے، آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں، اور ابھی چلے جائیں۔ مگر ہم صاحب غرض تھے۔ چُپ رہے۔

گھر والوں نے اختر صاحب کا اصرار دیکھا تو ہمیں منّتوں سے کہا۔ درگزر سے کام لیجیے۔ کل آپ کو کتابیں دلوا دی جائیں گی۔

پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے کہ اختر صاحب سے پھر ملاقات ہوگئی، مگر اب وہ پہلے والے اختر نہ تھے۔ نشہ تو تھا مگر اِتنا نہ تھا کہ اپنا ہوش نہ ہو۔ کہنے لگے: ''آئیے میں آپ کو اپنے کھیتوں میں لے چلوں۔ ہمارے ہاں کے خربوزے بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ پاس ہی ندّی بھی ہے۔ نہا بھی لیں گے۔

ہم دونوں بھرے بیٹھے تھے، کہہ دیا: ''ہم نہیں جائیں گے۔''

آزردہ ہو گئے۔ گلوگیر آواز میں کہا: ''آپ کو میری قسم چلنا ہوگا۔''

''ہم نہیں جائیں گے۔''

''اگر میں آپ حضرات سے معافی مانگ لوں، پھر بھی نہ جائیں گے؟'' اِس پر ہم دونوں ہنس

پڑے۔ غُصّہ دُور ہوگیا۔ ساتھ ہو لیے۔ احتیاطاً اختر صاحب کے داماد کو بھی ساتھ لے لیا۔ اِس پر کہنے لگے:

’’آپ لوگوں نے بچّہ پارٹی کو بھی اپنے ساتھ نتھی کر لیا ہے۔ اِس لیے لطف نہ آئے گا۔‘‘

’’ہم نے انھیں اِس لیے ساتھ لے لیا ہے کہ کہیں آپ ندّی میں دھکّا نہ دے دیں۔‘‘(۱)

میرے اِس فقرے پر اختر صاحب میرے گلے لگ کر رونے لگ گئے۔ میں نے سوچا، یا اللہ! یہ کیا مصیبت ہوئی۔۔۔۔ عرض کیا: ’’جناب آپ بے شک ہمیں ندّی میں دھکّا دے دیں، مگر چُپ ہو جائیں۔‘‘

ٹونک کے خربوزے واقعی بڑے میٹھے تھے۔ ریتلی زمین تھی اور یہ بڑے بڑے خربوزے۔ اختر صاحب اپنے ہاتھ سے توڑ توڑ کر کھلاتے رہے جیسے چاہتے ہوں کہ ہم دن کی بات بھول ہی جائیں۔۔۔ شام ہوگئی۔ ہم نے کہا: ’’گھر چلیے۔‘‘

کہنے لگے: ’’واہ ابھی تو نہائے ہی نہیں۔‘‘

’’حضور! کل نہا لیں گے۔ آج تو شام ہوگئی۔‘‘

’’شام ہوگئی ہے تو کیا ہوا؟ نہانا موقوف نہیں ہوسکتا۔‘‘

ہم نے سوچا کہ لیجیے پھر آئے اپنی آئی پر، مگر جلد مان گئے۔ اِتنا کہا کہ ’’نہائے بغیر واپس نہ جانے دوں گا۔ بڑا ٹھنڈا پانی ہے اِس کا۔ لاہور جا کر یاد کیجیے گا۔‘‘

ہم نے کہا: ’’جناب! ہم خوب یاد رکھیں گے۔ مزید نوازش کی کیا ضرورت؟‘‘

معصوم سے انسان نے ہماری بات کو سُنا تھا۔ سوچا نہ تھا۔۔۔ ’’یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔‘‘

تیسرے دن صبح، اختر صاحب نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ کل کی باتوں پر افسوس کرتے رہے۔ کتابیں نکال کر دیں اور کہا: ’’اِن کی فہرست بنا لیجیے اور رسید مجھے دے دیجیے۔‘‘ ہم نے بڑا زور مارا، رسید لاہور سے بھجوا دیں گے، مگر وہ نہ مانے۔ ہنس کر کہنے لگے: ’’اگر آپ نے اچھی اچھی کتابیں راستے میں اُڑا لیں تو میں کیا کرلوں گا۔‘‘

---

(۱)۔ جب اختر صاحب لاہور آئے تو اُنھوں نے بتایا کہ میرا وہ بچہ جسے تم اپنے ساتھ اِس لیے لے جانا چاہتے تھے کہ کہیں وہ ندی میں دھکا نہ دے دوں، وہ خود اسی ندی میں ڈوب گیا۔

غرض ہم کتابوں کی فہرست بنانے میں لگ گئے اور یہ باہر نکل گئے۔

اختر صاحب کے داماد کو غالباً میاں کہتے تھے۔شاید نام میاں محمد ہو(۱)۔وہ بھی ہمارا ہاتھ بٹاتے رہے۔مگر اختر صاحب سے ہماری ملاقات نہ ہوئی۔

چوتھے دن اختر صاحب ملے اور یہ کہہ کر باہر نکل گئے: ''ابھی آیا۔''

ہم نے بہ منّت کہا: ''ذرا دو منٹ رک جائیے۔کتابوں کی رسید لے لیجئے اور ہمیں چھٹی دے دیجئے، مگر وہ نہ مانے۔۔۔۔''ابھی آیا'' کہہ کر نکل گئے۔

شام کے قریب آنکلے۔ بالکل دُھت، سیدھا ہماری طرف آئے۔''اِن بکسوں میں کیا ہے؟''

''کتابیں ہیں۔''

''کون سی کتابیں؟''

''جو لاہور جائیں گی۔''

''کِس کی اجازت سے جائیں گی؟ کھول دو بکسوں کو۔ابھی کھول دو۔''

میرے دوست پٹھان تھے۔ چہرے پہ نورانی داڑھی اور خود بڑے پرہیز گار قسم کے آدمی، اُنھیں غصّہ ہی تو آ گیا۔کڑک کر بولے: ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''میں کہہ رہا ہوں، کتابوں کے بکس کھول دو۔ یہ تیرے باپ کی کتابیں ہیں جو لے جا رہا ہے۔''

میرے دوست پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ادھر اختر صاحب نے باپ تک نوبت پہنچا دی تھی۔وہ تلملا کے اُٹھے اور ایک تھپّڑ اختر صاحب کے رسید کرنا چاہا۔مگر میں ایک دم بیچ میں کھڑا ہو گیا اور وہ تھپّڑ میرے لگا۔

اختر صاحب کے گھر والے بھی یہ سارا تماشا دیکھ اور سُن رہے تھے۔غالباً اختر صاحب کی والدہ نے دروازے کی اوٹ سے کہا: ''آپ حضرات مجھے معاف کر دیں۔میرا اِس کا اِتنا قریبی رشتہ ہے۔مگر میں اِس کی موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔۔۔۔مگر اِسے موت بھی نہیں آتی۔۔۔۔'' یہ آواز کانوں میں پڑی تو ایک دم سنّاٹا چھا گیا۔میاں، اختر صاحب کو گھر کے اندر لے گیا۔

فسادات کی خبریں ہم ریڈیو پر روز سُنتے تھے کہ لاہور میں یہ ہو گیا، لاہور میں وہ ہو گیا۔مگر اختر

(۱)۔ اُن کا اصل نام نظر الدین خان شیرانی تھا۔اختر شیرانی کی بیٹی نسرین اختر سے اُن کا عقد ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ کو دریا میں ڈوب کر وفات پا گئے۔

صاحب ہمیں چھٹی ہی نہ دیتے تھے۔خوامخواہ ہی وقت ضائع کر رہے تھے۔ہم دونوں حد درجہ پریشان تھے۔ایک اختر صاحب کے سلوک سے، دوسرے ملک کے بگڑے ہوئے چلن سے، مگر کیا کرتے؟ اختر صاحب نے جو باندھ رکھا تھا۔ہم دونوں روز یہ فیصلہ کرتے کل جو کچھ بھی ہو، ہم ضرور چلے جائیں گے۔

پانچویں دن، جب صبح صبح اختر صاحب کی زیارت ہوئی تو میں نے جل تُو جلال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو، کا نعرہ بلند کیا۔اختر صاحب نے سُن لیا۔سیدھا میری طرف آئے۔میرے کان اینٹھ کر بڑے ہی پیار میں کہا:''جانِ من ابھی تک ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں ناراض ہو۔میں دونوں سے معافی مانگتا ہوں۔''

''معاف ہم اِس صورت میں کریں گے، جب آپ ہمیں آج رُخصت کر دیں۔''

''آج نہیں کل چلے جانا۔آج اِس لیے نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کو راضی کرلوں۔ورنہ آپ لوگ لاہور جا کر ضرور کہیں گے کہ اختر بڑا تھرڈ کلاس انسان تھا۔''

اِس پر ہم دونوں ہنس پڑے اور خوب ہنسے۔

پھر گویا ہوئے:''میں بڑا اچھا آدمی ہوں۔بعض اوقات میرا امپریشن بڑا غلط پڑتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ مجھے گھٹیا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔اب بتائیے اِس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔قصور تو سمجھنے والے کا ہے۔''

''جی ہاں قصور تو سمجھنے والوں کا ہے۔''

''اگر میرے ملنے والے سمجھ دار ہوں اور وہ میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیا کریں تو پھر کسی کو بھی مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔''

''آپ بے سمجھ لوگوں سے ملتے ہی کیوں ہیں؟''

''میں بے سمجھ لوگوں سے کہاں ملتا ہوں۔وہی لاہور سے آجاتے ہیں۔''

میرے ساتھی جو غُصّے سے اب بھی بھرے بیٹھے تھے اور بالکل چپ تھے۔۔۔۔اُن کے گلے میں اختر صاحب نے باہیں ڈال دیں اور منانے کے انداز میں کہا:''مولانا میں آپ کا بوسہ لے سکتا

ہوں؟''اِس پر مولانا بھی ہنس دیے اور بات آئی گئی ہوگئی۔وہ سارا دن ہنسی خوشی گزرا اور اختر صاحب نے بھی ہماری دلداری کے سارے سامان کر ڈالے۔کبھی کچھ کھلاتے کبھی کچھ۔کبھی اپنی کوئی غزل سُنادی اور کبھی میرؔ و حافظؔ کی۔غرض وہ دن اِتنا پُر لطف گزرا کہ ہم ساری کلفت بھول گئے۔وقتی طور پر ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ لاہور جل رہا ہے اور ہمارے ماں باپ اور بہن بھائی وہاں ہیں۔

اختر صاحب کا مجھ سے کچھ زیادہ ہی یارانہ ہوگیا تھا۔ممکن ہے اس لیے کہ اُن کی خاطر میں نے تھپّڑ کھایا تھا۔جُھٹ پٹا ہوا تو مجھ سے کہنے لگے:''آؤ طفیل تمھیں سیر کرالاؤں۔''

میں نے اپنے دوست کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اختر صاحب نے ہاتھ جوڑ کر مزاحاً کہا:''نہ بابا!اِنھیں یہیں رہنے دو۔یہ فوراً آستین چڑھالیتے ہیں۔میں بھی پٹھان ہوں،اگر مجھے غُصّہ آگیا تو ایک آدھ لاش تمھیں اُٹھانی پڑے گی۔''

غرض میں اور اختر صاحب سیر کو نکلے۔گلی سے گزر کر بازار تک آئے تو اختر صاحب نے کان میں کہا:''جیب میں کچھ روپے ہیں؟''

''جی ہاں،تھوڑے سے۔''

''کتنے؟''

''تیس کے قریب۔''

''ٹھیک ہے۔''

اب اختر صاحب بجائے اِس کے کہ ٹونک کے بازاروں کی سیر کراتے،یہ مجھے ٹونک کی گلیوں میں لیے پھرے۔ایک گلی سے نکلتے،دوسری میں جا داخل ہوتے۔کوئی دس پندرہ منٹ کی کوچہ گردی کے بعد ایک دُکان کے سامنے جارُکے۔

''ایک پوّا دے دیجئے۔''

دُکان دار:''پہلے سابقہ حساب چکائیے۔''

''وہ ہوجائے گا۔''

’’پہلے وہ ادا کیجئے۔‘‘

’’یہ شریف آدمی لاہور سے آئے ہیں۔ اِن کے سامنے جھگڑا نہ کرو۔ میرا تو روز کا آنا جانا ہے۔

’’شراب اور شرافت۔۔۔۔ ہُنھ!۔۔۔۔۔ روپے ہوں تو دیجئے، ورنہ راستہ پکڑیئے۔ میں پہلا حساب چکائے بغیر شراب نہ دُوں گا۔‘‘

یہ ساری باتیں اِتنی تیزی سے ہوئیں کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اختر صاحب مجھے ایک شراب کی دکان کے سامنے جا کر کھڑا کر دیں گے اور یہ باتیں ہوں گی۔۔۔۔ ’’مجھے ہوش آیا‘‘ تو میں نے اختر صاحب سے کہا: ’’چلیے اب گھر چلیں، چھوڑیں شراب کو۔‘‘

’’کیسے چھوڑ دوں۔ اِس کا باپ بھی دے گا۔‘‘

’’پھر باپ تک گیا تو اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ دُوں گا۔‘‘

میں نے دل میں سوچا کہ اِتنا بڑا شاعر اور یہ گت۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میرا رواں رواں کانپنے لگ گیا۔ میرے دل میں اختر صاحب کا بے حد احترام تھا۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ دکاندار سے لڑ جھگڑ کر شراب دِلوائی۔ کچھ پہلے روپے دیے، کچھ اس پوّے کے۔

اختر صاحب کے ہاتھ میں شراب کی بوتل آئی تو دکان سے دو ہی قدم کے فاصلے پر کاک کھول کر پینے لگے۔ بختا بخشی میں پہلے ہی رات ہو چکی تھی۔ اندھیری گلیاں تھیں۔ مجھے راستہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں نے سوچا اختر صاحب نے پی لی تو میں گھر نہ پہنچ سکوں گا۔ اِس لیے میں نے اختر صاحب سے کہا:

’’بوتل مجھے دے دیجئے۔ گھر جا کر پیجئے گا۔ مگر وہ نہ مانے۔ بوتل تو نہ دی، مگر گھر جا کر پینے کا اقرار کر لیا۔

ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ پھر مجھے اُن کے کچھ پینے کی آواز آئی۔ میں گھبرا گیا کہ یہ ابھی پی کر کہیں گر جائیں گے اور مجھے گلیوں میں ہی رات بسر کرنی پڑے گی۔۔۔۔۔ ایک ترکیب مجھے سُوجھی۔

۔۔۔ ’’اختر صاحب! میں آپ کو ایک بوتل اور لیے دیتا ہوں، مگر اِس شرط پر کہ گھر جا کر پیئیں گے۔‘‘

’’مجھے منظور ہے۔‘‘

ایک اور بوتل خریدی گئی۔ کچھ دیر تو صبر کیا۔ جہاں ذرا اندھیرا ہوتا، یہ ایک دو گھونٹ پی جاتے۔

میں کہتا: ''اختر صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں؟''۔۔۔۔کہتے۔۔۔۔'' کچھ نہیں، تمھارے تو کان بج رہے ہیں۔

میری ٹوکا ٹاکی میں اِتنا ہوا کہ وہ غٹا غٹ پینے کی بجائے، داؤ لگنے پر ہی ایک ایک دو دو گھونٹ کر کے پیتے رہے۔ چلتے رہے۔ اب وہ پیچ در پیچ گلیوں سے نکل آئے تھے اور اُس جگہ آ گئے تھے جو میرا دیکھا بھالا راستہ تھا۔ اب میری جان میں جان آئی۔۔۔۔دیکھا تو خالی بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی۔

اب اُن کے قدم بُری طرح لڑکھڑانے لگے تھے۔ میں نے سہارا دیا۔ تھوڑی دور چلے تو ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ میں نے اُٹھایا۔ کپڑوں سے گرد جھاڑی۔ مگر یہ پھر میرے قابو میں نہ رہے۔ ان میں ذرا بھی تو جان نہ تھی۔ میں اُنھیں بہتیرا سہارا دیتا، بہتیرا سنبھالتا، مگر یہ سب کچھ میرے بس میں نہ رہا۔ جیسے تیسے یہ گھر والی گلی میں پہنچے اور ڈھیر ہو گئے۔ میں نے ہزار اُٹھانا چاہا، مگر اُٹھ نہ سکے۔ ناچار گھر والوں کو خبر کر دی۔ ایک صاحب اختر صاحب کو کندھوں پہ اُٹھا کے لائے۔

ہم اپنے سفرِ ٹونک کے چھٹے روز اِس قابل ہو سکے کہ اختر صاحب سے رخصت ہو سکیں۔ مگر عین وقت پر اختر صاحب نے بتایا کہ میں کل چُنگی والوں سے کہہ آیا تھا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، کتابیں ٹونک سے باہر نہ جائیں۔ اختر صاحب نے یوں اِس لیے کہا تھا تا کہ وہ ہمارے سلسلے میں، اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کر سکیں اور یہ بھی کہ کہیں ہم بغیر اُن کی اطلاع کے چلتے ہی نہ بنیں۔ یہ راز آخری دن صبح کی چائے پر کُھلا۔

''آج ہم جا رہے ہیں۔''

''آپ لوگ جا ہی نہیں سکتے۔''

''آج تو ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔''

''جا کر دِکھائیے۔ میں کل چُنگی والوں سے کہہ آیا تھا کہ جب تک میں ساتھ نہ آؤں، کتابیں ٹونک سے باہر نہ جائیں۔ اور پھر کتابیں ٹونک سے باہر لے جانے کا اجازت نامہ تو میری جیب میں ہے۔''

اب ہم اور چکرائے کہ یہ اچھا خلوص ہے۔ پہلے ہم ان کے شوق سے عاجز تھے، اب ان کے

خلوص سے۔ مگر کیا کرتے؟ پھنسے ہوئے تھے۔ پریشان تھے۔

اختر صاحب ہمیں خوش کرنے پر تُلے ہوئے ہی تھے۔ ’’دیکھو، سامنے جو مٹّی کا بڑا سا مٹکا ہے اُس میں میری جان ہے۔‘‘ اِس فقرے پر مجھے پرانے زمانے کے جادوگروں، دیوؤں اور پریوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔

’’اچھا کیا ہے اِس میں؟‘‘

’’میری معشوقاؤں کے خطوط۔‘‘۔۔۔۔ اختر صاحب ابھی اِتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں لپکا مٹکے کی طرف۔ جتنی تیزی سے میں اُٹھا، اُس سے بھی سُرعت کے ساتھ اختر صاحب جھپٹے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے:
۔۔۔۔ ’’بھئی یہ زیادتی ہے۔ اِنھیں میرے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔‘‘

’’میں پڑھنا نہیں چاہتا، بس دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اچھا‘‘۔۔۔۔ یہ کہہ کر اختر صاحب نے مٹکے میں ہاتھ ڈالا۔ درجنوں خطوط دبوچ لائے۔

’’دیکھو یہ خط فلاں کا ہے، یہ فلاں کا ہے۔۔۔۔۔۔ اور یہ خط فلاں کا۔۔۔۔ مگر ان میں سے ایک بھی خط نہ دُوں گا۔‘‘

’’مانگ کون رہا ہے؟‘‘

’’اچھا تمھیں اِن خطوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟ پڑھ کر دیکھو تو پھڑک اُٹھو گے۔ جوانیاں انگڑائیاں لے رہی ہیں ان میں، بہرحال میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ پایا، وہ یہی کچھ ہے۔ میری جان بھی یہ، میرا ایمان بھی یہ۔‘‘

’’ان میں سے چند ایک خط تو مجھے دے ہی دیجئے، تاکہ میں اُن لوگوں کو دِکھا سکوں جو یہ کہتے ہیں کہ اختر پر کوئی بھی لڑکی نہیں مرتی تھی اور ساری نظمیں فرضی ہیں۔‘‘

’’کون اُلّو یہ کہتا ہے؟ اچھا تو تم یہ خط لے جاؤ۔ جو یہ کہتا ہے انھیں دکھا دینا۔ بدمعاش کہیں کے۔‘‘

میں وہ خط لے آیا تھا جو اختر صاحب کے ہاتھ پہلے ہی ہلّے میں لگے تھے۔ اور وہ خط آج بھی

میرے پاس کہیں پڑے ہیں۔ اِس وقت اُنھیں ڈھونڈنا اِس لیے بھی فضول ہے کہ شاید اُن کی اشاعت مناسب نہ ہو۔ کیونکہ

اِس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ابھی حال ہی میں اختر شیرانی پر ایک مضمون لکھا ہے، جس میں اُنھوں نے کہا ہے کہ اختر پر کوئی لڑکی وڑکی عاشق نہ تھی۔ یہ سب افسانے ہیں۔ اُدھر حکیم نیّر واسطی، جو اختر صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ اختؔر پر ایک چھوڑ، درجنوں لڑکیاں مرتی تھیں۔

(ایک لطیفہ سُنتے چلیں۔۔۔۔۔مشہور واقعہ ہے کہ دِلّی میں ''ہز ماسٹرز وائس'' کے دفتر میں کسی نے مشہور مغنّیہ مُنّی بائی سے ان کا تعارف کرایا۔ اختر صاحب مارے شرم اور جھجک کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ مُنّی بائی نے شرارتاً کہا تھا: ''شاعرِ شباب'' تو کانپ رہا ہے۔)

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی عاشق نہ تھی تو کیا نقصان ہوا، اگر درجنوں لڑکیاں مرتی تھیں تو فائدہ؟ لہٰذا اس بحث میں کیوں اپنا وقت ضائع کیا جائے؟

ویسے میں اِسے اختر صاحب کی سادگی اور بھولپن ہی کہوں گا کہ اُنھیں اگر کوئی لڑکی خط لکھ دیتی تھی کہ۔۔۔۔۔۔مجھے آپ کی فلاں نظم پسند آئی ہے یا مجھے آپ کی شاعری بڑی عزیز ہے تو یہ فوراً اُس لڑکی کا نام محبوباؤں والے رجسٹر پر چڑھا دیتے تھے۔۔۔۔۔۔پھر دوستوں میں تذکرے ہوتے تھے۔۔۔۔۔خط و کتابت ہوتی تھی۔۔۔۔۔اور جواب محفوظ رکھے جاتے تھے۔۔۔۔۔جبھی تو خطوں سے ایک مٹکا بھر گیا تھا۔ وہی مٹکا جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔۔۔۔۔پتہ نہیں، اختر صاحب کیسے خط لکھتے ہوں گے؟ مگر جواب میں جو خط میں نے دیکھے تھے وہ تو ایسے ہی تھے۔۔۔۔۔۔اختر تمھارے بغیر زندگی کا کوئی لطف نہیں۔۔۔۔۔قصّہ کوتاہ، دِلوں کا حال اللہ ہی جانے یا دل والے جانیں۔ میں کیوں اِس پھڈّے میں ٹانگ اَڑا بیٹھا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد یہ خبر اُڑی کہ اختر شیرانی ٹونک سے لاہور آرہے تھے اور فسادیوں نے مسلمانوں سے بھری ہوئی اُس گاڑی ہی کو کاٹ ڈالا جس میں اختر شیرانی اور اُن کا پورا خاندان سفر کر

رہا تھا۔ اخباروں نے سُرخی جمائی: ''اختر شیرانی اور اُن کا پورا خاندان شہید کر دیا گیا۔

یہ خبر پڑھی تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ جیسے کوئی میرا اپنا ہی شہید ہو گیا ہو۔ میرے ذہن میں ٹونک اور اُس کی تمام تر یادیں گھومنے لگیں۔ اخترؔ کی زبردستیاں بھی بھانے لگیں۔ اخترؔ کی لڑکھڑاہٹوں پر بھی پیار آنے لگا۔ اخترؔ کی سادگی اور اُن کے خلوص بھرے دل کا خیال آنے لگا۔ یہ چوٹ کچھ اِس طرح اچانک لگی تھی کہ اس کی ٹیسیں دل کے پار ہی اُترتی چلی جارہی تھیں۔ میں اس حادثے کو بھول جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ بھولتا ہی نہ تھا۔ اخترؔ کی کوئی نہ کوئی ادا، کوئی نہ کوئی بات یاد آجاتی۔ پریشان کر جاتی۔

اخباروں نے بڑے اچھے لفظوں میں اختر کی خدمات کو سراہا۔ اُن کی شخصیت پر مضمون نکلے۔ احباب بھی روئے۔ ادب کے پرستار بھی روئے۔ اُن دِنوں ہر اخبار، اُن کی اِس نظم سے مزّین نظر آیا:

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا — کِس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن؟

او دیس سے آنے والے بتا

اُس پس منظر کے ساتھ، جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے، یہ نظم اور بھی رُلاتی تھی۔

اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ چند دِنوں بعد اِس بھیانک خبر کی تردید چھپ گئی۔ سب خوش ہو گئے۔ اختر زندہ تھے۔

غالباً ۱۹۴۸ء میں اختر صاحب اچانک لاہور آ گئے۔ میں نے اُنھیں دیکھا تو سینے سے لگانے کو دل چاہا۔ عجیب تضاد ہے انسان کی زندگی میں بھی۔ کہاں وہ دن تھے کہ ہم اخترؔ صاحب سے بے زار تھے۔ کہاں یہ دن کہ اُنھیں دیکھ کر خوشی کے آنسو نکل آئے۔

اِس مجموعے میں جو تصویر اختر صاحب کی ہے وہ مجھے اختر صاحب ہی نے دی تھی۔ ایک دن

تشریف لائے۔ کہنے لگے: ''اگر تم چاہو تو مجھے پانچ روپے میں خرید سکتے ہو۔'' میں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''۔۔۔۔جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی تصویر نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔۔۔۔''یہ اختر شیرانی ہے۔ اس کی قیمت پانچ روپے ہے۔

ایک روز یہ ہمارے دفتر کے سامنے تانگے پر بیٹھے۔ اُنھوں نے تانگے والے سے کہا: ''انار کلی میں سے فلاں جگہ چلو۔'' کوچوان نے کہا: ''ون وے ٹریفک ہے۔ میں اس طرف سے نہ جا سکوں گا۔''

''نہیں نہیں ادھر ہی سے چلنا ہوگا۔''

''میرا چالان ہو جائے گا۔''

''میں ذمہ دار ہوں۔ میں نواب ممدوٹ سے کہہ دوں گا (اُن دِنوں نواب صاحب پنجاب کے وزیرِاعلیٰ تھے) میں ڈپٹی کمشنر سے کہہ دوں گا۔ مگر تم چلو ادھر ہی سے۔''

تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی تو میں اُٹھا اور اختر صاحب سے کہا: ''آخر ضرورت ہی کیا ہے کہ آپ معمولی سی بات کے لیے نواب ممدوٹ کے پاس جائیں یا ڈپٹی کمشنر سے کہیں۔ تانگے والا جدھر سے جاتا ہے اِسے جانے دیجئے۔''

''میں اِسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اختر شیرانی ہوں۔''

اختر صاحب کے پاس ہزاروں روپے آئے اور اُنھوں نے ہزاروں ہی اُڑا دیے۔ مثال کے طور پر اگر آج کہیں سے دو چار سو روپیہ مل گیا ہے تو شام تک ختم۔ وہ کہا کرتے تھے کہ روپیہ کا مقصد یہ ہے کہ دوستوں پر خرچ کیا جائے یا پھر شراب پی جائے۔ اُنھیں شرابی کی حیثیت سے سب جانتے ہیں۔ دوست کی حیثیت سے کم لوگ جانتے ہوں گے۔

نازش صاحب کہتے ہیں کہ ایک دن اختر صاحب کو معلوم ہوا کہ اُن کے فلاں دوست کی نوکری چھوٹ گئی ہے اور وہ دو تین مہینوں سے بیکار ہے۔ نوبت فاقوں تک آن پہنچی ہے تو یہ بڑے پریشان ہوئے۔ دو تین دِن تک دوڑتے بھاگتے رہے۔ کہیں سے تین سو روپوں کا انتظام کر لیا۔ مجھے ڈھونڈا، ساتھ لے کر دوست کے مکان کی طرف چلے۔ مکان آیا تو خود نیچے ٹھہر گئے۔ مجھے کہا کہ ''اُوپر جا کر روپے دے

آؤ۔" میں نے کہا: "اختر صاحب! اپنے ہاتھ سے دیجئے۔"۔۔۔۔ کہنے لگے: "خود روپے دیتے ہوئے شرم آئے گی۔"

آخری دِنوں تو ان سے روزانہ ہی ملاقاتیں رہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جھومتے ہوئے آنکلتے۔۔۔ اختر صاحب مجھے اصلی نام سے نہیں پکارا کرتے تھے، بلکہ فروغِ اُردو کی رعایت سے "دروغِ اُردو کہا کرتے تھے۔ جب میں دفتر میں نہ ہوتا تو پوچھا کرتے "دروغِ اُردو" کدھر گیا ہے؟"

سوائے شراب کی عِلّت کے، میں نے اختر صاحب میں کوئی خرابی نہ دیکھی۔ وہ اپنے ملنے والوں کی عزّت کرتے تھے۔ اُن کی مدد کرتے تھے، اُن سے پیار کرتے تھے۔ غرض معصوم سے انسان تھے جو اختر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔

مجھے آج بھی کبھی کبھی اختر صاحب یاد آجاتے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے وعدہ لیتے ہیں:۔

آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

("جناب")

❁❁❁❁❁❁❁

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

شعلۂ مستعجل

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۴۸ء)

درمیانہ قد، وجیہہ چہرہ، کسرتی جسم پر کھلے پائنچوں کا پاجامہ، قمیض اور شیروانی۔ پاؤں میں گرگابی یا پمپ شو، یہ تھے ہمارے والد اختر شیرانی جنھیں ہم پنجابی محاورے کے مطابق ''بھاء جی'' کہا کرتے تھے۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو جب وہ محلّہ مہندی باغ (ٹونک) میں پیدا ہوئے تو اُن کے والد حافظ محمود شیرانی بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن جا چکے تھے۔ دادا نے ایک متوفی بیٹے کے نام پر محمد داؤد خان نام رکھا۔ علاوہ ازیں نو مختلف تاریخی نام نکالے گئے جن سے ظاہری و معنوی اعتبار سے سنہ ۱۳۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک نام مسعود خسرو ایسا ہے جو آگے چل کر اختر نے اپنے بعض مضامین میں استعمال کیا۔ اگلے ہی سال یعنی ۲۹ جولائی ۱۹۰۶ء کو اختر کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ اِس سانحے کی اطلاع ملنے پر حافظ محمود شیرانی لندن سے وطن آئے اور چند ماہ ٹھہر کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں واپس چلے گئے۔ پھر اُنھیں ۱۹۱۳ء کے موسمِ بہار میں آنے کا موقع ملا۔

چھ سات برس کا یہ عرصہ اختر کی سیرت کی تشکیل میں فیصلہ کُن کردار کا حامل تھا۔ ماہرین نفسیات کی آراء کے مطابق انسانی شخصیت کا تین چوتھائی حصہ اُس کے بچپن ہی میں مکمل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر کے اِس اہم ترین مرحلے میں اختر کا اپنے باپ کی محبت سے محروم رہنا ان کے مزاج کے اکثر نمایاں مظاہر کا ذمہ دار ہے۔ معروف صحافی نصر اللہ خاں مرحوم، اختر پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''اختر سر تا پا پیار تھے، خلوص تھے۔ اُن کا بچپن جوانی میں بھی اُن پر مسلّط رہا۔ وہی بھولپن، وہی بچوں ایسی معصوم معصوم سی شوخیاں، وہ ضد۔ بڑھاپا تو خیر ایسے لوگوں پر آتا ہی نہیں ہے(۱)۔''

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کا وہ احساسِ محرومی تاحین حیات اختر کی شخصیت پر سایہ فگن رہا۔ اِسی وجہ سے اُن میں خود اعتمادی پیدا نہ ہوسکی اور قوتِ اِرادی کمزور رہ گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے والد کے حسبِ منشا رسمی تعلیمی مدارج طے نہ کرسکے۔ اُن کی مے نوشی کی عادت کو بھی اِسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور والد کے عتاب کے باوجود اُن کے پرستش کی حد تک احترام کو بھی۔

ٹونک مشرقی علوم وفنون کا اہم مرکز تھا۔ ہند اسلامی تہذیب نے پہلے دہلی اور پھر لکھنؤ کی بربادی کے بعد جن مقامات پر بسیرا کیا اُن میں حیدرآباد (دکن)، رامپور، ٹونک اور بھوپال کے نام نمایاں ہیں۔ اِسی علمی فضا نے ٹونک میں حکیم سید برکات احمد، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا محمود حسن خاں اور خود حافظ محمود شیرانی جیسی شخصیات کو جنم دیا۔

حافظ صاحب بیٹے کو بحرالعلوم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ متعدد اساتذہ اختر کی تدریس اور تربیت کے لیے مقرّر کیے گئے۔ ایک وقت تو اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔ اُردو، فارسی، دینیات اور ریاضی کے علاوہ خوش خطی، ورزش اور پیراکی کے الگ الگ اُستاد تھے۔ ان مساعی کے نتیجے میں اختر کی علمی استعداد بہت اچھی، خط بڑا پاکیزہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اسی دور میں اختر اپنے ایک اُستاد مولوی محمد صابر شاکر کی تشویق سے شعرگوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں حافظ صاحب نے بیٹے کو اپنی مادرِ علمی اورینٹل کالج، لاہور میں داخل کرادیا جہاں اُنھوں نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کیے اور پھر رسمی تعلیم چھوڑ کر شعروادب اور صحافت کو پیشہ بنالیا۔ حافظ صاحب کو بیٹے کی تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔ اِس تکدّر کا اِظہار اُس وقت ہوا جب اختر کی پہلی نظم ''جوگن'' انجمن ترقیِ اُردو کے سہ ماہی مجلّے ''اُردو''(۲) (اورنگ آباد) میں شائع ہوئی اور مولوی عبدالحق مرحوم نے حافظ صاحب کو مبارک باد کا خط لکھا۔ خط پڑھ کر بڑے جھلّائے اور بظاہر اپنی اہلیہ مگر درحقیقت اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہا: ''ہونہہ! سسرا شاعری کرنے چلا ہے۔''

غضب اُس وقت ہوا جب حافظ صاحب کو اُن کی مے نوشی کی خبر ہوئی اور اتنی تاخیر سے جب یہ عادت راسخ ہوچکی تھی۔ آئے تو جائے کہاں۔ گھر میں بھونچال سا آگیا۔ خود اختر صاحب تو موجود نہ تھے اِس

لیے اُن کی والدہ پر خوب ہی برسے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ماں کو بیٹے کی اِس حرکت کا یقیناً پہلے سے علم تھا اور اُنھیں جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا گیا۔ بہر حال سزا کے طور پر اختر صاحب کا گھر میں داخلہ ممنوع قرار پایا۔

اُن دِنوں حافظ صاحب ۱۸۔ فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ نیچے دکانیں تھیں اور اُوپر جانے کا زینہ احاطے کے اندر ایک بغلی گلی کے آخر میں تھا۔ حافظ صاحب کی خواب گاہ تیسری منزل پر تھی اور اختر صاحب کا کمرہ دوسری منزل میں۔ اختر صاحب کو اِس تازہ صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ وہ حسبِ معمول آدھی رات کو گھر پہنچے۔ دستک کی آواز سُن کر اُن کی والدہ زینے سے اُتریں اور دروازہ کھولے بغیر بیٹے کو باپ کا حکم پہنچایا۔ اس ڈھلتی رات میں شب بسری کے لیے کہیں جانا بے تکی بات تھی اِس لیے اختر دروازے کے آگے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے۔ ماں اپنی اکلوتی اولاد کی محبت کے باعث بند دروازے کے اندر کی طرف بیٹھ کر اُنھیں مَے خواری سے اجتناب کی تلقین کرتی رہیں۔ وہ چاہتیں تو اختر کو اُن کے کمرے میں جانے دیتیں اس طرح کہ حافظ صاحب کو کانوں کان خبر نہ ہوتی لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بہر حال والدہ کی نصیحتوں کا یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہ کر اذانِ فجر کے قریب حافظ صاحب کی بیداری سے پہلے ختم ہوا۔ اختر صاحب کو والد کی سخت گیری کا اندازہ تھا اِس لیے اُسی دن اپنے رہنے کا کسی اور جگہ انتظام کر لیا۔

یہ واقعہ محترم پروفیسر سید محمد یونس حسنی صاحب نے اختر سے متعلق اپنے مقالے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے حوالے سے درج کیا ہے(۳)۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب موصوف اختر سے اپنی محبت نیز اپنے شاعرانہ مزاج کے باعث اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے ضروری احتیاط ملحوظ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس یک شبی واقعہ کو فعل ماضی مطلق کے بجائے ماضی استمراری میں بیان کیا نیز لفظ ''عموماً'' کے اضافے سے اسے دوام عطا کر دیا۔ پھر آگے چل کر:

خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

کے مصداق، بعض خلاصہ نویسوں نے اِس واقعہ میں مضمر شوہر کی اطاعت اور بیٹے کی محبّت کے مثالی پہلو نظر انداز کر کے اس میں پائی جانے والی ڈرامائی کیفیت کو اپنے مضمون چمکانے کے لیے استعمال کیا۔

اِسی طرح اختر کے سلسلے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے بعض اور بیانات بھی ناقدوں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے۔

اختر صاحب اپنے رسالے کے دفتر میں رہتے تھے۔ٹوہ لگائے رکھتے کہ بابا کب پرانی کتابوں اور سکوں کی جستجو یا کسی علمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور سے باہر جاتے ہیں۔بس وہ لاہور سے نکلے اور اُنھیں گھر آنے کی چھٹی ملی۔ہم بھائی بہنوں کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ بابا واپس آتے تو ہم کھلونے چھپا دیتے اور اُن کے کالج جانے پر ہی نکالتے۔ہمیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر بابا ان کے بارے میں پوچھیں تو بھاء جی کا نام نہ لینا۔ایک دن بابا کالج سے آ کر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور میں بے دھیانی میں ایک چابی والی موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ بابا نے کنکھیوں سے دیکھ کر پوچھا:''یہ کون لایا تھا؟''اور میں نے بڑی معصومیت سے کوئی بچگانہ توجیہ پیش کر دی۔اُنھوں نے بڑے استعجاب سے کہا:''اچھا!''اب میں سوچتا ہوں کہ اس''اچھا''میں کتنا تجاہلِ عارفانہ تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب بابا ملازمت سے سبکدوش ہو کر ٹونک جانے لگے تو اختر صاحب بڑے گھبرائے۔ بابا کے قریبی دوستوں سے سفارش کروائی۔ بابا بمشکل اِس پر آمادہ ہوئے کہ''چلا چلے،لیکن میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔''باپ بیٹے نے یہ معاہدہ مرتے دم تک نبھایا۔نہ باپ نے کبھی طلب کیا نہ بیٹے نے جرأت کی۔آبائی حویلی کی اوپر کی منزل میں باپ اور نیچے بیٹا۔بعض اوقات حافظ صاحب کوئی علمی مسئلہ چھان بین کے لیے کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر نیچے بھجوا دیتے۔اختر صاحب اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ اُس پر توجہ دیتے اور مطلوبہ معلومات مہیّا کر کے اوپر بھجواتے۔ایسے موقعوں پر سفارتی فرائض میں انجام دیتا تھا۔

اختر صاحب بڑے وسیع المطالعہ شخص تھے۔تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتیں بھی ان میں بہت تھیں اور ترجمے کے فن میں تو یدِطُولیٰ رکھتے تھے۔اُن کے زیرِ اِدارت شائع ہونے والے رسالوں میں اُن کے علمی مضامین اور عوفی کی''جوامعُ الحکایات''کے انتخاب کا اُردو ترجمہ جو انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی نے دو جلدوں (۴) میں چھاپا تھا،اس حقیقت کے گواہ ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ اُن کی شاعرانہ شہرت نے باقی تمام پہلوؤں کو گہنا کر رکھ دیا ہے۔

جب حافظ صاحب کے ضیق النفس کے مرض میں شدّت پیدا ہوئی تو سنہ ۱۹۴۳ء سے اُنھوں

نے شہر سے دور دریائے بناس کے کنارے اپنی زرعی زمین پر ڈیرہ جمالیا اور اِس طرح اختر صاحب کو زیادہ آزادی میسّر آ گئی۔ ٹونک میں مَیں نے اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ہم بھائی بہنوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے کبھی مجھے مارا یا جھڑکا ہو۔ کھانے پہننے کا شوق اُنھیں نہ تھا۔ اُن کی ضروریات شراب کے علاوہ سگریٹ اور پان تک محدود تھیں۔ پان میں تمباکو کبھی نہیں کھایا البتہ چونا اِس کثرت سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو تعجّب ہوتا تھا۔ اُن کی بادہ آشامی کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ دو تین دن تک وہ جی بھر کے پیتے تھے اور اس میں صافی و دردی کی قید نہ تھی۔ تیسرے چوتھے روز اس کا ردِعمل شروع ہوتا۔ معدہ مزید شراب قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ قے آنے لگتی۔ دو تین روز تک خمار اور اعضا شکنی میں مبتلا رہ کر طبیعت بحال ہو جاتی۔ اب ہفتے عشرے کے لیے شراب حرام ٹھہرتی۔ پائیں باغ کے سامنے اُن کا کمرہ تھا۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے، آگے میز رکھے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے گود میں تکیہ رکھ کر اُس پر کُہنیاں ٹکا لیتے تھے۔ اُن دِنوں میں جنھیں ’’ایامِ مسترقہ‘‘ کہنا چاہیے وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ مجھے خاص ہدایت تھی کہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے کہہ دوں کہ گھر پر نہیں ہیں۔ البتہ چند لوگوں کو استثنا حاصل تھا۔ نوشت و خواند سے اُکتاتے تو باغ میں پودوں کو پانی دینے لگتے۔ یہ وہی باغ تھا جس کے بارے میں اُنھوں نے لاہور سے ٹونک آنے پر نظم ’’پھر کھڑا ہوں با دلِ سرشار پائیں باغ میں‘‘ لکھی تھی۔

ان ایّام میں خندہ روئی اور خوش مزاجی اُن پر غالب رہتی۔ ہم بچوں سے ہنسی مذاق کرتے اور پھلجھڑیاں سی چھوڑتے رہتے۔ ایک دن سہ پہر کی چائے میں ذرا تاخیر ہوئی۔ اُنھوں نے یاد دلایا۔ ہماری والدہ نے کہا: ’’پانی رکھا ہوا ہے۔ جوش نہیں آیا۔‘‘ بولے: ’’جوش کی کیا ضرورت ہے جب اختر موجود ہے۔‘‘ فسادات کے زمانے میں لاہور کے اخبارات میں کسی غلط فہمی کی بنا پر اُن کے قتل کی خبر چھپ گئی۔ لاہور کے بعض دوستوں نے اِس حوالے سے خیریت دریافت کی۔ والدہ سے کہنے لگے: ’’بھئی آج اچھے اچھے کھانے پکاؤ اور ہمارا فاتحہ دلواؤ۔‘‘ خاص خاص مقامی دوستوں کو بڑے شگفتہ رقعے لکھ کر بھیجتے۔ ’’جوامع الحکایات‘‘ کے ترجمے کے ضمن میں حکیم ظہیر خاں میاں (۵) کو ایک رقعہ میں لکھتے ہیں: ’’پیارے ظہیر! میری

کتاب میں چند قرآنی آیات اور عربی کے اشعار استعمال ہوئے ہیں .... آج یا تو خود آؤ یا مولوی ذفیر (۶) سے کہو کہ اپنی ڈاڑھی کے مشک اذفر مشامِ کتاب کو معطّر کریں۔ عربی اشعار اُن کے بس کی بات نہیں لیکن آیات کو وہ ضرور درست کرسکیں گے۔" ایک بار درد سعیدی صاحب کو رات کے کھانے پر بلانے کے لیے یہ رُقعہ لکھا:

"ہوا ہے مخالف، خفا ہے زمانہ
مگر درد کھانا یہیں آج کھانا"

یہ رقعہ ڈیوڑھی کا پرانا ملازم دھولیا یا عتیق گاڑی بان لے کر جاتے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ بھیجا جاتا بالخصوص حکیم ظہیر میاں کے پاس، جب اُن سے کوئی دوا منگوانا ہوتی۔ جوارش کمونی اکثر منگواتے تھے۔

حویلی کے استعمال نہ ہونے والے حصّوں اور کھلے صحن میں ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مرغیوں کے چوزے نکلواتے۔ جب یہ چوزے بڑے ہو جاتے تو اُن کا مالک بھاء جی سے سودا طے کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سودا اُدھار کی بنیاد پر چلتا تھا اور کھانے میں سب ہی شریک ہوتے تھے۔ اب منی آرڈر کا انتظار شروع ہوتا اور تاخیر کے ساتھ ساتھ موعودہ رقم میں سود در سود کا اضافہ بھی یک طرفہ ہوا کرتا تھا۔ پیسوں میں اِس اِضافے کی اطلاع اُنھیں وقتاً فوقتاً کر دی جاتی تھی۔

"ابے سود کھاتا ہے!"

"جی آپ سے سُود نہ لیں گے تو کس سے لیں گے؟"

"اچھا یہ بات ہے! آئندہ تمھاری مُرغیاں خریدنا بند۔"

"جی پہلے پچھلا حساب چکا دیں، پھر کوئی فیصلہ کریں۔"

اِس نوک جھونک کے بعد روایتی سود خوروں کی طرح ہم اُنھیں مزید مرغیاں خریدنے پر آمادہ کر لیتے۔ اکثر اوقات وہ ڈاکخانے جا کر منی آرڈر وصول کر لیا کرتے تھے۔ ہاں اگر کوئی غیر متوقع منی آرڈر ڈاکیا گھر لے آتا تو ہمارے پو بارہ۔ اپنا مطالبہ وصول کر کے ہی چھوڑتے۔

یہ پُرسکون وقفے اچانک ختم ہوا کرتے تھے۔ ایک شام وہ چُپکے سے گھر سے نکل جاتے۔

واپس آتے تو نشے میں دھت، ڈیوڑھی کے باہر گھر میں محفل جمتی۔ شعروادب کا ذوق رکھنے والوں کے علاوہ رنگ رنگ کے لوگ جمع ہو جاتے، ان میں رِندوزاہد اور عالم و عامی کی قید نہ تھی۔ مولانا قاضی عمران خان مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کے والد مولانا مُفتی عرفان خان مرحوم ومغفور، ناظم محکمہ شرع شریف بھی کبھی کبھی اختر صاحب کی ان محفلوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ! قربان جائیے اِس ادب دوستی، قدردانی اور وسیع المشربی کے۔ غرض مونڈھوں، کرسیوں، چار پائیوں پر بھانت بھانت کا آدمی بیٹھا ہے اور اختر صاحب بلبلِ ہزار داستان بنے ہوئے ہیں۔ شعروادب کے موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اساتذہ کے اشعار زیرِ بحث ہیں۔ زبان دانی کے نکات اور تاریخی واقعات پر رائے زنی کی جارہی ہے اور دنیا بھر کے موضوعات۔ قاری جمیل صاحب بڑے خوش الحان تھے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو اُن سے سورۃ یٰسین سُنانے کی فرمائش کر دیتے۔ اب قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں اور اختر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہ اِس محفل کا آخری آئٹم ہوتا تھا کیوں کہ اس کے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔

ان محفلوں میں اختر صاحب اپنا کلام تو کُجا ایک شعر تک سنانے کے روادار نہ تھے۔ نہ ہی کوئی شخص وہاں پینے پلانے کا تصوّر کر سکتا تھا۔ اُن کا اپنا یہ حال تھا کہ کلال کے ہاں سے پی آئے اور ایک ادّھا شیروانی کی جیب میں چھپا لائے۔ اسے ڈیوڑھی کے بھاری بھرکم دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں رکھ دیتے۔ وقفے وقفے سے اُٹھ کر دروازے کی اوٹ میں جاتے اور گھونٹ لے لیتے۔ اُٹھنے سے پہلے مجمع پر نظر ڈال کر ''میں ابھی حاضر ہوا'' کہا، اگر میں نظر پڑ گیا تو کسی بہانے مجھے گھر کے اندر بھیج دیتے۔ میں سمجھ جاتا اور وہاں سے کھسک لیتا۔ اُنھیں اِس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ میرے بچوں کو کہیں مجھ سے نفرت نہ ہو جائے۔ اصل میں اُن کی یہ محفلیں بادہ نوشی اور شعر فروشی کی مجلسیں نہ تھیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اُن کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی اور یہ کشش عبارت تھی علم وفن، آداب واخلاق، شرم وحیا، خلوص ووفا، مودت ومروّت اور سب سے بڑھ کر دوسروں سے ہمدردی کرنے اور ان کے چھوٹے چھوٹے غم بانٹ لینے سے۔ رات دس گیارہ بجے محفل برخاست ہوتی۔ وہ اُٹھ کر اندر آتے اور چند لقمے کھا کر سو رہتے۔

اُن کی آمدنی محدود تھی اور اخراجات بھی۔ کھانا گھر سے مل جاتا تھا۔ اپنے لیے کپڑا اُنھوں نے شاید ہی کبھی خریدا ہو۔ اُن کا لباس تیار کروانا اُن کی والدہ کی ذمہ داری تھی۔ جیب خالی ہونے کی صورت میں (اور یہ اکثر ہوتا تھا) سگریٹوں تک کی فرمائش اُنھی سے کی جاتی تھی۔ ہاں نقد پیسے وہ اِس ڈر سے کبھی نہ دیتی تھیں کہ شراب پر صرف ہوں گے۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ایک بار بیٹے کے لیے کُرتا سلوایا اور پہناتے وقت بڑے چاؤ سے اپنی طلائی گھنڈیاں، جن میں تہری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، لگا دیں۔ وہ باہر نکلے۔ کسی ضرورت مند نے سوال کیا۔ اُنھوں نے زنجیریں نوچ کر اُس کو بخش دیں۔ نتیجہ یہ کہ گھنڈیاں بحق سرکار ضبط ہو گئیں اور سیپ کے بٹن ٹانک دیے گئے۔

اصل میں وہ کسی کو دکھ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب کبھی کسی رسالے یا ریڈیو سٹیشن سے روپیہ آتا تو اُس کا ایک حصّہ شراب اور سگریٹ پر صرف ہوتا اور باقی سائلوں کے کام آتا۔ مے خانے سے گھر تک راستے ہی میں پیسے ختم ہو جاتے۔ واپسی پر اگر اتفاق سے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور خود باہر جا بیٹھے تو ہم بڑے تجسّس اور اشتیاق سے تلاشی لیتے۔ منی آرڈر فارم کا پُرزہ تو اکثر نکلتا باقی مال گاؤ خورد، ہاں دو چار آنے ریزگاری کی قسم نہیں۔

خرابی اُس وقت ہوتی جب اُن کی جیب خالی ہوتی اور کوئی سوال کر بیٹھتا۔ ایک بار حسبِ معمول دادی جان نے اُن کے لیے بوسکی کی دو قمیضیں سلوائیں۔ پہلے ہی دن قمیض پہن کر باہر گئے۔ کسی شخص نے اپنے بوسیدہ کپڑے دکھا کر کچھ پیسے طلب کیے۔ جیب میں کچھ تھا نہیں۔ چنانچہ نئی قمیض اُتار کر اُسے دے دی اور بنیان پر شیروانی پہن کر گھر آ گئے۔ دادی جان نے آڑے ہاتھوں لیا کہ قمیض میں نے بنوائی تھی۔ تم دے ڈالنے والے کون تھے؟ بیٹے نے معصومیت سے کہا: ''امی! اُس آدمی کی قمیض تار تار تھی۔ جب اُس نے سوال کیا تو میں انکار نہ کر سکا'' اور دادی جان کا آخری فقرہ مجھے خوب یاد ہے: ''بیٹا کسی دن پاجامہ اُتار کر نہ دے آنا۔''

پاجامے کی نوبت تو خیر نہ آئی مگر ایک موقع پر تھوڑی سی کسر رہ گئی جب وہ سلیپر پاؤں میں ڈالے باہر نکلے۔ کسی سائل نے، جو ننگے پاؤں تھا، امداد کی التجا کی۔ یہ اُس کو ساتھ لگا لائے۔ ڈیوڑھی میں پہنچ

کر سلیپر اُس کے حوالے کیے اور آپ گھر میں داخل ہو گئے۔

ایک بار مجھے ہوائی بندوق لے کر دی۔ بندوق پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر باغ میں فاختاؤں کو نشانہ بناتا لیکن یہ حرکت فلک پیر کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چند ہی ماہ گزرے ہوں گے کہ کسی اللہ کے بندے نے مانگ لی۔ جب بندوق لینے اندر آئے تو میں بہت مچلا مگر یہی کہتے رہے کہ ہم تمھیں اور لے دیں گے۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اپنے مقالے میں یہ واقعہ اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: ''ٹونک میں کسی نے نشے کی حالت میں اُن سے ایئر گن چھین لی۔ پھر یہ تمام عمر ڈھونڈتے رہے (۸)۔

اِس ضمن میں گزارش ہے کہ چھیننے کی بات درست نہیں ہے اور تاعمر ڈھونڈنا تو درکنار، کسی دی ہوئی چیز کو واپس طلب کرنا بلکہ اس کا تصوّر بھی اختر صاحب کے مزاج سے بعید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایئر گن کا قصّہ اُنھوں نے اگلے ہی لمحے فراموش کر دیا تھا البتہ میں کچھ عرصے تک یہ توقع لگائے رہا کہ وہ مجھے حسبِ وعدہ دوسری بندوق لے دیں گے۔

یہ دردمندی، وسیع القلبی اور کشادہ دستی اختر صاحب کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ کسی سائل کا سوال رد نہیں کر سکتے تھے بلکہ از خود بھی ضرورت مندوں کی امداد پر آمادہ رہتے تھے۔ محبّی احمد ندیم قاسمی صاحب، ریاض شاہد (۹) مرحوم کے حوالے سے لاہور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو یوں ہے کہ اختر صاحب ریڈیو سٹیشن سے تانگے میں بیٹھ کر موہنی روڈ اپنے کسی دوست کے پاس جا رہے تھے۔ راستے میں کسی وجہ سے تانگے والے کا چالان ہو گیا۔ آگے بڑھے تو اختر صاحب کو ایک جگہ ریاض شاہد نظر پڑے۔ اُنھیں بھی ساتھ بٹھا لیا اور موہنی روڈ پہنچ گئے۔ دروازے پر دستک دے کر اختر صاحب نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا جو شاید اُنھیں ریڈیو سٹیشن سے ملا تھا۔ اُنھوں نے یہ نوٹ تانگے والے کی طرف بڑھایا اور بولے: ''تانگے والے! مجھے بڑا افسوس ہے کہ تمھارا چالان ہو گیا۔ یہ پیسے تم رکھ لو۔'' اُن دِنوں میں سو روپے بڑی رقم تھی اور تانگے کا کرایہ چار آنے۔ لہٰذا تانگے والا گھبرا گیا۔ اِس اثنا میں وہ دوست گھر سے نکلا۔ اُس نے یہ صورت دیکھی تو جیب سے دس روپے نکال کر تانگے والے کو دینا چاہے لیکن اختر صاحب نہ مانے اور

تانگے والے کو اُن سے سو روپے لیتے ہی بنی۔

اختر کی شرم وحیا کا یہ عالم تھا کہ کسی واقف کار کی امداد کرتے ہوئے اُس سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔ ''نقوش'' والے محمد طفیل صاحب نے اپنے مضمون (۱۰) میں نازش مرحوم (۱۱) کا بیان کردہ ایک واقعہ درج کیا ہے۔ ہُوا یہ کہ اختر کے کسی دوست کی نوکری چھوٹ گئی اور بے روزگاری کے ہاتھوں فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ اُنھیں معلوم ہوا تو بے تاب ہو گئے۔ کسی نہ کسی طرح تین سو روپے فراہم کیے اور نازش کو ساتھ لے کر دوست کی قیام گاہ پر پہنچے۔ خود نیچے ٹھہر گئے اور نازش سے کہا کہ یہ روپے اُوپر جا کر دے آؤ۔ نازش نے کہا کہ آپ اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں دیتے؟ کہنے لگے: ''مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

سنہ ۴۶۔ ۱۹۴۵ء میں جدّن بائی نے بمبئی میں ایک فلم ''رومیو جولیٹ'' بنائی تھی۔ جس میں اُن کی بیٹی اور اُس دور کی معروف اداکارہ نرگس نے جولیٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ جدن بائی کو اِس فلم کے گانوں میں شامل کرنے کے لیے اختر صاحب کی ایک نظم ''تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے'' پسند آ گئی۔ اُنھوں نے باقاعدہ لکھ کر اجازت طلب کی اور یہ بھی دریافت کیا کہ وہ اِس کا کیا معاوضہ قبول کریں گے؟ اختر صاحب نے بلا معاوضہ اجازت دے دی۔ جدن بائی بڑی وضع دار خاتون تھیں۔ اُنھوں نے نظم کی فلم میں شمولیت کے ساتھ ہی ایک تولہ وزنی طلائی انگوٹھی اختر صاحب کے لیے اور ڈیڑھ تولہ وزن کے طلائی کانٹے اُن کی بیگم کے لیے خاص طور پر بنوا کر بھجوائے۔ انگوٹھی پر اختر کے پہلے حرف (A) کا بڑا خوب صورت مونوگرام کندہ تھا۔ اُس دن شام کے وقت اُنگلی میں ڈال کر نکلے۔ واپس آئے تو اُنگلی خالی تھی۔

اختر صاحب کے پرستار مختلف شہروں سے تحائف بھجوایا کرتے تھے۔ جب تک یہ چیزیں عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم نہ ہو جاتیں اُنھیں چین نہ آتا تھا۔ ایک بار مراد آباد سے بڑے نفیس نقشین عطر دانوں اور گُلدانوں کا ہدیہ آیا۔ ان میں سے صرف ایک عطر دان گھر والوں نے رکھ لیا۔ کچھ دن بعد کوئی عزیزہ ملنے آئیں۔ اختر صاحب نے اپنا مخصوص جملہ ''ہم تمھیں اور منگوا دیں گے'' کہتے ہوئے وہ عطر دان اُس عزیزہ کو دے ڈالا۔

اگر کوئی شخص اُن کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتا تو اسے کبھی فراموش نہیں کرتے تھے اور کوشش

کرتے کہ اس سے بڑھ کر حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں۔میں دربار ہائی سکول،ٹونک میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ایک دن ماسٹر محفوظ صاحب ہمیں ریاضی پڑھا رہے تھے کہ کسی شخص نے اُن کو باہر بلایا۔وہ گئے اور ذرا دیر بعد سگاروں کا ایک خوب صورت ڈبہ ہاتھ میں لیے واپس آئے۔تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے سے پہلے بے اختیار سے ہو کر کہنے لگے:''یہ اختر شیرانی صاحب بھی کیسے بااخلاق آدمی ہیں۔ چند روز قبل ایک محفل میں اُنھوں نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جیب خالی تھی۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا اور اُن کی خدمت میں سگریٹ پیش کر دیا۔اب یہ دیکھو اِتنے قیمتی سگاروں کا ڈبہ اُنھوں نے مجھے تحفے میں بھجوایا ہے۔''

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اختر صاحب اپنی محدود اور بے قاعدہ آمدنی کے باوجود ایسی کشادہ دلی اور فراخ دستی کا مظاہرہ کیسے کر لیتے تھے؟ تاہم جیسا کہ اُوپر بیان کردہ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے معاملہ بیش وکم کا نہیں بلکہ اندازِ چشمِ کرم کا تھا۔اُن کی اس بذل وعطا کی عادت سے حافظ صاحب بھی باخبر تھے۔اِس لیے جب ۱۹۴۵ء کے آخر میں اُن کی صحت تیزی سے گرنے لگی تو اُنھوں نے اپنے طلائی اور نقرئی سِکّوں کا گراں قدر مجموعہ اونے پونے فروخت کر دیا اور اس سے حاصل ہونے والی بائیس ہزار روپے کی رقم رتلام والے (۱۲) سیٹھوں کے ہاں ہمارے نام جمع کرادی۔

اختر صاحب نے مُدّت العمر کوئی ملازمت نہیں کی اِس لیے باقاعدہ آمدنی کی صورت کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔لاہور سے جو ادبی رسالے وہ نکالتے تھے وہ بھی اپنا خرچ ہی پورا کر پاتے تھے۔اُس دور سے متعلق اختر صاحب کی شفقت اور ہمدردی کا ایک واقعہ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے سنہ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں مجھے سنایا تھا (۱۳)۔پورے چھتیس برس تک میں نے اِس روایت کو اپنے تک محدود رکھا لیکن ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ء کو جب قاسمی صاحب گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں ''بزمِ شیرانی'' کے افتتاح کے لیے تشریف لائے تو اپنے صدارتی خطاب میں اُنھوں نے یہ واقعہ جلسۂ عام میں بیان کیا۔یہ صدارتی خطبہ کالج کے رسالے ''مرغزار'' (شمارہ اپریل ،۱۹۹۶ء) میں شائع ہو چکا ہے۔اِس واقعے میں جہاں اختر صاحب کے اوصافِ حمیدہ کی جھلک نظر آتی ہے وہاں اس کے اعلان سے خود قاسمی صاحب کی عظمتِ کردار کا اندازہ بھی

ہوتا ہے۔اِس لیے میں یہاں اِسے بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یہ سنہ ۳۶۔۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔قاسمی صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے اور ریلوے روڈ پر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک کرائے کے کمرے میں رہتے تھے۔اختر صاحب کو جب ان کی بے کاری کا علم ہوا تو بقول قاسمی صاحب ''وہ ایک ایسے وقت میں جب ہم دونوں بھائی موجود نہ تھے اور کمرہ مقفّل تھا تشریف لائے اور اپنے محیّر العقول حد تک خوب صورت خط میں ایک چٹ دروازے کے اندر ڈال گئے۔اس میں لکھا تھا کہ جب تک تمھیں کوئی معقول ذریعۂ معاش نہیں ملتا تم میرے مہمان ہو اور تم میرے حساب میں ریلوے روڈ کے عرب ہوٹل میں صبح شام کا کھانا کھاؤ گے اور ساتھ ہی ناشتہ بھی وہیں کرو گے۔میں نے ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا ہے، بغیر کسی تکلّف کے وہاں جانا شروع کر دو۔''

قاسمی صاحب اختر صاحب کے احترام کے باعث اس مخلصانہ پیش کش کو رد نہ کر سکے اور یہ سلسلہ چند ماہ جاری رہا۔قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی دو ماہ گزرنے کے بعد میں نے یہ بات نوٹ کی کہ جب میں کھانا کھانے جاتا ہوں تو کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہوٹل کا مالک مجھے ایک خاص انداز سے دیکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ اُس کی نظروں سے میں مضطرب ہو جاتا تھا۔میرا خیال تھا کہ کیونکہ اختر صاحب ہوٹل کا بل ادا کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں اِس لیے اس کے مالک پر میرا کھانا بار گزرتا ہے۔ایک روز جب میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، ہوٹل کا مالک کاؤنٹر سے اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا۔میں نے بمشکل کھانا ختم کیا اور ہاتھ دھونے کے لیے اُٹھا تو وہ بولا : ''آج آپ میرے ساتھ چائے پئیں گے۔'' میں نے کہا: ''میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس پر کہنے لگا: ''آج تو میری خوشی کی خاطر آپ کو چائے پینا ہوگی۔'' مجھے ماننے ہی بنی۔ چائے پینے کے دوران میں وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: ''میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔آپ کو پتا ہے کہ اختر صاحب اپنا بل ادا کرنے میں لاپروائی کے عادی ہیں لیکن جب سے آپ کھانا کھانے لگے ہیں، وہ باقاعدگی سے مہینے کی پہلی تاریخ کو آ کر ادائیگی کر دیتے ہیں۔''

اختر کے نمایاں شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی صاحب، ن۔م۔راشد، شورش کاشمیری، مرزا

ادیب، کنیز فاطمہ حیا اور عزیز جہاں بیگم ادا (جعفری) کے نام لیے جاتے ہیں۔ دراصل اختر صاحب شاعری میں روایتی اُستادی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں بہت سے نومشق شعرا اپنے ظرف کے مطابق اُن سے مستفید ہوتے تھے۔ متعدد نوجوان شاعروں کا کلام اُن کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے رسالوں میں چھپتا تھا اور یوں اصلاح کی ایک صورت خود بخود پیدا ہو جاتی تھی۔ اِس ضمن میں قاسمی صاحب فرماتے ہیں: ''اختر سے مجھے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں تھا مگر وہ میرا نومشقی کا کلام شائع کرتے ہوئے کسی شعر میں کوئی ایک آدھ تبدیلی کر دیتے تھے۔ اس سے میں اپنی اصلاح کر لیتا تھا(۱۴)۔

قمر تسکین اپنے ایک مضمون میں یہ دلچسپ اطلاع فراہم کرتے ہیں: ''۱۹۴۲ء(۱۵) کا ذکر ہے۔ راقم الحروف، ظفر چودھری اور اختر شیرانی مرحوم اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ کے بالمقابل عرب ہوٹل میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے کہ سانولے رنگ کا ایک نوجوان داخل ہوا اور اختر مرحوم کو سلام کر کے بڑے ادب سے اُن کے قریب بیٹھ گیا اور اُس نوجوان نے ایک کاغذ اختر مرحوم کی طرف بڑھا دیا۔ اختر نے فوراً ہی جیب سے قلم نکالا اور اِصلاح شروع کر دی۔ اختر کو اس نوجوان کی غزل میں ایک شعر سخت ناپسند تھا، اِس لیے اُنھوں نے اس شعر کو حذف کر کے اس کی جگہ ایک اور شعر لکھا۔ پھر اپنے شاگرد کو حذف کردہ شعر کی اغلاط سے واقف کیا اور اُس کی جگہ جو شعر لکھا تھا وہ پڑھا:

اے دوست ہم نے ترکِ تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

اختر کے اس نوجوان شاگرد کا نام ناصر کاظمی تھا اور متذکرہ شعر ناصر کاظمی کی غزل میں اُستاد کا عطیہ تھا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ شعر اس غزل کی جان قرار پایا ہے(۱۶)۔''

اِصلاح کا یہ سلسلہ کسی حد تک ٹونک میں بھی جاری رہا بلکہ عطایا میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ پھر عالمِ مستی میں بعض لوگ اُن کا تازہ کلام بھی ہتھیا لیتے تھے، تبرّکاً اپنے پاس رکھنے کی خاطر یا مشاعروں میں پڑھنے کی غرض سے۔ اسی طرح اختر کا بہت سا کلام منتشر اور ضائع ہو گیا۔ میں فروری ۱۹۹۶ء میں ٹونک گیا ہوا تھا اور اختر صاحب کے جگری دوست صاحبزادہ حامد سعید خاں(۱۷) ساحل مرحوم کے فرزند محمد رشید خاں عرف محمد

میاں کے ہاں قیام پذیر تھا۔ ایک دن ایک صاحب، جن کا نام پیر مقصود علی خان تھا، آئے اور صاحبِ خانہ کی فرمائش پر ترنّم کے ساتھ نعتیں سُنانے لگے۔ محمد میاں نے اُن سے پوچھا: ''آپ کو اختر شیرانی کی بھی کوئی نعت یاد ہے؟'' اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا اور یکے بعد دیگرے تین نعتیں سُنائیں جن میں اختر تخلّص بھی موجود تھا۔ ایک کا مطلع یاد ہے:

بارِ عصیاں سے نہیں اُٹھتا قدم سیدنا!
وقتِ امداد ہے، ہو جائے کرم سیدنا!

میں نے اِس سے پہلے یہ نعتیں نہ کبھی سُنی تھیں نہ کہیں پڑھی تھیں۔ میں نے جب محمد میاں سے اِس بات کا ذکر کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہاں ٹونک میں بہت سے لوگوں کے پاس اختر مرحوم کا ایسا کلام موجود ہے جو اُن کے مجموعہ ہائے کلام میں شامل نہیں بلکہ ایک صاحب کے پاس تو اختر کی ایک پوری بیاض ہے جس کے مندرجات کو وہ مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھا کرتے ہیں۔ تاہم بہت سے لوگوں کو اس کی حقیقت کا علم ہے۔ نعتوں کے ذکر سے یاد آیا کہ اختر صاحب عشقِ رسولِ اکرم سے سرشار تھے اور دل کی گہرائیوں سے نعت کہتے تھے۔ شورش کاشمیری مرحوم نے اختر کے عشقِ رسول ﷺ کا ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا ہے جو عرب ہوٹل میں پیش آیا تھا اور جس میں اختر صاحب نے مدہوش ہونے کے باوجود ایک گستاخ نوجوان کی سرزنش کی تھی۔ بقول شورش: ''پھر بے اختیار رونے لگے۔ کہتے جاتے، ہم عاصیوں کا تو ایک ہی ٹھکانہ ہے، سرکارِ مدینہ، دربارِ مدینہ اور اس اشکبار حالت ہی میں اُنھوں نے یہ شعر کہہ ڈالے۔ معلوم نہیں یہ ارتجالاً تھے یا اس سے پہلے وہ یہ نعت کہہ چکے تھے (۱۸) لیکن جب ایک ایک بند بول رہے تھے تو اُن کے گالوں پر آنسوؤں کے قطرے عقیدت کے چراغ بن کر روشن تھے (۱۹)۔''

ٹونک میں محافلِ میلاد کا بڑا رواج تھا بالخصوص خواتین میں۔ محلّہ شاگرد پیشہ کی ایک ادھیڑ عمر خاتون، بستی خالہ جو جگت خالہ تھیں اور اُن کی ایک بہن ان محفلوں کی رونق ہوتی تھیں۔ کیا پختہ اور پاٹ دار آوازیں تھیں۔ اکثر میلادِ خلیل (۲۰) پڑھا جاتا تھا۔ ایک رات ہمارے ہاں زنانہ محفلِ میلاد تھی۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے اُوپر کی منزل پر اہتمام کیا گیا تھا۔ اختر صاحب نیچے صحن میں تھے۔ جب یہ نظم پڑھی جانے لگی کہ:

خوب تو نے مجھ کو مولا رنگ دیا
او رنگیلے ، رنگ اچھا رنگ دیا

تو اختر صاحب بھنّا گئے۔ بولے: ”یہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ نیلا رنگ دیا، پیلا رنگ دیا۔“ پھر اُسی وقت یہ نعت لکھ کر دی:(۲۱)

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا — مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا
خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی — شبستانِ حرا کا آج وہ ماہِ تمام آیا

کُل نو اشعار ہیں اور آخری شعر یہ ہے:

مزا جب ہے کہ جائیں خُلد میں ہم اِس طرح اختر — کہیں حوریں، محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

اختر صاحب اپنے والد کی ناراضگی کے باوجود اُن کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اُنھیں اِس بات کا اعتراف تھا کہ بابا کی اُن سے برہمی بلا جواز نہیں ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جو کچھ مجھے بنانا چاہتے تھے وہ میں بن نہیں سکا۔ اپنی والدہ سے اُن کی محبّت کا یہ عالم تھا کہ اس کے بیان کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہوش وحواس سے عاری ہونے کی حالت میں بھی اُنھوں نے والدہ کے احترام کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ یہی روّیہ اُن کا اپنی دوسری والدہ کے ساتھ تھا۔ اُن دونوں کے آگے تو بالکل بچہ بن جاتے تھے۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد عدّت پوری ہونے پر ہماری دوسری دادی جان عزیزوں سے ملنے کے لیے ہمارے آبائی گاؤں شیرانی آباد گئیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ماہ رہنے کا خیال تھا۔ جاتے ہوئے اُن سے کہہ بیٹھیں: ”مَیں تمھاری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ناراض ہو کر جا رہی ہوں، اب واپس نہیں آؤں گی۔“ اُس وقت تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن ابھی اُن کو گئے دو ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ بے قرار ہو گئے۔ مجھے ایک عزیز کے ہمراہ اُن کو لینے کے لیے بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تب اُنھیں چین آیا۔

سرزمین ٹونک سے اختر صاحب کو بڑی محبّت تھی اور یہ فطری عمل تھا۔ اُن کے بچپن اور لڑکپن کا سنہری دور اسی شہرِ شعر و حکمت میں گزرا تھا۔ ٹونک سے اپنی محبت کو اُنھوں نے ”او دیس سے آنے والے

بتا'' جیسی لافانی نظم لکھ کر زندہ وجاوید بنا دیا ہے۔ اگرچہ نظرِ ثانی کرتے وقت اُنھوں نے نظم کی اپیل میں وسعت پیدا کرنے کی خاطر کچھ ترامیم کر دی تھیں اور کچھ مخصوص ناموں کو عمومی الفاظ سے بدل دیا تھا لیکن اب بھی نظم کے ۳۳ بندوں میں سے اکثر میں ٹونک کا نہاں وعیاں تذکرہ موجود ہے مثلاً دریائے بناس اور ٹونک شہر کے محلّ وقوع کے بارے میں یہ بند:

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شہر کے گرد اب بھی ہے رواں — دریائے حسیں لہرائے ہوئے
جوں گود میں اپنے من کو لیے — ناگن ہو کوئی تھرّائے ہوئے
یا نور کی ہنسلی ، حور کی گردن — میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے
او دیس سے آنے والے بتا

یا ٹونک کے شہر اور اُس کے معاشرے کی یہ جھلک:

او دیس سے آنے والے بتا
ویرانیوں کی آغوش میں ہیں — آباد وہ بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے — پھرتے ہیں طرح دار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں — ترکانِ سیاہ کار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

اور اِس بند میں تو ٹونک کے بعض آثار کا نام لے کر اُس کی یاد تازہ کی ہے:

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر — تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
اَن پورنا کے اُجڑے مندر پر — مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سُنسان گھروں پر چھاؤنی کے — ویرانی و رِقّت طاری ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا

اِس نظم کے علاوہ بعض دیگر منظومات مثلاً ''نذرِ وطن''اور''اے ابرِ رواں جا سُوئے وطن''یا''اُجڑے ہوئے پائیں باغ میں''بھی صریحاً ٹونک کی یادوں سے معمور ہیں۔

اختر صاحب کو ٹونک کی طرح اہلیانِ ٹونک سے بھی گہری محبّت تھی۔حافظ صاحب مرحوم بیزاری کی حد تک گوشہ نشین تھے اور یہ اُن کی علمی اور تحقیقی مصروفیات کا تقاضا بھی تھا۔اختر صاحب اپنے والد کے مقابلے میں نہایت ملنسار اور کثیر الاحباب تھے۔ہر کہ ومہ سے بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ملتے۔

میں جنوری ۱۹۸۲ء میں عریبک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،ٹونک کے منعقد کردہ حافظ محمود شیرانی سیمینار میں شرکت کے لیے گیا۔مجلسِ یادگارِ حافظ محمود شیرانی،لاہور کے نمائندے کی حیثیت سے عزیزی عبدالقیوم،ٹونک کے دو اہلِ علم صاحبزادہ شوکت علی خاں اور سیّد منظور الحسن برکاتی صاحبان کی خدمت میں طلائی تمغے (۲۲) پیش کرنے کی غرض سے میرے ہمراہ تھے۔سیمینار میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جو مقامی مقررین حافظ صاحب کی حیات و خدمات پر اِظہارِ خیال کے لیے آتے وہ اصل موضوع پر سرسری گفتگو کرنے کے بعد اختر صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔عبدالقیوم کو یہ بات پسند نہ آئی۔دبی زبان سے شکایت کی۔میں نے کہا:''خاموش رہو،تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔''لیکن اُن کی تشفّی نہ ہوئی۔درمیانی وقفے میں اُنھوں نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شوکت علی خاں صاحب سے باقاعدہ احتجاج کیا۔اُنھوں نے اس کی توجیح کرتے ہوئے کہا:''بھائی!بات دراَصل یہ ہے کہ محمود شیرانی صاحب کی علمی خدمات کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے بڑے وسیع مطالعے اور گہری نظر کی ضرورت ہے۔رہی اُن کی شخصیت تو ان مقررین میں سے اکثر کو ٹونک میں رہنے کے باوجود اُن سے ملاقات کی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی اور اختر صاحب کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔وہ ہر ایک سے بڑی اپنائیت سے ملتے تھے۔جو بھی ایک بار اُن سے مل لیتا تھا وہ اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور لُطف یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ اُسی سے محبّت کرتے ہیں۔''

دوسرے دن میں اور عبدالقیوم،صاحبزادہ نصیر الدین حیدر (۲۳) سے ملنے گئے۔اُنھوں نے چھوٹتے ہی شیرانی صاحب سے اپنے مراسم کا تذکرہ چھیڑ دیا،عبدالقیوم بڑے اشتیاق سے سُنتے رہے۔

کچھ دیر بعد بے ساختہ پوچھا: ’’آپ حافظ صاحب کا ذکر کر رہے ہیں نا؟‘‘ صاحب زادہ صاحب کا ردِّعمل فوری اور دلچسپ تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: ’’ارے توبہ! میاں اُن سے بات کرنے کا کسے یارا تھا۔ اُن کو تو ہم تانگے میں بیٹھے ندی آتے جاتے دیکھ لیتے تھے۔ لوگ دور ہی سے کہتے تھے، وہ محمود شیرانی صاحب جا رہے ہیں۔ اُن کے علم و فضل کا تو ہم جیسے اندازہ بھی نہیں کر سکتے جن کا اپنے شاعر، ادیب اور عالم وفاضل بیٹے کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ کمبخت جاہل رہ گیا۔ ارے جاہل!‘‘

سیّد منظور الحسن برکاتی صاحب نے میرے نام ایک خط میں اختر صاحب کی شخصیت پر یہ بلیغ تبصرہ کیا تھا: ’’وہ ایک ایسا شخص تھا جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔‘‘

جنوری ۱۹۸۲ء کے قیامِ ٹونک کے دوران میں حکیم سیّد برکات احمد مرحوم و مغفور کی یادگار دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ کے ریکٹر شفاء الملک حکیم ظہیر احمد برکاتی مرحوم نے مجھ ہیچ مداں کو ایک باوقار خطاب سے متفخر کرنے کی غرض سے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اس اجلاس میں ٹونک کے نغز گو شاعر حضرت دل ایوبی مرحوم نے ایک خیر مقدمی نظم پڑھی۔ اس کے ایک بند میں بھی اختر کی اس نمایاں صفت کے بارے میں اِشارہ موجود ہے۔ وہ بند یہ ہے:

جن میں تم کھیلے تھے وہ گلیاں جواں ہیں آج بھی
آرزوئیں زندہ ہیں ، ارماں جواں ہیں آج بھی
پھول خنداں ہیں، کلیاں جواں ہیں آج بھی
عشق کے سارے سروساماں جواں ہیں آج بھی
ہاں مگر اختر سا کوئی چاہنے والا نہیں
آج لاکھوں میں بھی کوئی عشق کا مارا نہیں

ہمارا خاندان بھی ٹونک کے بہت سے گھرانوں کی طرح سیّد احمد شہید علیہ الرحمۃ سے نسبت اور اُن کے ساتھی مجاہدین سے نسبی تعلق کی بنا پر دین سے خصوصی شغف رکھتا تھا۔ اختر صاحب کی مَے نوشی حافظ صاحب کے لیے سوہانِ روح تھی ہی، باقی اہلِ خاندان کو بھی اس کا بڑا قلق تھا۔ بعض بہی خواہ اِس عادت

سے نجات کے لیے نسخے اور ٹوٹکے بتاتے رہتے تھے۔ایک بار ماسٹر مٹھولال جی (۲۴) نے، جو مجھے گھر پر پڑھانے کے لیے آتے تھے، یہ تجویز پیش کی کہ اختر صاحب کو شراب سے بچانے کے لیے بھنگ پر لگا دیا جائے۔وہ بڑی رازداری کے ساتھ کسی حلوائی سے خاص طور پر بھنگ کی برفی تیار کروا کے لائے۔ ہلکے سبز رنگ کی یہ برفی اِتنی پُرکشش تھی کہ گھر والوں کے لیے اسے میری دست بُرد سے بچانا دشوار ہو گیا۔ چند روز تک یہ اختر صاحب کے دستر خوان پر سجائی جاتی رہی لیکن اُنھوں نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔:

غالبم تشنۂ تلخاب نہ ہمچو حافظ
عاشق شاخِ نباتم تنانا ہا یاہُو

پھر کسی بقراط نے رائے دی کہ اگر شیر کا جھوٹا گوشت پکا کر کھلایا جائے تو شراب ہمیشہ کے لیے چھوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ جے پور کے چڑیا گھر سے رابطہ کر کے شیر کا پس خوردہ منگوایا گیا اور بڑے اہتمام سے بھون کر اختر صاحب کے آگے رکھا گیا۔اُنھوں نے کھایا بھی لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فش۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حِنا باندھتے ہیں

اور شراب چھوڑی تو کس وقت! جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال (لاہور) میں داخل ہوئے۔حالت سقیم ہوئی تو ڈاکٹروں نے صلاح کر کے کوشش کی کہ اُنھیں دو ایک گھونٹ بطور دوا پلائے جائیں، ممکن ہے اِس ترکیب سے ضُعف میں کچھ افاقہ ہو۔لیکن جب آبِ طربناک کا جام مُنہ کے نزدیک لے جایا گیا تو اس کی بُو سُونگھتے ہی ہونٹ بھینچ لیے اور مُنہ کی طرف اشارہ کر کے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اُٹھا دی۔مطلب یہ تھا کہ مَے آلود دہن لے کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونا مناسب نہیں۔

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کُن
بر جان و دل اسیر من رحمت کُن
بر پائے خرابات رومن بخشای
بردست پیالہ گیر من رحمت کُن (۲۶)

شرفائے ٹونک کے دستور کے مطابق حافظ صاحب بہلی یعنی بیلوں کا تانگہ رکھا کرتے تھے۔اُن

کے انتقال کے بعد یہ اختر صاحب کے قبضے میں آ گیا۔ بیلوں کی جوڑی اور عتیق گاڑی بان کی شامت آئی رہتی تھی۔ سارا سارا دن گھومتے۔ کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ دوستوں کے ہاں جاتے مگر کہیں ٹکتے نہیں تھے۔ دو چار منٹ بات کی اور عتیق کو گاڑی بڑھانے کا اِشارہ کیا۔ ہاں دو ایک بار صاحبزادہ سردار محمد خان (۲۷) کے ہاں اُن کے دیوان خانے میں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور میں پہلو بدلتا رہا۔

ایک دن خدا جانے کیا جی میں آئی کہ پرانے شہر میں رتلام والے سیٹھوں کی حویلی پر جا دھمکے۔ ہم بہن بھائیوں کے نام رقم اُن ہی کے ہاں جمع تھی۔ منیم جی نے باہر آ کر سواگت کیا لیکن وہ اُن کا مطالبۂ زر تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اختر صاحب کی دلیل یہ تھی کہ یہ پیسے میرے باپ کے ہیں سیٹھوں کے باپ کے نہیں۔ کچھ دیر ردّ وکد رہی بالآخر منیم جی نے کچھ نذرانہ دے کر جان چُھڑائی۔

حافظ صاحب کی وفات فروری ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ کیا اصول پرست اور وضع دار انسان تھے۔ بیٹے کو بیماریِ مرگ میں بھی یاد نہیں کیا۔ اُن کی وفات کا اختر صاحب کو بے حد صدمہ ہوا۔ خاندان کی سربراہی کا بوجھ سر پر آن پڑا۔ ان ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونا اُن کے بس کی بات کہاں تھی۔ یہاں تو آلامِ روزگار سے چھٹکارے کا ایک ہی علاج تھا۔

غمِ زمانہ نہیں، اِک عذاب ہے ساقی!
شراب لا، مری حالت خراب ہے ساقی!

مے نوشی میں تسلسل اور کثرت پیدا ہو گئی۔ ایّامِ مسترقہ کی تعداد گھٹتے گھٹتے صِفر تک پہنچی۔ بہکنے اور ہنکارنے لگے۔ رات رات بھر حویلی اور پائیں باغ میں موہوم ہیولوں کے پیچھے بھاگتے رہتے اور غیر مرئی چیزوں پر جھپٹتے۔ گھر کے ماحول میں ایسا ہراس پیدا ہو گیا کہ آج بھی تصوّر سے دم گُھٹتا ہے۔

اِس جسمانی اور ذہنی صحت کے زوال پر مستزاد مالی پریشانی تھی۔ ملک کا سیاسی مطلع ابر آلود ہی نہیں خوں بار بھی تھا۔ ان حالات میں مشاعروں میں اور ریڈیو سٹیشنوں پر جانے کا کیا مذکور، رسالوں کو تازہ کلام کی فراہمی کا سلسلہ بھی منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن اُدھار کی شراب کہاں تک چلتی۔ چنانچہ عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں سے استمداد تک نوبت پہنچی۔ وہ شخص جس کا احترام مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زعمائے قوم بھی ملحوظ رکھتے تھے، دخترِ رز کے ہاتھوں اِن

حالوں کو پہنچ گیا۔

۱۹۴۶ءاور ۱۹۴۷ء کے دو سال ہم پر بڑے شاق گزرے۔ پاکستان بنا تو اختر صاحب نے اپنی قوّتِ ارادی کو مجتمع کیا۔ پروگرام یہ بنا کہ وہ لاہور جائیں گے اور وہاں مکان کا بندوبست کر کے ہم لوگوں کو بلوالیں گے۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں وہ جوں توں کر کے لاہور پہنچے اور اپنے حبیبِ لبیب حکیم نیّر واسطی صاحب کے ہاں قیام کیا۔ نیّر منزل سے اُنھوں نے جو خط لکھے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ضرور تھا۔ ان خطوں میں مختلف اطلاعات کے ساتھ ساتھ آبائی مکان اور دوسری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے بارے میں بعض ہدایات بھی درج ہوتی تھیں۔ اِسی عالم میں چند ماہ گزر گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ میدانِ عمل کے آدمی نہ تھے۔ فسادات کے نتیجے میں لاہور پہنچنے والے مہاجرین کی حالتِ زار نے بھی اُن کے حسّاس دل کو بُری طرح متاثر کیا۔ رہے سہے قویٰ اہلِ خانہ سے مفارقت نے سلب کر لیے۔ اِس دوران میں کہی گئی بعض منظومات سے اُن کی جذباتی کیفیت اور رِقّتِ قلب کا سُراغ ملتا ہے۔ اس مایوسی کا آئینہ دار اُن کا سانیٹ ''مہاجرہ'' ہے جسے میں یہاں درج کرتا ہوں۔

سکوں نہیں مری جانِ بسمل کو
فضائے غم میں مرے قلب کو قرار نہیں
کوئی امید نہیں ہے کہ سوگوار نہیں
وہ گم شدہ ہوں ترستا رہے جو منزل کو
دیارِ غیر میں روئے نشاطِ محفل کو
وہ شاخِ خشک جو معمورِ برگ و بار نہیں
فسردہ گُل جسے امّیدِ نو بہار نہیں
الٰہی! کیا کروں اپنے الم زدہ دل کو
چمن سے دور ہوں اِک بلبلِ حزین وخموش
ستا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی
فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی

گُلوں سے دور ہوں میں اِک گُل حزین وخموش

ہوائے خُلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے
جو مر رہوں تو کنارِ مزار بھی نہ ملے

بالآخر اختر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم لوگ بعض اعزہ کے ہمراہ ٹونک سے چل کر ۱۹۴۸ء کے وسط میں کھوکھراپار اور حیدر آباد سے ہوتے ہوئے لاڑکانہ پہنچے۔ ابھی سنبھلنے ہی نہ پائے تھے کہ لاہور سے اُن کی شدید علالت کا تار ملا۔ ایک عزیز کی معیت میں، میں اپنے چھوٹے بھائی، والدہ اور دادی جان کو لے کر ۱۱ ستمبر کی شام کو لاہور پہنچا تو اُن کے انتقال کو دو روز ہو چکے تھے اور اُن کا جسدِ خاکی ہم لوگوں کے انتظار میں میو ہسپتال کے سردخانے میں رکھا تھا۔ اگلی صبح جب اُن کا تابوت نیّر منزل لایا اور منہ دیکھنے کے لیے رکھا گیا تو میں سب کے اصرار کے باوجود اُن کے چہرے پر نظر نہ ڈال سکا جس کی شعوری توجیہہ شاید میں کبھی نہ کرسکوں۔

(کہاں سے لاؤں اُنھیں)

حواشی

۱۔ ''کیا قافلہ جاتا ہے''صفحہ ۹۰، کراچی، ۱۹۸۴ء

۲۔ شمارہ جنوری ۱۹۲۵ء

۳۔ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''صفحہ ۵۷، کراچی،۱۹۷۶ء

۴۔ طبع اوّل، دہلی ۱۹۴۳ء۔طبعِ دوم انجمن ترقیِ اُردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۹۲ء

۵۔ شفاء الملک حکیم ظہیر احمد برکاتی (وفات جے پور، ۲فروری ۱۹۸۷ء

۶۔ ذفیر صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔نوعمری میں ٹونک آ گئے تھے۔یہاں دارالعلوم خلیلیہ میں پڑھتے تھے۔پھر یہیں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔۱۹۴۷ء میں اُن کے سب عزیز و اقارب بہار کے فسادات میں مارے گئے۔چنانچہ یہ ٹونک چھوڑ کر وطن چلے گئے تھے۔

۷۔ وفات حیدرآباد (سندھ)، ۱۳فروری ۱۹۸۶ء

۸۔ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو اَدب''صفحہ ۵۵۔۵۶

۹۔ معروف صحافی، ہدایت کار اور فلم ساز۔ ۴۵ برس کی عمر میں یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء کو وفات پائی۔

۱۰۔ ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''جناب''لاہور، بار چہارم، ۱۹۸۶ء

۱۱ طفیل صاحب نے یہ صراحت نہیں کی کہ یہ صاحب اختر کے مدیر معاون نازش رضوی مرحوم تھے یا اُن کے عزیز شاگرد اعجاز سکندر نازش، جن کا تعلق کُندیاں سے تھا۔

۱۲۔ ٹونک میں اُن دِنوں بینکنگ کا کام بعض ہندو ساہوکار کیا کرتے تھے۔اُن میں اجمیر والے اور رتلام والے بہت مشہور تھے۔

۱۳۔ میں اُن دِنوں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ایم اے (فارسی) کا طالب علم تھا۔

۱۴۔ ''خاندانِ شیرانی سے وابستہ یادیں''، مطبوعہ ''مرغزار''گورنمنٹ کالج شیخوپورہ، اپریل ۱۹۹۶ء

۱۵۔ اُن دِنوں اختر صاحب غالباً کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ٹونک سے لاہور آئے تھے اور کچھ دن یہاں مقیم رہے تھے۔

۱۶۔ ''شاعرِ رومان اختر شیرانی''، مطبوعہ روزنامہ ''اِمروز''لاہور، ۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء

۱۷۔ متوفی، ۲۷ نومبر ۱۹۸۸ء

۱۸۔ اِس نعت کے پانچ بند اختر کے آخری مجموعہ کلام ''شہرود'' میں شامل ہیں۔

۱۹۔ دیکھیے شورش کاشمیری کا مضمون ''اختر شیرانی کا آخری مجموعہ کلام'' مطبوعہ ''نیرنگِ خیال'' بابت نومبر ۱۹۵۰ء نظم ونثر پر مشتمل یہ میلاد، والیِ ٹونک نواب محمد ابراہیم خاں خلیل کی تصنیف تھا۔

۲۰۔ یہ نعت بھی ''شہرود'' میں شامل ہے۔

۲۱۔ یہ تمغے اکتوبر ۱۹۸۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبِ ولادت کے موقع پر لکھے گئے مضامین کے

۲۲۔ اعتراف میں عطا کیے گئے۔

۲۳۔ نواب ابراہیم علی خاں کے پوتے اور صاحبزادہ عبدالرّشید خاں عرف بھورا میاں کے فرزند تھے۔ میری اُن سے نسبتی عزیز داری بھی تھی۔ سہل ممتنع میں غزل کہتے تھے اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے گفتگو کر رہے ہوں۔

۲۴۔ مٹھولال اُن کی عرفیت تھی۔ اصل نام رمیش چندر جڑیا تھا۔ محلّہ تختہ میں رہتے تھے۔ میں سنہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۸ء تک برابر اُن سے پڑھتا رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب بھی ٹونک جاتا اُن کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ بڑی محبّت سے پیش آتے تھے۔ ابھی سنہ ۲۰۰۰ء کے اوائل میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔

۲۵۔ ''میں غالب ہوں آبِ تلخ (شراب) کا پیاسا، حافظ (شیرازی) کی طرح کوزہ مصری کا رسیا نہیں ہوں۔ تنہ ناہایاہو۔'' (''تنہ ناہایاہو'' فارسی میں رِندوں کا ایک نعرۂ مستانہ ہے)

۲۶۔ ''میرے سینے پر جو غموں کا ٹھکانہ ہے، رحم فرما۔ میرے قید و بند میں گرفتار جان و دل پر رحم کر۔ میرے میخانے جانے والے پاؤں کو بخش دے (اور) میرے جامِ شراب تھامنے والے ہاتھ پر رحم کھا۔''

۲۷۔ نواب ابراہیم خاں کے بھتیجے اور صاحبزادہ اسحاق خاں کے بیٹے تھے۔ عرفیت بندو میاں تھی۔ سول سروس میں چلے گئے تھے۔ ضلع لاڑکانہ کے کلکٹر (ڈپٹی کمشنر) رہ چکے تھے۔ سر شاہنواز بھٹو سے پہلے ریاست جوناگڑھ کے دیوان بھی رہے۔ اُن دِنوں ملازمت سے فارغ ہو کر ٹونک ہی میں قیام پذیر تھے۔

نصر اللہ خاں

اختر شیرانی

گندمی رنگ، اَدھ کھُلی غلافی آنکھیں، دہرا ڈیل، سر کے بال اُلٹے جمے ہوئے۔ انار کے دانوں کی طرح چھوٹے چھوٹے دانت، تھوڑا سا لمبوترا چہرہ، کھڑی ناک، درمیانہ قد۔ لٹھے کی شلوار اور ریشمی قمیص، باریک کتری ہوئی مونچھیں۔

شراب نہیں پیتے تو بجھے بجھے سے رہتے۔ یوں لگتا جیسے چراغ میں تیل ٹھہر گیا ہے، یا جیسے کوئی پھول کُمھلا گیا ہے۔ ایسی حالت میں اُن سے مل کر ہَول آتا۔ وہ کھُل کر بات نہ کر پاتے اور نہ اُن کی بات میں مزا ہوتا۔ اور جب شراب پیتے اور سرُ ور گُٹھتا تو اپنے خول سے نکل آتے، اور یہ دوسرے ہی اختر ہوتے۔

ایک مرتبہ مَیں نے اپنے ایک دوست سے اخترؔ کا تعارف کرایا۔ اخترؔ خوب پیے ہوئے تھے۔ اُن کی بھولی بھولی باتیں سُن کر اور اُن کی بچّوں ایسی شرارتیں دیکھ کر میرے دوست نے کہا:

''یار! اگر شراب پی کر انسان ایسا ہی معصوم ہو جاتا ہے تو شراب ضرور پینی چاہیے۔''

بات یہ ہے کہ شراب پی کر اندر کا انسان باہر آجاتا ہے، اور اصل انسان یہی ہوتا ہے۔

اخترؔ سرتاپا پیار تھے۔ خلوص تھے۔ اُن کا بچپن اُن کی جوانی میں بھی اُن پر مسلّط رہا۔ وہی بھولپن، وہی بچّوں ایسی معصوم معصوم سی شوخیاں، وہی ضد۔ بڑھاپا تو خیر ایسے لوگوں پر آتا ہی نہیں۔

وہ عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے لیکن اُن میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ (یہ تو فُل ٹائم جاب ہے) اور اخترؔ کا مزاج سیمابی تھا۔ وہ بلا کے شرمیلے تھے۔ یُوں عشق کرنے کو اُن کا بہت جی چاہتا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کریں۔ اگر وہ دور سے کسی لڑکی کو دیکھ لیتے تو

تڑپ اُٹھتے۔ اگر کسی مکان کی کھڑکی میں کسی کی جھلک دیکھتے تو دل پکڑ کر بیٹھ جاتے اور پھر اُن کے عشق کا افسانہ شروع ہو جاتا۔ البتہ لڑکی کی نشان دہی اُس کی رسوائی کی وجہ سے نہ کرتے۔ اور پھر کوئی لڑکی بھی ہو، وہ تو لڑکی کی جھلک کو بھی لڑکی سمجھ لیتے تھے اور پھر وہ لڑکی کا کوئی اچھا سا نام رکھ لیتے۔ یہ ضرور ہے کہ اُن کی رومانی شاعری کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں اُن پر مرنے لگی تھیں۔ اُن کو محبّت بھرے خطوط بھی موصول ہوتے لیکن اختؔر کا جواب بڑا عصمت مآب ہوتا۔ اُن کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی لڑکی اُن کے قریب آ کر بیٹھ جاتی تو اُن کی نظریں زمین سے نہ اُٹھتیں اور وہ سوچتے کہ کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائیں۔

یہ جو اختؔر کی شاعری میں ''سلمیٰ''، ''عذرا'' اور ''ریحانہ'' ہیں، وہ حقیقی شخصیتیں نہیں ہیں۔ جس نے ایک جھلک دِکھا کر اُن کا دل موہ لیا بس اُسی کا کوئی اچھا سا نام رکھ دیا۔ اور اُس پر کوئی نظم ہو گئی یا اس سے متأثر ہو کر کوئی غزل کہہ دی یا وہ جھلک کسی سانیٹ کا موضوع بن گئی۔ غرض کہ ہر شہر میں اختؔر کی کوئی محبوبہ ضرور تھی۔ امرت سر آئے تو کہا:

امرت سر اُس پری کا نشیمن ہے آج کل

کبھی خیبر کی نواحی میں اُنھوں نے کسی فتنۂ محشر کو خراماں دیکھ کر یہ کہا:

خیبر اور اس کے نواحی میں ٹہلنے والو!
کبھی لاہور کے لارنس کو بھی یاد کرو

گجرات میں تو خیر سلماؤں کا ہجوم تھا۔ پھر ایک ایسی بھی وادی تھی جہاں ''ریحانہ'' رہتی تھی۔

اختؔر راجپوتانے کے شرفا اور پٹھانوں کے ایک معزّز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے اُن کا قبیلہ اور اُن کے بزرگوں کا وطن صُوبہ سرحد اور بلوچستان کی سرحد پہ تھا۔ اس خاندان میں اخلاقی پابندیاں پہاڑوں کی چٹانوں سے زیادہ سنگین تھیں۔ اختؔر اس خاندان کا ایک باغی بچہ تھا، اور اِس بغاوت کی سزا وہ اپنے سخت گیر باپ سے عمر بھر پاتا رہا۔ اُس نے اُردو شاعری میں بھی بغاوت کا نشان اُٹھایا۔ پہلے غزل میں درباری رنگ تھا۔ یہ خلوت کی شاعری تھی۔ اس میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ اس کے آداب تھے، پابندیاں تھیں، بڑے صبر آزما قاعدے تھے اور شاعری میں عورت کا نام لینا گناہ تھا۔ آج ایسی شاعری

کرنے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا۔حسرتؔ بھی کُھل کھیلنے کی جُرأت نہ کر پائے۔اقبالؔ کی قومی شاعری کا چرچا تھا۔ ظفرؔعلی خاں کی سیاسی نظمیں ذہنوں پر مسلّط تھیں۔لیکن متوسّط طبقے کے لوگوں کے دل بند تھے۔نئی نسل کُمھلا رہی تھی۔جوانی کی اُمنگوں کے اِظہار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔پھر بازاری اور درباری شاعری کے درمیان کوئی چیز نہ تھی۔اخترؔ نے بھرپور جوانی کی نشہ آور اور رنگ ترنگ کی شاعری کو رواج دیا۔یہ پیار کی شاعری تھی۔جوانی کی شاعری تھی۔اس سے بھاری بھرکم شاعری کا بوجھ ہلکا ہوا۔لوگوں نے نجات کا سانس لیا۔

اخترؔ کی شاعری میں شوخی بھی ہے اور کھلنڈرا پن بھی۔یہ خالص جذبات اور کہیں کہیں شِدّتِ جذبات کی شاعری ہے۔اِسی شاعری میں فیضؔ اور راشدؔ کی مسیں بھیگیں۔فیضؔ اور راشدؔ نے شاعری میں نئے تجربے کیے۔شاعری کی ہیئت بدلی۔اُن کی شاعری میں گہرائی بھی آئی اور گیرائی بھی۔اِس طرح اخترؔ شاعروں کی نئی نسل کا پیش رو ہے۔وہ جذباتی شاعری یا رومانی شاعری کا امام ہے۔اُس کی شاعری خواب و خیال کی شاعری ہے۔ارمانوں اور اُمنگوں کی شاعری ہے۔اس کی بحریں مترنّم،قوافی نرم و نازک اور الفاظ شیریں۔ہندی کے دل موہ لینے والے الفاظ استعمال کر کے وہ اپنی شاعری کی موسیقی میں اضافہ کر دیتا ہے۔اخترؔ کی اِمیجری بڑی دلکش ہے،فطری جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اُس پر امرؤالقیس کا گمان ہوتا ہے۔تغزّل میں حافظؔ کے قریب سے گزر جاتا ہے۔کہیں وہ شیلےؔ ہے تو کہیں کیٹسؔ اور کہیں دونوں کا دلکش امتزاج۔اخترؔ فارسی کے تو خیر منتہی تھے ہی،عرب شعرا کا کلام اور عربی ادب بھی اُن کی نظر سے گزر چکا تھا۔ انگریزی خوب جانتے تھے۔اُن کی معلومات اور حافظے کی یہ حالت تھی کہ خود اُن کے والد مولٰینا محمود شیرانی مرحوم بعض باتیں اُن سے دریافت کرتے۔مولانا محمود شیرانی ثقہ بزرگ تھے!اور صاحبزادے رِند۔لہٰذا دونوں باپ بیٹوں میں بنتی نہیں تھی۔ویسے میں نے اخترؔ کو مولٰینا کا جتنا ادب کرتے دیکھا ہے شاید ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کا اتنا ادب کرتا ہو۔مولٰینا،اختر کی شراب نوشی اور اُس کی صحبت اور اُس کی بے باک شاعری کی وجہ سے اُس سے خفا رہتے تھے۔یہاں تک کہ اُنھوں نے اخترؔ کو علیحدہ کر دیا تھا۔اور وہ مولٰینا کے مکان کے سامنے ایک مکان کی دوسری منزل پر رہا کرتا تھا۔اُس کے کمرے میں مولانا چراغ حسن حسرتؔ،میرا جیؔ اور مولٰینا کے شاگردِ رشید سیّد محمد جعفری بھی اکثر نظر آیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ مولٰینا محمود

شیرانی جب دکن سے واپس آئے تو اُنھوں نے سیّد محمد جعفری کو بلایا اور فرمایا!

''جانتے ہو تمھارے دوست کی وجہ سے میں کتنا بدنام ہو رہا ہوں۔ دکّن میں ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے اور کہنے لگے: ''شیرانی صاحب! آپ کی یہ نظم ہمیں بہت پسند آئی''۔ میں نے کہا: ''کون سی نظم؟'' فرمایا: ''بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں میں''

اخترؔ سے میری پہلی ملاقات امرتسر میں ہوئی۔ یہاں شہر کے بڑے بازار میں، جس کا نام ہال بازار ہے، ایک بڑا ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل کا مالک بھی عجیب دیوانہ تھا۔ یہ خود نہ شاعر تھا نہ گویّا لیکن اپنا مال اور اپنی ساری زندگی شاعروں اور موسیقاروں پر لُٹا تا رہتا تھا۔ اُس کا نام عزیز (جیجا) تھا۔ یہ اخترؔ کا دوست بھی تھا اور بے پناہ معتقد بھی۔ اور اخترؔ ہی نے اس کے ہوٹل کا نام شیراز ہوٹل رکھا تھا۔ شیراز ہوٹل پر اخترؔ نے بیس بائیس اشعار کی ایک نظم بھی کہی ہے۔ اخترؔ ہر مہینے میں ہفتہ دو ہفتہ شیراز ہوٹل میں گزارتا اور یہاں بڑی رنگین محفلیں جمتیں۔ شیراز ہوٹل میں شہر کے نامی گرامی ادیب، آرٹسٹ اور موسیقار اُمڈ آتے۔ شہید گنج کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ مولینا ظفر علی خاں مسجد شیخ خیر الدین میں تقریر کر رہے تھے۔ اور اخترؔ شیراز ہوٹل میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اُدھر مسجد کی جانب سے یہ نعرے اُٹھ اُٹھ کر ہوٹل کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے ''ظفر الملک والدّین حضرت مولینا ظفر علی خان زندہ باد۔ مسجد شہید گنج زندہ باد۔

جیجے نے اختر سے کہا: ''ایک تم بھی ادیب اور شاعر ہو اور ایک مولینا ظفر علی خان بھی ادیب اور شاعر ہیں۔ لیکن سارے ہندوستان میں اُن کا طوطی بول رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور تمھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔''

اختر نے کہا: ''ابے تُو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ اگر ایک پرچہ لکھ کر بھیج دوں تو مولینا تقریر چھوڑ کر سیدھے یہاں چلے آئیں۔''

جیجے نے کہا: ''لے یار! لکھ تُو پرچہ۔ اگر مولینا آ گئے تو دو بوتلیں وسکی کی دُوں گا۔''

اخترؔ نے ایک پرچہ لکھا۔ جیجے نے کسی طریقے سے مولینا تک پہنچایا۔ اور مولینا تقریر ختم کرنے کے بعد جیجے کے ساتھ سیدھے شیراز ہوٹل چلے آئے۔ سڑک پر مولینا کے چاہنے والوں کا ہجوم تھا جیسے ہی

مولینا ہوٹل میں داخل ہوئے اخترؔ نے شراب کی بوتل چھپا دی۔ مولینا نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔ اگر چہ اخترؔ کے مُنہ سے شراب کا بھبھکا ضرور اُڑا ہوگا اور مولینا کو پتہ بھی چل گیا ہوگا کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ لیکن مولینا کوئی کٹھ مُلاّ تو تھے نہیں، بڑے آدمی تھے، اُنھوں نے پتہ ہی نہیں چلنے دیا۔ اِتنے میں عزیز کہیں سے حقّہ لے آیا جس کے مولینا رسیا تھے۔ پھر چائے آ گئی۔ مولینا کے اصرار پر اخترؔ نے چند اشعار سُنائے اور مولینا سے فرمائش کی کہ وہ بھی چند اشعار بطور تبرّک اِرشاد فرمائیں۔ چنانچہ اخترؔ ہی کی بحر اور قوافی میں مولینا نے بھی شیراز ہوٹل پر بیس اشعار کی ایک نظم کہی جس میں عزیز (جیجے) کو مولینا نے عزیزِ مصر بنا دیا۔

ایک دفعہ میں اور بالاؔ اخترؔ کے یہاں گئے۔ وہ ایک اونچی چار پائی پر بیٹھا تھا۔ چار پائی کے نیچے سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ بالےؔ نے پوچھا: ''یہ دُھواں کیسا ہے؟''

اخترؔ نے آواز دی: ''مولینا تشریف لے آئیے، یہ لوگ غیر نہیں ہیں، اپنے ہی ہیں۔''

دیکھا تو یہ مولانا چراغ حسن حسرتؔ تھے جو چرس سے بھرا ہوا سگریٹ پی رہے تھے۔

اخترؔ امرت سر کے دلدادہ تھے۔ امرت سر کی یادیں اُن کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہیں۔ میری شادی کی تقریب میں اُنھوں نے فارسی زبان میں میرا سہرا کہا۔ یوں اُن کا کلام فارسی میں بہت کم ہے اور شاید فارسی میں اُنھوں نے یہی سہرا کہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

بہار در برِ دِ گُل در کنار می آید — نسیمِ گُل نہ کدامی دیار می آید
خوشا ہوائے فرح بخش شہرِ امرت سر — کہ مست و بے خود و بے اختیار می آید
مگر بہ بزمِ طرب بار وادہ نصر اللہ — نسیم را کہ چو گُل مشک بار می آید
زہے نشاطِ عروسی خہے فسون ہوا — کہ زہد ہم رود و مے گسار می آید
بصحن خانقہ بلبل قرابہ بشکستہ — ز بامِ ''مدرسہ'' بانگِ ہزار می آید
نہ ماند بہر محمد عمر مجال خرام — کہ تہنیت زمین و یسار می آید
مگر بہ شوقِ دِگر توبہ را شکست اخترؔ — کہ سُوئے میکدہ مستانہ وار می آید

جب کبھی روزنامہ ''زمیندار'' میں لوگوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں اور وہ کام پر نہیں آتے تھے تو مولینا ظفر علی خان ایک پرچہ لکھ کر اختؔر کو بلا لیا کرتے تھے اور اختؔر ''زمیندار'' کے دفتر چلے آتے اور پھر وہ فی البدیہہ ایک نظم کسی سیاسی موضوع پر ''زمیندار'' کے سرورق کے لیے لکھتے اور مولانا منظوم اِداریہ قلم بند کرتے۔ اختؔر کبھی منظوم اور کبھی نثر میں فکاہی کالم بھی لکھتے۔ اور پھر دو چار کالجوں کے لڑکے بیٹھ کر خبروں کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔

''زمیندار'' کے سرورق پر اراکین اِدارۂ تحریر میں مولینا ظفر علی خان کے ساتھ اختؔر کا نام یوں لکھا جاتا: ''اختر شیرانی مدیرِ اعزازی۔''

اختؔر بہت شرمیلے تھے۔ ایک دن انارکلی میں ایک دکان پر بیٹھے تھے اور رفیق غزنوی سائیکل پر سوار تھے۔ رفیق نے کہا: ''اختؔر صاحب! میں نے غزل کہی ہے آپ مجھے اپنا شاگرد بنا لیں۔'' اختر نے کہا: ''میں کس قابل ہوں۔'' رفیق نے پیڈل پاؤں سے دبایا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا: ''جب آپ اِس قابل ہو جائیں تو مجھے مطلع کر دیں۔''

پروفیسر ڈاکٹر تاثیؔر امرت سر کے ایم اے او کالج کے پرنسپل ہو کر آئے تھے اور اسی کالج میں فیضؔ بھی تھے۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ تاثیؔر اور فیضؔ اختؔر سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اختؔر شیراز ہوٹل میں آ کر ٹھہرے اور یہاں کئی دن رہے۔ اُن سے ملنے کے لیے اُن کے کئی دوست احباب آئے اور نہیں آئے تو تاثیؔر اور فیضؔ نہیں آئے۔ جس کا اختؔر کو بہت قلق ہوا۔ ایک دن میں اور بالاؔ شیراز ہوٹل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ فیضؔ اور تاثیؔر چلے آ رہے ہیں۔ تاثیؔر کا مزاج کافی مشفقانہ تھا۔ وہ اختؔر کو یہ سمجھانے لگے کہ زیادہ شراب پینا اچھا نہیں ہے۔ اور اس نے شراب پی کر اپنی جو درگت بنائی ہے تو اِس سے اُس کے دوست بھی شرمندہ ہیں۔ اختؔر نے کہا: ''آپ میری دوستی کی وجہ سے شرمندہ نہ ہوں۔ اگر آپ میرے پینے کی وجہ سے شرمندہ ہیں تو مَیں آپ کے نہ پینے پر بھی شرمندہ ہوں۔'' جب یہ لوگ چلے گئے تو اختؔر مجھ سے کہنے لگے: ''بات تاثیؔر نے ٹھیک کہی لیکن اُس کے لہجے نے مُجھے دکھ پہنچایا ہے۔'' اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

کِسی کو کیا خبر حالِ دلِ ناکام کیا ہو گا
مَیں اکثر غور کرتا ہوں، مرا انجام کیا ہو گا

پھر بعد میں یہ غزل پُوری ہوگئی۔

جب مجھ سے اخترؔ کی بہت بے تکلّفی ہوگئی تو وہ دو ایک دن شیراز ہوٹل میں رہ کر میرے گھر اُٹھ آتے تھے۔ مَیں اخترؔ کی شراب کے لیے اپنے والد سے پیسے لیتا اور خود شراب خانے سے اُس کے لیے ٹھرّا خرید کر لاتا۔ پھر مَیں اور اخترؔ کچنی باغ میں جا کر ساری رات گزارتے اور وہ کس کس طرح سے باغ میں مچلتا، گھاس پر لَوٹتا۔ ستاروں کو دیکھ کر ناچتا۔ پھر صبح ہونے سے پہلے ہم گھر لوٹ آتے۔

اخترؔ ایک آدھ روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ ہر وقت سگریٹ پیتا یا شراب۔ گرمیوں میں ٹب میں برف ڈال کر ٹھنڈے پانی میں اپنے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتا۔ میرے والد آتے تو وہ مجھ سے کہتا ”کہیں سے ٹوپی لے آؤ۔“ میں ٹوپی لاتا اور وہ ٹوپی پہن کر بڑا مؤدب ہو کر بیٹھ جاتا۔

اخترؔ کو شعر پڑھنا کبھی نہیں آیا۔ عزیز اُس کے شعر ترنّم سے پڑھتا۔ ایک مرتبہ ٹونک میں ایک پنواڑی نے اخترؔ سے کہا:

”میاں! تم بھی شعر کہتے ہو۔ لیکن ریڈیو سے شکیلؔ اور بہزادؔ کی غزلیں نشر ہوتی ہیں اور تمھاری غزلوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ آخر تم اِتنے مشہور کیوں نہیں ہو؟“ اخترؔ کو غصّہ آگیا۔ کہنے لگا: ”تُو نہیں جانتا ہم کون ہیں۔ ہم ادیب الملک اخترؔ شیرانی الافغانی مدیر ”رومان“ ہیں۔ لا اِسی بات پر ایک بیڑی پلا۔“

آغا حشرؔ کے یہاں ایک ادبی محفل تھی۔ اُس میں اختر بھی شامل تھے۔ آغا صاحب نے کہا: ”اپنی محبوبہ کو بہترین ماحول میں پیش کیا جائے اور اِس سلسلے میں فی البدیہہ اشعار کہے جائیں۔“ کس نے کیا کہا، یہ تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ آغا صاحب کے دو اشعار یاد آگئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

اُن کا رخِ منوّر رہے، زُلفِ خم بہ خم میں
یا چاند سو رہا ہے آغوشِ کہکشاں میں
اے حشرؔ ہو مبارک ہے آج وصل کی شب
اِک چاند ہے بغل میں، اِک چاند آسماں میں

جب اخترؔ کی باری آئی تو اُس نے جو کچھ کہا اُس کے یہ تین مصرعے مجھے یاد رہ گئے:

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت مست ہو کر مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو بزمِ کہکشاں کو نیند آتی ہے

سب نے بہت تعریف کی۔ اور آغا صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

کہو زاہد سے کیوں ہے اِس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیلِ اخترؔ میں

اخترؔ اور مجازؔ علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر گھوم رہے تھے۔ اُن کی نظر سیکنڈ کلاس کے ایک اپارٹمنٹ پر پڑی جہاں دو لڑکیاں تُرکی بُرقعے اوڑھے بیٹھی تھیں۔ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا: ''وہ دیکھو اخترؔ شیرانی۔'' اخترؔ نے مجازؔ سے کہا: ''بھاگ اور ٹکٹ خرید لا۔'' ابھی یہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ گاڑی چلنا شروع ہو گئی۔ اخترؔ کے ہاتھ کوئی کمپارٹمنٹ تو نہیں آیا، گارڈ کا ڈبّہ آ گیا۔ جب اخترؔ گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوئے تو گارڈ نے روکا۔ آپ نے گارڈ کو ڈانٹ کر کہا:

" SHUT UP. IT IS A MATTER OF LOVE AND ROMANCE."

اخترؔ سے میری آخری ملاقات اجمیر میں ہوئی۔ مَیں نصیر آباد میں تھا۔ اخترؔ نے شاہ نور خاں اختر سے تار دِلوایا۔ میں اجمیر پہنچا اور اخترؔ سے ملا تو وہ مجھے گلے لگا کر بچّوں کی طرح پُھوٹ پُھوٹ کر رو دیا اور کہنے لگا: ''نصر اللہ! میرے ابّا مر گئے۔'' حالانکہ اخترؔ کے ابّا کو مرے یہ دوسرا سال تھا۔ لیکن میں نے کہا ہے نا کہ اخترؔ بچّہ تھا۔ جب اخترؔ اپنی سوتیلی والدہ کا نام لیتا تو بڑے ادب سے لیتا۔

بالےؔ نے کہا: ''یار! تم اپنی سوتیلی والدہ کا نام اِس طرح لیتے ہو جیسے کوئی کعبۃ اللہ کا نام لے رہا ہے۔ کہنے لگا: ''سوچو۔'' اور یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے: ''اگر میری اپنی امّاں زندہ ہوتیں تو مَیں اُن کا نام کس طرح لیتا؟''

مولٰینا محمود شیرانی صاحب کی دوسری بیوی بھی اخترؔ کو اپنی بھرپور محبّت دینا چاہتی تھیں لیکن مولٰینا پرانے ڈھنگ کے آدمی تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ اس پیار سے کہیں وہ اور نہ بگڑ جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قابل آدمی اور اچھا

آدمی اچھا باپ بھی ہو۔اور وہ پیار جو اخترؔ اپنی ماں اور اپنے باپ سے دل کھول کر نہ پاسکا، اُسی پیار کے لیے وہ زندگی بھر ترستا رہا۔ اور اُس نے کسی عورت سے شاید اسی ڈر کی وجہ سے پیار نہیں کیا کہ وہ اُسے اُس کی ماں کا پیار نہ دے سکی تو کیا ہوگا۔ آخری عمر میں وہ عجیب عجیب باتیں کرتا۔ مجھ سے کہتا: ''دیکھو، جب مَیں رات کو پیشاب کرنے کے لیے صحن میں آتا ہوں تو چاروں طرف سے بلائیں آ کر مجھے گھیر لیتی ہیں۔ اور مَیں اُس کے دل سے یہ وسواس مٹانے کے لیے کہتا: ''میری جان! جوانی کی سلمائیں اِسی طرح بڑھاپے میں بلائیں نظر آنے لگتی ہیں۔

(''کیا قافلہ جاتا ہے'')

نیّر واسطی

اختر شیرانی

ادب کے سلسلے میں میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ شعر، تنقید اور تاریخ ہے۔ لیکن میری عادت کے خلاف طفیل صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اخترؔ کی شخصیت کے موضوع پر لکھوں۔ لہٰذا ان کے ارشاد کی تعمیل میں کوشش کرتا ہوں کہ اِس فرض سے عہدہ برآ ہو سکوں۔

۱۹۲۴ء سے اختر کا نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں اُن دِنوں چونا منڈی لاہور میں مطب کرتا تھا۔ حافظ محمد عالم مدیر ''عالمگیر'' جو مجھ سے اپنے رِسالے کے لیے نظمیں لکھوا کر لے جاتے، آتے اور اکثر اختر کے حالات بیان کیا کرتے تھے۔ پھر اسی ضمن میں ''انتخاب'' اور ''بہارستان'' نے جنھیں اخترؔ نے ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء میں جاری کیا مجھے اُن سے اور زیادہ آشنا کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عاشق بٹالوی نے شاعری اور شعر میں اُن کی محویت، بے خودی، وارفتگی اور والہانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے لطیف اور پُر کیف انداز میں بیان کیے کہ میں اخترؔ کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔

مارچ ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کو مغرب کے بعد ایک حسین اور تنومند نوجوان ننگے سر، ہاتھ میں قراقلی لیے، کالی اچکن پہنے مطب میں آیا اور کہنے لگا کہ میر نور احمد صاحب کے ہاں ایک مریض کو دیکھنے کے لیے چلیے۔ میں نے اُس کا نام پوچھا۔ فرمایا: ''اخترؔ شیرانی''۔۔۔۔۔۔ سنتے ہی لپٹ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو پا لیا ہے۔ اخترؔ سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔۔۔۔۔ اس کے بعد تمام عمر جب تک وہ زندہ رہے یہ رشتۂ محبّت و وداد مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے اختر کو زندگی کے ہر دور اور ہر حال میں دیکھا حتیٰ کہ روزِ ملاقات سے یومِ وفات تک جس کو اُن کی شاعری کی عمر کا پورا دور سمجھنا چاہیے، اُن کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے تمام مراحل

میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں۔میں نے اُن کو خلوت میں دیکھا، جلوت میں دیکھا، دوستوں میں دیکھا، دشمنوں میں دیکھا، امیروں میں دیکھا، فقیروں میں دیکھا اور فلیمنگ روڈ کے تنگ و تاریک گوشے کے علاوہ گجرات کی رات کی جلوہ باریوں، ایبٹ آباد کی شامِ وداع کی نالہ سامانیوں، مری کی صنوبر ستانی فضا کی پُر بہار فروشیوں اور خصوصاً ''باغ لارنس'' کی دلکش چاندنی راتوں میں دیکھا۔اختؔر ہر جگہ اور ہر حال میں ایک عجیب وغریب انسان نظر آیا۔

میانہ قد، سڈول جسم، روشن آنکھیں، کتابی چہرہ، ستواں ناک۔کبھی کبھی اچکن ورنہ کھلے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ۔چال میں لغزش اور نگاہوں میں مستی۔۔۔۔

کھویا کھویا سا اِک جوانِ خموش

یہ تھے اختؔر شیرانی جو ابتدا میں آگ تھے اور اِنتہا میں خاک۔۔۔۔۔

اختر ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو اپنے وطن مالوف ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت آپ کے والدِ محترم حافظ محمود شیرانی نے آپ کا نام داؤد خاں رکھا لیکن بعد میں اُنھوں نے اپنا تخلّص اختؔر اختیار کرلیا۔ اور شیرانی الاصل ہونے کی وجہ سے شیرانی کہلائے۔

اُن کے والدِ محترم حافظ محمود شیرانی فارسی علم و ادب، تنقید اور تاریخ کے جیّد عالم تھے اور علمِ عروض میں تمام ہندوستان میں منفرد تھے۔حافظ صاحب مرحوم جب ۱۹۱۴ء میں ولایت سے تعلیم سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے تو اُنھوں نے ٹونک میں اختؔر کی ابتدائی فارسی تعلیم کے لیے مولوی صابر علی صاحب شاکر کو مقرّر کیا۔جنھوں نے پہلے پہل اختر میں شعر کے ذوق کو بیدار کیا۔ایک پہلوان قیوم خاں ملازم رکھا گیا جو اختؔر کو ورزش کراتا اور کُشتی کا فن سکھلاتا تھا۔اور ایک خوش نویس متعین کیا گیا جو اختر کو خوش نویسی کی مشق کراتا تھا۔اختؔر کی حسین خطّاطی اور جسمانی خوب صورتی و تنومندی درحقیقت اسی دور کی یادگار تھی۔

حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۰ء میں جب ٹونک سے جلاوطنی کے سلسلے میں اہل وعیال کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور یہاں آکر اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرّر ہوئے تو اختؔر بھی اُن کے ساتھ تھے۔حافظ صاحب مرحوم نے اختؔر کو اورینٹل کالج میں داخل کرایا۔اور غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اختر کی عمر ۱۶ سال کی تھی اُنھوں

نے منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔

اس کے بعد خیال تھا کہ اس باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے کہ اختر شعر و سخن کی دلچسپیوں کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔

اختر نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی لیکن مطالعہ کی بدولت خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی اور کچھ عربی سے بھی واقفیت حاصل کرلی تھی۔

اختر نے بہت کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۲۴ء سے اُن کی نظمیں باقاعدہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ پہلی نظم ”جوگن“ تھی جس نے علمی و ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ اور پھر اُس کے بعد ”سرزمین گجرات“، ”انجامِ ہستی“، ”تیتری“، ”ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے“ اور اِسی نوع کی بے شمار نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنھوں نے دُنیائے شعر و اَدب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

ابتدائی دِنوں میں فلیمنگ روڈ پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ اختر کے لیے مخصوص تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ دریچہ کی جانب ایک میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی رہتی تھیں اور کبھی کبھی نپولین کی مراجعت رُوس کی تصویر نظر آتی تھی۔

درحقیقت یہ تھا اختر کا وہ مدرسۂ شعر و مکتبِ فکر جہاں ادبِ اُردو کے ایک نئے دَور کی تخلیق ہوئی اور شعر و اَدب کے نئے اسالیب و اقدار وضع ہوئے۔

اختر کے دوستوں، شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم اس کمرے میں رہتا تھا اور اختر نے جو ادبی رسائل و مجلّات جاری کیے اُن کا دفتر بھی درحقیقت یہی کمرہ تھا۔ یہاں اختر ہمہ تن اپنے دوستوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہتے اور اُن کا ملازم فضل بار بار بالا خانے کے زینے سے بیچ کی منزل میں جہاں یہ کمرہ تھا آتا اور آنے والوں کی خدمت میں سگریٹ، پان، شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیش کرتا۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اختر کی شاعری کے شباب کا دَور تھا۔ اس دور کے ابتدائی ایّام میں اُن کی شاعری نے سب سے زیادہ جن لوگوں کو متأثر کیا وہ کالجوں کے طلباء و طالبات اور اُس دور کے ہونہار نوجوان ادیب تھے۔ لاہور کے تقریباً ہر کالج کا ہر نوجوان جسے ادب سے ذرا بھی وابستگی تھی اُن کے

پاس پہنچتا تھا۔ اُسی زمانے میں ن۔م۔راشدؔ نے گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلسِ اُردو میں اخترؔ کی شاعری پر ایک شاندار مقالہ پیش کیا۔ جو اَب اُن کی کتاب ''اختر ستان'' میں شامل ہے اور اس کے بعد سیّد اختر احمد اخترؔ اورینوی نے گورنمنٹ کالج پٹنہ میں اُن کی شاعری پر ایک اور سیر حاصل مقالہ پڑھا۔

اُس دَور میں اخترؔ کے گرد اُس دَور کے خوش ذوق نوجوان ادیبوں کا ایک شاندار حلقہ جمع ہوگیا تھا۔ ن۔م۔راشدؔ، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، دلبر حسن مسحور، عمر فاروق، علی رضا، خضر تمیمی، مصطفیٰ حسین سلیم رضا، عاشق بٹالوی، سردار کریم نواز، سیّد محمد جعفری، عظیم قریشی اور دیگر بے شمار نوجوان ادیب اختر کے پاس چاند کے گرد تاروں کی طرح جمع ہوگئے تھے۔ چراغ حسن حسرتؔ بھی جنھیں اخترؔ چراغِ حُسن کہا کرتے تھے، کبھی کبھی شام کو اِس محفل کو جگمگاتے تھے۔ جگرؔ و جوشؔ جب لاہور آتے اِس کلبۂ اخترؔ کی زینت بنتے۔

پھر اختر کے ادبی رسالوں نے رومانی ادیبوں کے اِس حلقے کو اور وسیع بنا دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، بابائے اُردو مولانا عبدالحق، آغا حشر کاشمیری، چودھری خوشی محمد ناظر، عبدالرحمٰن چغتائی، چودھری فضل حق سب جج، شیخ عالم علی، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ڈاکٹر سیّد صدیق حسین نجمی، سیّد شبیر حسین بخاری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، میر منظور محمود دولی، شیخ عبداللّطیف تپشؔ، سیّد ولایت حسین مدنی، ساحل ٹونکی، اسرار الحق مجاز اور ان کے علاوہ اُس دور کے تقریباً تمام مشاہیرِ علم و اَدب اس حلقے میں شامل تھے۔

اخترؔ کی اِس محفلِ ادب میں ملک کے ممتاز اہلِ قلم خواتین بھی شامل تھیں۔ ان میں محترمہ کنیز فاطمہ حیاؔ کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کے علاوہ محترمہ ادا بدایونی، محترمہ عائشہ بیگم شمیمؔ، محترمہ نسرین خانم، محترمہ آمنہ تمیم، محترمہ رضیہ خاتون رعنا، محترمہ شکیلہ اختر، آنسہ زہرہ بیگم اور دیگر بے شمار ادیب خواتین اختر کے رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتی تھیں۔

اخترؔ کی دوستی کے لیے علم و فضل کی کوئی قید نہ تھی۔ ایک پنواڑی سے لے کر لاہور میں بڑے سے بڑا ادیب اور صحافی اُن کا دوست تھا۔ میں نے یہاں اخترؔ کے دوستوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بہت محدود ہے۔ صرف پنجاب اور بالخصوص لاہور میں اخترؔ کے ادیب دوستوں کی تعداد بلاشبہ اس سے

ہزار گُنا زیادہ تھی۔

درحقیقت کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کا کوئی ادبی گوشہ اور کوئی ادیب، شاعر اور صحافی ایسا نہ تھا جو اخترؔ سے واقف اور اس کا قدردان نہ ہو۔ دوستوں کے خطوط کا ایک انبار تھا جو روزانہ اختر کے پاس جمع ہو جاتا تھا۔

''رومان'' میں اخترؔ کے مخصوص طرزِ نگارش کے حاملین کا جو حلقہ بن گیا تھا، اختر اُسے ''دائرۂ رومان'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ''رومان'' میں اُن کے خطوط پر تبصرے ہوا کرتے تھے۔ ''رومان'' کے سرنامہ پر تحریر تھا ''اُردو کے نوجوان اہلِ قلم کا ماہنامہ''۔

اُنھیں مصوری سے گہرا لگاؤ تھا۔ موسیقی سے دلی وابستگی تھی۔ مشہور موسیقار مرحوم غلام حیدر اُن کے خاص دوست تھے۔ اکثر موسیقی کی محافل میں شامل ہوتے۔ ''پ'' کے نغمے اُن کو بہت پسند تھے۔ جس کا ذکر اُنھوں نے اپنے ایک سانیٹ میں بھی کیا ہے۔

خطّاطی اور فنِ خطابت سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود بڑے اچھے خطّاط تھے۔ حروف کے دائرے بڑے حسین بناتے تھے۔ لیکن سطریں اکثر سیدھی نہیں رہتی تھیں۔ ہمیشہ اُن کی یہ خواہش رہتی تھی کہ اُن کا رسالہ بڑے اچھے خط میں چھپے اور اِس مقصد کے لیے وہ بالعموم لاہور کے مشہور کاتب کلیمی کو پسند کرتے تھے۔

کلاسیکی ادب میں اخترؔ کی نظر بے حد وسیع تھی۔ فارسی کے شعراء میں طالب آملی سے لے کر آج تک کے جدید ایرانی شعراء کے کلام پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ شاعری میں حافظ کے پرستار تھے۔ اور اُس کے دیوان کو شاعری کا قرآن کہا کرتے تھے۔ اُردو شعراء میں میرؔ اور غالبؔ کے معتقد تھے۔ ذوقؔ کا نام جب آتا تو اُنھیں محمد رمضان کے صاحب زادے کہہ کر عجیب انداز میں یاد کرتے۔

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن مشترکہ ہند کے ہر مشاعرے میں طلب فرمائے جاتے تھے۔ جہاں جگرؔ و جوشؔ موجود ہوتے، اختر ضرور ہوتے۔ مشاعروں میں وہ اپنا کلام بغیر ترنّم کے پڑھتے۔ سامعین چونکہ اخترؔ اور اُس کے کلام کے عاشق ہوتے اِس لیے آپ کے کلام سے مشاعرہ گونج اُٹھا کرتا تھا۔ اکثر ایسا

بھی دیکھا گیا کہ عالمِ سُکر میں بھی پڑھ دیتے۔ ان مشاعروں سے جو رقم وصول ہوتی وہ بالعموم بوتلوں کے بند پانی میں بہادی جاتی تھی۔ شعر کہتے وقت میں نے اخترؔ کو کبھی گُنگناتے نہیں دیکھا لیکن شعر پھولوں کی طرح بے ساختہ اُن کے مُنہ سے جھڑتے تھے۔ عالمِ سُکر میں اُنھوں نے بہت کم شعر کہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں شراب کی کیفیت کو شعر کی مصروفیت میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بالعموم خمار کی حالت کے بعد شعر کہتے تھے۔

پرائیویٹ صحبتوں میں اپنا کلام خود سُنانے میں تأمّل کیا کرتے تھے۔ اکثر دوستوں کو ارشاد فرماتے کہ وہ اُن کا کلام پڑھیں۔ بعض دوست ترنّم سے پڑھتے اور وہ اُس کو سن کر جھومنے لگتے تھے۔ اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی داستان سے وابستہ ہے۔ آخری عمر میں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ جب اُن کے کسی دوست نے اُن کا کوئی خاص شعر خوش الحانی سے پڑھا تو وہ بے چین ہو گئے۔ ایک مرتبہ اصغر نے اُن کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ترنّم سے پڑھا کہ:

کس کی آنکھوں کا لیے دل پہ اثر جاتے ہیں
میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں، جدھر جاتے ہیں

تو اُنھیں کلکتہ کا سفر اور اس کا ایک حسن رہ گزر یاد آگیا اور دیر تک زارو قطار روتے رہے۔

اخترؔ اس عہد کے اہلِ قلم میں ابو الکلام اور آغا حشر سے متأثر تھے۔ اور آغا حشرؔ بھی اختر سے اِس قدر متأثر تھے کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے کہا کہ: ؎

کہو زاہد سے کیوں ہے اِس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

مولینا ابو الکلام نے ۱۹۲۶ء میں جب دوبارہ ''الہلال'' جاری کیا تو اس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں اخترؔ پر آسکر وائلڈ کا اثر تھا اور گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اُن کی زندگی بعد میں اُسی کے رویّے میں ڈھلتی گئی۔

رسائل و مجلّات کی ادارت میں بھی اُن کا خاص مقام تھا۔ ابتداء میں ''ہمایوں'' میں اُنھوں نے

ادارت کے فرائض انجام دیے۔ مُدّتوں تک ماہنامہ ''سہیلی'' کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولینا تاجور نے جب ''شاہکار'' نکالا تو اُس کے اِدارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے۔ اور مولینا چراغ حسن حسرتؔ کے ''شیرازہ'' کی ترتیب وتزئین میں بھی اُن کا حصّہ تھا۔

اخترؔ نے سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں ''انتخاب'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام و معیار کچھ مُدّت کے بعد بدل کر ''بہارستان'' کر دیا۔ ''بہارستان'' جب بند ہوا تو ۱۹۲۸ء میں ''خیالستان'' جاری کیا۔ لیکن ''خیالستان'' بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔۔۔۔ اور اب کاروباری زندگی سے بے تعلقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ جاری نہیں کریں گے لیکن احباب کا اصرار غالب آیا اور اُنھوں نے غالباً ۱۹۳۱ء میں ''رومان'' کے نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ اس موقع پر کہا تھا کہ

میں کہاں اخذِ متاعِ عالم فانی کہاں
طائرِ سدرہ نہیں تنکے اُٹھانے کے لیے
لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہیے ہنگامہ جن کا دل لُبھانے کے لیے

جیسا کہ اخترؔ خود کہا کرتے تھے یہ روایت قائم ہوگئی تھی کہ اختر کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اِس کے باوجود شوقِ مشتاقانِ اختر کا یہ عالم تھا کہ جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے فوراً خریداروں کا حلقہ مہیّا ہو جاتا تھا۔

اخترؔ کے اِن رسالوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ بعد میں اخترؔ کے مجموعہ ہائے کلام ''صبحِ بہار''، ''اختر ستان''، ''لالہ طور''، ''طیورِ آوارہ''، ''شہناز'' اور ''شہرود'' کے لیے اُن کی نظموں اور غزلوں کا بہت سا سرمایہ مل گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ نظم میں اخترؔ کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں، ایک ''نغمۂ حرم'' دوسری ''پھولوں کے گیت''، نثر میں ''دھڑکتے دل'' کے عنوان سے آپ کے مضامین نثر کا ایک مجموعہ چھپا۔ اور اس سے قبل ''ضحاک'' اور ''آئینہ خانے میں'' نثر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان چھوٹے رسالوں کے علاوہ آپ نے ''مجمع البحرین''، ''مطلع السعدین'' اور ''جامع اللّغات'' کی ترتیب وتدوین میں بھی

حصہ لیا اور عوفی کی ''جوامع الحکایات'' کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔

اخترؔ کے ذاتی عادات وخصائل بڑے عجیب وغریب تھے۔ نہ اُن کی رات اُن کی رات تھی نہ اُن کا دن اُن کا دن تھا۔ تمام لیل ونہار مستی، بے خودی، سرشاری اور پرستشِ حُسن کے لیے وقف تھے۔ ہر چھوٹا بڑا اُن کا دوست تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی سے ملتے اور بعض دوستوں کے نئے نئے پیار کے نام تجویز کرتے اور اُنھیں ان سے مخاطب کرتے۔ اُن کی دوستی کے لیے اخلاص تک ضروری نہ تھا۔ ہر دشمن و دوست اُن کا دوست تھا۔ ''مولینا'' کے لفظ سے اُن کے یہاں اصطلاحاً حسین صورت مراد لی جایا کرتی تھی۔

ابتدائی دَور میں نشے کی حالت میں بہت زیادہ بولتے تھے۔ اور اس عالم میں اکثر پتے کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ لیکن گاہے بے ربط بولتے تھے۔ سلسلۂ کلام جلد جلد ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اور اس سے وہ دل و دماغ میں شگفتگی محسوس کرتے تھے۔ کھاتے بہت کم تھے لیکن پیتے بہت زیادہ تھے۔ گوشت اور بُھنا ہوا گوشت اکثر پسند کرتے تھے لیکن بالعموم صورت یہ ہوتی کہ چند لقمے لے کر چھوڑ دیتے اور اس کے بعد خواہش یہ ہوتی کہ کچھ دیر تک دسترخوان سامنے کھلا رکھا رہے اور وہ اُسے دیکھتے رہیں۔

میں نے اُنھیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا تھا کہ ایک پڑھا لکھا اور بہت مطالعہ کرنے والا انسان مصروفِ کلام ہے۔ فلیمنگ روڈ کے مشہور درمیانی منزل والے کمرے میں اُن کی محفل ہُوا کرتی تھی اس کے بعد عرب ہوٹل کا درجہ تھا جہاں وہ دوستوں میں بیٹھے محفل کو باغ و بہار بنائے رکھتے تھے۔

اُنھوں نے گھر اور گھر کے حالات سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ والد صاحب ناراض تھے اور اس لیے والد کے ڈر سے والدہ اُن سے چُھپ کر ملتیں اور سمجھاتیں لیکن معاملہ سمجھانے بجھانے سے حل نہیں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے خود بیوی کی ضروریاتِ معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ حافظ صاحب مرحوم اُن کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے۔ اور اخترؔ کے بچّوں، خوشنود اور بہبود کو بچّوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ لیکن آخر میں اخترؔ مرنے سے پہلے جب لاہور میں میرے یہاں مقیم تھے اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور کبھی کبھی یاد

کرتے کرتے رو پڑتے۔ ایک دن بیوی کی وفا اور اپنی بے وفائیوں کو اِس قدر یاد کیا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ مرنے سے پہلے اپنی بیگم سے متعلق ایک سانیٹ لکھا جس کا عنوان ''پیمانِ وفا'' تھا۔ اس میں ایک جگہ لکھا کہ:

بَربِّ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تجھ کو
ہر ایک ذرہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تجھ کو

عام لوگوں کے ساتھ اُن کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ عزیزانہ ہوتا تھا۔ نائی، پنواڑی اور تانگہ والے اکثر اُن کے یار بنے رہتے تھے۔ بعض دفعہ ایک ٹانگہ چار چار دن تک اُن کی اردلی میں رہتا تھا۔ اور چار دن کے بعد کوچوان کو اکٹھے پیسے دیے جاتے تھے۔ ایک دن دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر صبح کے وقت ایک دوست کو ملنے گئے۔ شام تک ٹانگہ باہر کھڑا رہا۔ شام کو رخصت کرتے وقت دوست نے پوچھا کہ بھلا یہ دن بھر ٹانگے کو کیوں کھڑا رکھا۔ فرمانے لگے: ''کوچوان غریب اور شریف آدمی ہے۔ میں نے سوچا اس کا بھلا ہو جائے۔

محلّہ کا پنواڑی اُن کا دوست تھا جس کا بل مہینے مہینے بھر کے بعد ادا ہوا کرتا تھا۔ پان بے حد کھاتے تھے۔ خصوصاً اُن دِنوں میں جب کہ کچھ وقت کے لیے شراب ترک کر دی جاتی تھی۔ پان کے ساتھ چونا علیحدہ سے منگوایا جایا کرتا تھا۔ سگریٹ کا دَور بھی بڑے زور سے جاری رہتا تھا۔ خصوصاً اُن دِنوں میں جب کہ شراب چھوڑ دی جاتی تھی۔ عموماً سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے تھے اور اکثر اوقات دوست سگریٹ سُلگا کر دیتے تھے۔ کثرتِ سگار نوشی کی وجہ سے اُن کی وہ اُنگلیاں زرد پڑ گئی تھیں جن سے سِگار پکڑتے تھے۔ ایک دن سگریٹ کی تعریف میں ایک جدید ایرانی شاعر کا یہ شعر سُنایا:

سیگارِ بے تقلّب و نازِ پری وشاں
ایں ہر دو درکشاکشِ دوراں کشید نیست

دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سگریٹ ہاتھوں میں لیے سو گئے یا نشے میں غافل ہو گئے۔ فلیمنگ روڈ والے کمرے کے بستر سے دھواں اُٹھنے لگا۔ فضل ملازم چلّایا۔ والدہ محترمہ آئیں اور اُنھوں نے اختر کو

بستر سے جُدا کیا۔ ابتدائی دَور میں اکثر عبداللہ پسند کرتے تھے۔

میں نے اُن کو پان سگریٹ اور شراب کے سوائے کوئی چیز بازار سے خریدتے نہیں دیکھا۔ لباس اور اُن کی ضروریات کی تمام چیزیں اُن کے لیے اُن کی والدہ محترمہ خرید کر منگواتی تھیں۔

آخر عمر میں سر کے آگے کے بال کچھ سفید ہو گئے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ اس سفیدی کو چھپائیں اور اس مقصد کے لیے عموماً ہائیڈروجن پر آکسائیڈ منگوا کر لگایا کرتے تھے۔

وہ بے حد ملنسار اور خلیق تھے لیکن کبھی کبھی ذرا خشک نظر آتے تھے مگر جب کُھلتے اور خصوصاً بوقتِ مے پرستی کُھلتے تو طبیعت بے حد شگفتہ بن جاتی تھی۔ عالم کیف میں سب کچھ ہوتا تھا لیکن ہوش کی حالت میں مَیں نے اُنھیں بے حد متین دیکھا۔ چہرہ عموماً متبسّم رہتا تھا اور ہوش کے عالم میں کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ جن لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا اُن سے ملاقات کے وقت بالعموم خاموش سے بیٹھے رہتے تھے۔

سینما سے اُنھیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پہلے پہل جب متکلّم فلمیں لاہور میں آئیں تو مَیں تین چار بار اُنھیں لے گیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی جگہ حسین صورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں اِدھر اُدھر رونق افروز تھیں۔ البتہ ہندوستان کے مشہور رقاص شنکر کی فلم اُنھیں پسند آئی اور خصوصاً وہ منظر اُنھیں زیادہ پسند آیا جس میں پجارنیں مندر کے باہر دروازہ پر شمعیں ہاتھ میں لیے کمال عقیدت سے رقاصانہ وارفتگی کی مظاہرہ کر رہی تھیں۔۔۔۔ بایں ہمہ لُطف یہ ہے کہ فلموں والے آتے اور اُن سے اپنی فلموں کے لیے منظوم و منثور مکالمے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ ''شہرود'' میں اُن کا لیلیٰ و مجنوں والا مکالمہ اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اخترؔ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور اُن کی بیماری بالعموم شراب کے بعد کی خماری کیفیت کا نتیجہ ہوتی تھی۔ جس نے آخر میں اُن کے جگر اور عصبی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔۔۔۔۔ دو تین مرتبہ اُنھوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں یاد فرمایا جنھیں گاہے گاہے ضیّق النفس کی شکایت رہتی تھی۔

ایک مرتبہ اخترؔ نے ایک پردہ نشین ضعیفہ مہمان کے علاج کے لیے مجھے گھر بلوایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ تنگ کمرہ اور مریضہ صاحبِ فراش لحاف اوڑھے پسینے میں شرابور پڑی تھیں۔ اُن کا یہ حال دیکھ کر

میرے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ مریضہ کو حال بیان کرنے کی زحمت دوں۔ معلوم ہوا کہ عُجلت میں اخترؔ نے پردے کے لیے معمولی چادر کی جگہ لحاف دے دیا تھا۔

اخترؔ مال و زر کے معاملے میں قطعاً بے نیاز انسان تھے۔ اُن کے نزدیک سونے چاندی کی ٹکلیوں اور خزف ریزوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ طبعاً نہایت بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے۔ اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اِتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں اُن میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق اور دوست نواز دوست تھے۔۔۔۔۔ عطا پاش اور خطا پوش۔۔۔۔۔ اور اِس قدر غیور کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں حُسن کی سرکار کے سِوا کبھی کسی امیر و وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ: ؎

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جُھکتا
فقیری میں بھی اخترؔ غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

یہ سچ ہے کہ بسا اوقات شراب کے لیے وہ عالم بے خودی میں ضرور مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں اُنھوں نے خدا کے سِوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ ایک مردِ قلندر اور فقیرِ خاک نشین تھے اور اُن کے دل میں مہر و یاری کے سوا کسی کے لیے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہ تھی۔

پھر سیر چشمی و مال و منالِ دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک اُن کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب اُن کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تا آنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں تھا۔

اِسی ضمن میں ایک لطیفہ بھی سُنیے کہ ایک مرتبہ اختر ایک سرکاری اِدارے سے اپنے ڈیڑھ سو روپے لینے تشریف لے گئے لیکن وہاں دِقت یہ پیش آئی کہ اُن کو کئی جگہ کلرکوں کے پاس جا کر کئی

رجسٹروں میں دستخط کرنے پڑے۔ اب اُنھوں نے دو جگہ تو یہ تکلیف گوارا کر لی۔ لیکن جب یہ اُن کو تیسری جگہ ایک کلرک کے پاس جا کر دستخط کرانے کے لیے کہا گیا تو یہ کہہ کر خالی ہاتھ گھر واپس آگئے کہ بھائی ہم سے یہ بار بار دستخط نہیں ہوتے۔

اختؔر بے حد ہمدردِ بنی نوعِ انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تِلمِلا اُٹھتے اور اکثر رو پڑتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ کبھی دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ انارکلی میں ٹانگے میں سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ ’’جو کچھ ہے اِسے فوراً دے دو۔ میں عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔‘‘

شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سوائے جب کسی کو آتے دیکھتے شراب کی بوتل کو اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش کرتے اور رقیق القلب اِس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند مرجھائی ہوئی کلیاں پڑی ہوئی نظر آئیں وہیں بیٹھ کر دیر تک اُنھیں دیکھتے اور روتے رہے کہ

مجھے تو کچھ انھی بیمار کلیوں سے محبت ہے

پس حقیقت یہ ہے کہ اختؔر اپنے ادب اور آرٹ کی طرح اخلاق، انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے انسان تھے۔۔۔ ایک اِتنے بڑے انسان جو کہیں صدیوں کے بعد اِس خرابہ زار میں آتے ہیں۔

گردوں نیا در دچو تو اختر بصد قراں

اختر نے اپنے مخالف معاصرین میں سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا اُسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے اُنھیں دنیاوی امور میں کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم ناراض ہوتے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو صرف سلام و کلام کم کر دیتے اور بس۔۔۔ دشمنوں کے معاملے میں اُن کا رویّہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلے میں اُنھیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ایک دن جب وہ اُن کے سامنے سے گزرا تو اُسے لپٹ گئے اور اُلٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔

اختر اپنے دوستوں کے معاملے میں بے حد فیّاض، سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جس سے تعلّق ہوگیا اُسے ساری عمر نبھایا۔ دوستوں کے ساتھ تمام عمر وہ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہے۔ مثال کے طور پر اس ضمن میں میرے ساتھ اُن کا سلوک یہ تھا کہ اخترؔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور اخترؔ صاحب کہنے پر ناراض ہوجاتے تھے۔ کہتے تھے مجھے اخترؔ کہا کیجئے۔ ساتھ ہی اُنھیں اِس قدر پاسِ خاطر تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سُن لیتے تو بوتل کو جسے وہ دخترِ گردن دراز کہا کرتے تھے، اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش فرماتے تھے۔۔۔۔ بااین ہمہ لطف یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلّف اپنا ہر دُکھ درد بیان ہوتا تھا اور مجھے اپنے عشق و عاشقی کے دلچسپ فسانے سُنائے جاتے تھے۔

۱۹۳۴ء تک میں چوک چُونا منڈی میں تھا۔ اس کے بعد میں اپنا مطب مستی دروازہ کے باہر اپنے مکان نیّر منزل میں لے آیا۔ یہاں بھی اختر حسبِ معمول باقاعدہ تشریف لاتے اور بالعموم شام کو سورج چُھپے تشریف لاتے اور کوشش کرتے کہ اُسی رات گھر تشریف لے جائیں لیکن جب گھر سے ناراض ہوتے تو بالعموم یہاں اُن کا ہفتوں قیام رہتا تھا۔ اور اِس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بلا اطلاع کہیں شب گزاری نہ ہو۔

ایک دن مجھے اطلاع دیے بغیر رات کو سلیم کے ہاں مزنگ چلے گئے اور اِس خیال سے کہ مجھے زحمتِ انتظار نہ ہو یہ منظوم خط لکھ کر مجھے ایک دوست کے ہاتھ ارسال فرمایا:

برادرِ معظّم و محترم دامت معالیکم

سلیم نے مجھے ٹھہرا لیا ہے آج کی رات
کسی بہانے سے بہلا لیا ہے آج کی رات
بہانہ جو بھی ہے بے حد حسین ہے لیکن
نہ جانیے مجھے بہکا لیا ہے آج کی رات
ہے واقعہ فقط اِتنا کہ اِتفاقاً آج
نگاہِ حُسن نے اپنا لیا ہے آج کی رات
کسی حسینہ کا ہے انتظار دونوں کو
کسی حسینہ نے بہکا لیا ہے آج کی رات
معاف کیجے مِری غیر حاضری پھر آج
کہ ایک حُور نے پُھسلا لیا ہے آج کی رات

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اُٹھا رکھی ہے ۔۔۔۔۔ اخترؔ

ایک دن، رات کو ایک بجے کے قریب کہیں سے تانگے میں تشریف لائے اور جب تانگے سے

اُترے تو کوچوان سے عالم مستی میں کچھ سخت کلامی ہوگئی۔ صبح خواب سے اُٹھے تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ رات میں نے ایک تانگے والے کو کچھ سب وشتم کیا تھا میری آواز بھاوج تک تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ یہ تھا اُن کی شرم، مروّت اور لحاظ کا عالم جو اُن کی ذاتی ونسبی شرافت کا نتیجہ تھا۔

دوستوں کی تقریباتِ مسرّت میں وہ جس انداز میں شرکت فرماتے تھے اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہے کہ میرے گھر کے بچّوں کے ساتھ اُنھیں گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر جب گھر آتے تو بچّوں کے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اور اُن کی تقریبات میں گھر کے ممبروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میرے بچّے سکندر صولت کی سالگرہ ہوئی تو جھومتے ہوئے آئے اور یہ نظم لکھ کر سب کو سُنائی: ؎

سُنا رہی ہے نویدِ بہار سالگرہ — مسرّتوں کی ہے پروردگار سالگرہ
زبسکہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی — بجا ہے کہیے سکندر وقار سالگرہ
سما رہی ہے نگاہوں میں بن کے عالم کیف — بسا رہی ہے دِلوں میں بہار سالگرہ
دیارِ قدس سے آئی ہے حور کی صورت — مسرّتیں لیے بہرِ نثار سالگرہ
خوشی کے پُھول برسنے لگے فضاؤں میں — لُٹا رہی ہے بہشتِ بہار سالگرہ
خوشی سے پُھولے سماتے نہیں ہیں خورد وکلاں — بڑھا رہی ہے ہر اِک دل میں پیار سالگرہ
اِسی فروغ سے تا حشر بار بار آئے — دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ
دعا ہے عمرِ سکندر کا رشتۂ محکم — اِسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ

خوشی سے رقص کریں مل کے ساقی و اختر
پلا رہی ہے مئے خوش گوار سالگرہ

ایک مرتبہ میری اہلیہ گھر سے ناراض ہو کر کچھ مُدّت کے لیے بھوپال چلی گئیں۔ اخترؔ ہمارے گھر کی ناراضگی کی اطلاعات سے بہت مغموم رہتے تھے۔۔۔۔۔ لیکن کچھ دِنوں کے بعد جب میں اپنی بچّی رخسانہ اور اُس کی والدہ کو بھوپال جا کر گھر لاہور لے آیا تو بہت خوش ہوئے اور اس وقت اُنھوں نے یہ اشعار کہے: ؎

دل کا سکوں لیے ہوئے رخسانہ آ گئی — نیّر کدہ میں رونق کاشانہ آ گئی
بھوپال کی خبر ہے کہ بھاوج بھی آ گئیں — بھائی کے گھر میں عشرتِ جانانہ آ گئی
اپنے پرائے آج محبت سے خوش ہوئے — ہر ایک کو گماں ہے کہ سُلطانہ آ گئی
بھائی گئے تھے لینے فقیرانہ جس کو وہ — لاہور میں بہ شوکتِ شاہانہ آ گئی
آنے کا اُن کے سب کو ہُوا اُس کے یہ خیال — وہ جانِ کعبہ، روحِ صنم خانہ آ گئی
نیّر کے دل کو آج نہ ہو کس طرح خوشی — وہ رشکِ صد پری و پری خانہ آ گئی
مانا خلوص میں ہوئی جو کچھ ہوئی کمی — شمعِ خلوص کی وہی پروانہ آ گئی

ہر چند تھی خفا مگر اِظہارِ شوق پر
بھاوج ہماری اخترؔ دیوانہ آ گئی

اِن مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کا اپنے دوستوں اور اُن کے گھروں کی غم و شادی کے ساتھ کس طرح کا اور کس قدر رابطہ رہا کرتا تھا۔

اُن کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم اختر کو ہمیشہ اختر کی جگہ ُداوَ ٗد کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اختر اُن کے اکلوتے فرزند تھے اور ایسی صورت میں قدرتی طور پر حافظ صاحب مرحوم کو اختر کے ساتھ جو محبّت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ وہ اوّل اوّل اختر سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ وہ اختر کے ادبی رسائل میں اپنے مضامین اشاعت کے لیے دیتے۔ لغت اور شعر کے بارے میں اُن کو اختر کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ چنانچہ اُن دِنوں میں بھی جبکہ ا اختر سے ناراضگی تھی میں نے دیکھا کہ فضل ملازم بالا خانے سے کوئی چٹ لاتا جس میں کسی لغت یا تاریخی مسئلے میں اختر کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔

اِدھر اختر کی یہ حالت تھی کہ اُن کے بال بچّوں کے کفیل صرف حافظ صاحب مرحوم تھے اور اخترؔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز لا اُبالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اختر سماج کے باغی تھے اور اُنھوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا۔ کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ اُنھوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کیے، لیکن وہ کبھی

زیادہ دیر تک نہیں چل سکے۔ کیونکہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ ''پھولوں کے گیت'' مجموعۂ نظم سے جو آپ نے بچّوں کے لیے لکھا تھا غالباً دو سو روپے ملے۔ یہ روپے لے کر وہ لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں امرت سر کے کچھ نوجوانوں کو پتہ چلا کہ اختر کے پاس روپے ہیں۔ اُنھوں نے اُن کو سٹیشن پر گاڑی سے اُتار لیا۔ اُنھوں نے یہ روپے قرض لیے اور دو چار دن میں عیش و عشرت میں اُڑا دیے۔ لیکن اب اخترؔ کی سادگی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بیٹھے شیراز ہوٹل میں روپے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ روپے کی صورت میں کوئی چیز بھی اُن کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں اُن کے آخری مجموعہ ہائے کلام سے جو کچھ روپے وصول ہوئے بہ مشکل تمام اُن کا عشرِ عشیر حصّہ اُن کے بچّوں تک پہنچایا جا سکا۔ دستار اُن کے پاس نہ تھی۔ ایک کوٹ کبھی کبھی رہن مے ہوتا دیکھا جاتا تھا۔

ابتداء میں حافظ محمود شیرانی مرحوم نے کئی بار کوشش کی کہ اختر کو کسی کام میں لگا ئیں لیکن اختر ہمیشہ اِس راہ سے دامن بچاتے رہے۔ حافظ صاحب مرحوم جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تو اختر سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر ۱۹۳۵ء میں اختر کو دارالترجمہ حیدر آباد (دکن) میں ایک عُہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ در حقیقت وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذِمّہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اختر کی دن رات کی خلوت گزینی یا کوچہ گردی، گھر اور گھر کی زندگی سے بیزاری، دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی زندگی کی سود و بہبود سے بے نیازی، ہر وقت کی شعر نوازی اور ہمہ وقت عیش کوشی، رِندی و مستی، اقارب و اعزّہ سے لاتعلقی، ایک خاص قسم کے آوارہ و مجنون اور رسوا سرِ بازار لوگوں کی طرح زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے سروکار۔۔۔۔ یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنھوں نے اختر کے والدِ محترم کے دل میں اُن کے خلاف سخت غم و غُصّہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دیے تھے۔

ساتھ ہی بعض مخصوص قسم کے احباب گاہے گاہے حافظ صاحب مرحوم کو مخصوص انداز میں ان حالات سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا، اختر اپنے یگانۂ روزگار باپ پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور قدرتی طور پر اُن کے والدِ محترم کی یہ دِلی خواہش تھی کہ اُن کا فرزند بھی سوسائٹی اور ملک میں عزّت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے۔۔۔۔۔لیکن اخترؔ کی اس زندگی سے جو اُنھوں نے اختیار کر رکھی تھی اختر اور اُن کے والدِ محترم کے درمیان رفتہ رفتہ افتراق وشقاق کی ایک بڑی خلیج حائل ہوگئی تھی اور اِس لیے اختر کی گھر کی زندگی بے حد تلخ ہوگئی تھی۔ اور صورت یہ ہوگئی تھی کہ گھر اُن سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار۔۔۔۔۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہوگئے اور اِس مقصد کے لیے اکثر میرے غربت کدہ کو شرفِ انتخاب بخشا۔۔۔۔۔لیکن پھر کسی نے گھر والوں سے صلح کرادی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

اکثر اُن کا معمول یہ تھا کہ رات گئے گھر لوٹتے تھے اور اِس اثناء میں بارہا ایسا ہوا کہ اُن کے والدِ محترم نے غصّہ میں آکر مکان کے اندر سے زینے کے دروازے کو قفل لگا دیا۔ اختر آتے اور اس دروازہ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیرِ اثر اُن کی والدۂ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آکر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور اِس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا۔

اِس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور۔۔۔۔۔اُن کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں ہوں رات کو کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے۔ یعنی مست ولایعقل رہنے کے باوجود اِس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہُوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں دن بھر غائب رہتے اور رات کو دو بجے تشریف لاتے تھے۔ اِن تمام امور کے باوجود اختر اپنے والدِ محترم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنے والدِ محترم کا نام لیتے بڑے احترام سے لیتے اور اکثر اُن کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔ عام

لوگوں کو اِس سلسلے میں اختر کی محبّت کا اندازہ اُس وقت ہوا جب ٹونک میں اُن کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رِندِ خرابات نے راستے میں جنازہ روک کر پٹّی پکڑ کر کچھ اِس انداز میں صدائے نالہ وشیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اِس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

اختر کے ساتھ شراب کا تصوّر لازم وملزوم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ میں نے ذکر کیا ہے کہ اختر سے میری ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی ہے۔ اس وقت اختر شراب کے خوگر ہو چکے تھے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور پہنچنے کے بعد اُنھیں اُن کے مخصوص قسم کے دوستوں نے شراب کے ذائقہ سے آشنا کرایا۔ بعد میں جب علّامہ تاجور مرحوم نے لاہور میں مرکزِ اُردو ''حلقۂ اربابِ علم واَدب'' کے نام سے قائم کیا اور یہاں ہند کے دیگر مشاہیرِ شعر واَدب کے ساتھ ساتھ حضرت جگر مراد آبادی بھی کچھ مُدّت کے لیے قیام پذیر ہوئے تو حضرت اختر نے اس سلسلے میں اس پیرِ مغاں کی بیعت کی۔ اختر کا بیان ہے کہ میں شعر میں علّامہ تاجور کا شاگرد ہوا اور شراب میں حضرت جگر کا۔ ابتدائی دِنوں میں اُنھوں نے اپنا کلام علّامہ تاجور کو دِکھلایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈھل گئے۔

شراب میں یہ جگر کی تقلید کا مسئلہ اِس حد تک خبرِ متواتر کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب اختر طبّی مشورہ کے لیے حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم کے پاس گئے تو اُنھوں نے نبض دیکھ کر برسبیل تفنّن فرمایا کہ ''جگر کے کباب کھاؤ۔''

رفتہ رفتہ اختر اِس حد تک شراب میں بہہ گئے تھے کہ اُن کے جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی۔ شراب، ہر وقت اور ہر لمحہ شراب۔۔۔۔ آخر میں شراب کی بدولت اُن کا گوشت ہڈیوں سے جُدا ہو گیا۔ جگر جل کے کباب ہو گیا اور شراب نے اُن کی زندگی کے بخیے اُدھیڑ دیے۔

اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح نہ تھی۔ اُن کی عادت یہ تھی کہ جب وہ آغاز کرتے تو بے تحاشہ پیتے۔ اکثر سودیشی پیتے اور آخر میں صورت یہ تھی کہ پانی ملانا شرک سمجھتے تھے۔ جب دَور شروع ہوتا تو عموماً دو دو ہفتے جاری رہتا اور لطف یہ تھا کہ اِس مُدت میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی۔ اُس کے بعد خمار اور اس کے ساتھ قے اور اُبکائیوں اور بے چینی اور گھبراہٹ کا زمانہ آتا۔ اب دو چار دن کے لیے

ناغہ کرتے اور پھر دَورِ لازم آجاتا۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے بہت سے دوستوں نے جو خود تو منکر تھے لیکن ان کے ساتھ ''ہم رنگِ مستاں زیستن'' کے عادی تھے، انھیں شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بے کار۔۔۔ بارہا مجھ سے نہ پینے کا وعدہ کر کے جاتے لیکن اِس کے باوجود میں دیکھتا کہ پیے ہوئے اور جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ پوچھتا کہ ''حضرت! یہ کیا ہوا؟'' فرماتے کہ ''اِس دفعہ آخری بار حماقت ہوگئی۔''

کئی بار سخت کوشش کی کہ اُنھیں مجبور کر کے شراب سے باز رکھا جائے لیکن جب کبھی دو چار دن کا ناغہ ہوا اِس اثناء میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ہم مشرب ٹپک پڑا جو اُن کی توبہ کے ٹکڑوں کو چند روز بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حُسنِ طلب کچھ ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پورا کیے نہیں رہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سرما کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطب کر رہا تھا، دو مشہور بلانوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا ''دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں۔''

دوسرے صاحب بولے۔ ''اور شاعر کوئی آئے تو پلا دیتے ہیں۔''

اور آپ نے فرمایا۔ ''اہلِ دل ایسے مسیحا کو دُعا دیتے ہیں۔''

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔ شراب کے لیے رقم طلب کر کے اکثر فرمایا جاتا تھا کہ بس آخری موقع ہے اِس کے بعد اس کو مُنہ نہیں لگاؤں گا۔ لیکن یہ کافر ہمیشہ مُنہ سے لگی رہی۔

شراب پی کر شرابی دوستوں کو ساتھ تانگہ میں لے کر عموماً باہر نکلتے اور دوستوں کے یہاں پہنچتے ۔ملک میں سودیشی کا چرچا تھا۔ ٹھرّا پینے کی عادت کی جانب اِشارہ کر کے فرماتے کہ میں سودیشی تحریک کا زبردست حامی ہوں۔ شرابیوں اور شراب خانہ کے کاروبار سے جو آپ کو لگاؤ تھا اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ انارکلی کے چوک کے دائیں طرف ٹھیکے کی دکان پر ایک مسلمان بادہ فروش

ترکی ٹوپی اوڑھے شراب بیچ رہا تھا۔ جب اُس کا سر ہلتا اور ٹوپی کا پُھندنا جُھولتا، آپ قہقہے لگاتے اور جھومتے۔

اربابِ غرض مختلف کاموں کے سلسلے میں اختر کے پاس آتے تھے۔ کئی لوگ سفارشی خطوط لکھواتے۔ کئی اُنھیں اپنے کاموں میں سفارش کے لیے ساتھ لے جاتے۔ کئی اُن سے اپنے اخبارات و رسائل کے لیے نظمیں لینے کے لیے آتے۔ اور کئی دوست اُن کے پاس آ کر اپنی فلموں کے لیے اُن سے مکالمات لکھواتے۔ اختر اِس طرح کے اکثر کام بخندہ پیشانی مفت انجام دیتے تھے۔۔۔۔ اور گاہے ان کاموں کی قیمت دیسی شراب کی صرف ایک بوتل ہُوا کرتی تھی۔ جو اُس زمانے میں دو ڈھائی روپے میں آتی تھی۔

اختر کی شاعری بڑی حد تک سلمیٰ کے تصوّر کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اختر کی شاعری سلمیٰ کے عشق کی رنگین داستان ہے۔ اِس لیے ضروری ہوا کہ چند کلمات یہاں سلمیٰ کے متعلق بھی عرض کیے جائیں۔

جہاں تک لفظِ ''سلمیٰ'' کا تعلق ہے یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے:

؎ قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا　　چہ شود گر بسلامے دلِ ما شاد کُنَد
؎ منزلِ سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام　　برصدائے سارباں بینی و آہنگِ جرس
؎ مَا بَلِیٰ وَمِن بِذِی سَلَمِ　　اَیْنَ جِیْرَانَنَا وَ کَیْفَ الْحَال
؎ اَمّن اَنکَرتَنیٔ عَن حَبّ سَلْمیٰ　　غَرِیْق الْعِشْق فِیٔ بَحْرِ الْوَادِی

اور جامی کہتا ہے کہ:

؎ اَمَّن شَرَقَاَ اِلیٰ دَیَارِ لَقِیْتُ فِیْھَا جَمالِ سَلْمیٰ　　کہ مے رساند ازاں نواحی نوید لطفے بجانب ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مراد ایک متعین شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اِس لیے بھی مخفی رہا کہ اختر اِس راز سے پردہ اُٹھانا

نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے اُن کو اِس کی اِجازت نہیں دی گئی۔ وہ آخر عمر تک اِس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے اُنھیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُن کا یہ طریق کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رُسوا کرنے کا فائدہ!

قدرتاً سلمیٰ کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اُن کا نام منظرِ عام پر نہ آئے اور جب اُنھیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اِشارات کرنے لگا ہے تو اُنھیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا کہ:

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر　　اُس نے لکھا ہے کہ تُو یوں ہمیں بدنام نہ کر
غیرتِ حُسن کو منظور نہیں رسوائی　　ضبط اے عشق! اِس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اِس حد تک اِخفاء کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمیٰ کے خطوط کا اُس وقت جو مجموعہ مرتّب کیا اُس میں اپنے لیے بھی اختر کی جگہ ''کوکب'' کا لفظ اختیار فرمایا۔

یہ مجموعۂ مکاتیب اُن دِنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکّر لگاتا رہا، چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اُس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اُس وقت کسے خبر تھی کہ:

ہے آج جو سرگزشت اپنی　　کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک نقل آغا خادم حسین بٹالوی اور سلیم کے پاس موجود ہے۔

بہر کیف احباب کی اطلاع کے لیے اِس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمیٰ جن کا اصل نام اور ہے ایک متعیّن شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔

سلمیٰ سے اختر کے معاشقہ کی ابتداء ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل سلمیٰ کا ایک مکتوب اُن کے نام پہنچا اور اُسے پڑھ کر اُنھوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع ہے کہ:

لے آئے انقلابِ سپہر بریں کہاں　　اللہ میں کہاں، وہ ثریّا جبیں کہاں

اس کے بعد جب درِ جاناں پہ طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ:

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات　　کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات

کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات   کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں   باغ میں پھول، سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں   ایک میں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

''آج کی رات'' کے عنوان سے یہ تمام نظم اِسی نوع کے جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ یہ نظم یومِ ملاقات سے پہلے کی ہے لیکن اس کے بعد جب ملاقات ہو چکی تو اختر بر سبیل تقاضائے باز دید یوں ترانہ طراز ہوا کہ:

تمھیں ستاروں نے بھی بار بار دیکھا ہے   شریر چاند نے بے اختیار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے   نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو   بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
قریبِ شام تمھیں طائرانِ گلشن نے   ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے
نسیمِ باغ نے زیب النساء سمجھ کے کبھی   تمھیں بہ گُل کدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو   ہزار بار نہیں، لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مِری نگہ شوق کو شکایت ہے   کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے
دِکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور پھر اس کے بعد کی ایک ملاقات کا نقشہ ملاحظہ کیجئے:

کون آیا مِرے پہلو میں یہ خواب آلودہ   زُلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر   کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حِنا کی خوشبو   کِس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ   کِس کو شِکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا

حسرتِ بوسہ پہ اخترؔ یہ خیال آتا ہے

میرے ہونٹوں سے ہوں کیوں برگ گلاب آلودہ

اختر، سلمیٰ کی نسبت سے دیارِ سلمیٰ کا بھی جو مدت سے آذرکدۂ نیازمندانِ شوق رہا ہے عاشق تھا اور اِس سلسلے میں اُس نے بربطِ عشق پر بڑے دل گداز نغمے چھیڑے ہیں۔ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اے سرزمین گجرات اے خلد زارِ اُلفت   پھولوں میں ترے رقصاں روحِ بہارِ اُلفت

تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدارِ اُلفت   اور یادگارِ اُلف۔۔۔اے سرزمین گجرات

عریاں ہے حُسن تیرے سرسبز گلشنوں میں   آوارہ عشق تیرے شاداب دامنوں میں

فطرت برہنہ تیرے پُرنُو رایمنوں میں   رنگین مسکنوں میں۔اے سرزمین گجرات

پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے   رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے

سلمیٰ کے پاؤں سر پر دھرنے کی آرزو ہے   مرنے کی آرزو ہے۔۔اے سرزمین گجرات

ایک مرتبہ سلمیٰ جب بیمار ہوئیں تو اختر نے اُنھیں ایک منظوم خط لکھا کہ:

تندرستی کا گِلہ کیا ہے، شکایت کیا ہے   میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے

عشق بیماری ہے اور کتنی حسیں بیماری   کیا خبر بے خبروں کو، یہ لذّت کیا ہے

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب!   آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے

رو دیے جب بھی سُنی درد بھری کوئی خبر   درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے

اُن کی صحت کی خبر آئے گی، جلد آئے گی   دلِ ناداں! تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے

سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں اُن پر   ہم نہیں جانتے اخترؔ کہ عیادت کیا ہے

تقریباً پانچ چھ سال تک یہ سلسلۂ معاشقہ جاری رہا لیکن آپ کو اِس ضمن میں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ تمام دَور جنسی آلودگی سے قطعاً مبرّا رہا۔ مجھے اخترؔ نے ذاتی طور پر ان حالات سے خود آگاہ کیا اور خود اختر کی تحریروں سے بھی یہ چیز واضح ہے۔اختر اپنے اِس مجموعۂ مکاتیب میں جو آج بھی دوستوں کے پاس

ہے، ایک مکتوب میں سلمیٰ کو اپنی ملاقات کا وقت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ’’کیا آپ میری محبّت کی معصومیت اور ملکوتی اور مقدّس حیثیت کی داد نہ دیں گی۔‘‘ اور اِس کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہیں کہ: ’’آپ انسان نہیں دیوتا ہیں اور آپ کی اِسی شان نے مجھے خرید لیا ہے۔‘‘ (یہ مکتوب روزنامہ آفاق لاہور کی اشاعت مؤرخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)۔

اختؔر اپنی ایک نظم میں بھی اِس جانب اِس طرح اِشارہ کرتے ہیں:

قسم اُس پاک بازی کی جو تھی باہم خیالوں میں قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبورِ وحشت تھی قسم اُس پاک دامانی کی جو مغرورِ عفّت تھی
محبّت کی انھی معصوم راتوں کی قسم تم کو حقیقت کی انھی موہوم راتوں کی قسم تم کو

فقط اِتنا بتا دو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں، آہ وہ راتیں، وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

اختؔر و سلمیٰ کے مجموعۂ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو اُن کو رِشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جاسکتا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔ بالآخر غالباً ۱۹۳۲ء میں سلمیٰ ایک جگہ رشتۂ تزویج میں باندھ دی گئیں اور یہ سلسلۂ نامہ و پیام ہمیشہ کے لیے وعدۂ حشر پر ختم ہو گیا۔۔۔ اختؔر نے اِس موقع پر اپنی محبوبہ کو مطلع کر دیا کہ:

دل و دماغ کو رو لوں گا، آہ کر لوں گا تمھارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
تمھاری یاد میں مَیں کاٹ دوں گا حشر سے دن تمھارے ہجر میں راتیں تباہ کر لوں گا
اگر مجھے نہ ملیں تم تمھارے سر کی قسم میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا

جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

اور یہ سچ ہے کہ اس کے بعد واقعی اختر نے اپنی جوانی تباہ کر لی۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ اختؔر جب آسمانِ شعر و ادب پر چمکے اور سلمیٰ کی یاد اُن کے نغموں سے

فضائے ارض میں گونجی تو اس سے سب سے زیادہ کالجوں کا ماحول متأثر ہوا جن میں طلباء کی طرح طالبات کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کے علاوہ ملک کی ادب نواز خواتین نے اختر کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ جن میں سے اکثر بڑے ممتاز اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ تھیں۔

بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خط لکھتی تھیں۔ بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لیے خطوط لکھتیں۔ اور ممکن ہے اُن میں سے بعض کو اخترؔ سے کچھ دِلی لگاؤ بھی رہا ہو لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حُسن اور نسائیت کے لیے اُس کے احساسات اور بے پناہ طوفانِ جذبات کو دیکھ کر اُس کی قدر داں اور اُس کے ہُنر کی دلدادہ تھیں۔ بعض کا معمول یہ تھا کہ اُس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اُس کو خطوط لکھتیں اور تفریحاً چھیڑتی تھیں۔ جو خواتین اُس سے اپنے کلام میں اصلاح لیتیں اکثر اُس کے کمالِ فن کی ستائش کر دیتیں۔ اور یہ اختر کی سادگیٔ تمنا تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبّت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے تقریباً سب کا تعلق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔

وہ خواتین جن کی اخترؔ سے مراسلت رہی ہے زہرہ، پروین، ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رخ، شمسہ اور لیلیٰ تھیں۔ لیکن اِس ضمن میں لاہور کی عذرا، سندھ کی زلیخائے جواں، امرت سر کی نوبہار ناز اور لکھنؤ کی ممتاز ادیبہ سے بہت زیادہ سلسلۂ نامہ و پیام قائم رہا ہے۔ عذرا سے متعلق اختر نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے:

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شامِ بہار آ گئی

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سندھ کی زلیخائے جواں اکثر دہلی سے سندھ یا سندھ سے دہلی جاتے ہوئے لاہور سے گزرتیں تو اُن کے خیر مقدم کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ ادبِ اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

راہِ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے — خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اور پھر

سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا — لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا

ماناکنارِ سندھ ہے مضطر ترے لیے ۔۔۔ کچھ تو علاجِ پہلوئے پنجاب کر کے جا

جیسی نظمیں اُسی دَور کی یادگار ہیں۔

ماہ لقا لکھنؤ کی شان میں لکھا:

کب تلک رونق شامِ اودھ اے ماہِ رواں ۔۔۔ شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آ کر

اور امرت سر کی نوبہارِ ناز کی شان میں تحریر فرمایا:

ہر ذرہ اُس کے حُسن سے روشن ہے آج کل ۔۔۔ امرت سر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل

عمر کے آخری حصّے میں اخترؔ کو شیریں سے کچھ رابطہ رہا ہے اور اس کا علم مجھے اِس طرح ہوا کہ ایک دن مرنے سے کچھ مدت پہلے میرے مکان کے سامنے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ فرمانے لگے ''آج شیریں کی موٹر اِدھر سے گزرے گی۔'' شیریں کے متعلق آپ نے جو اشعار کہے وہ ''شہناز'' میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

مِری روح شیریں، مِری جان شیریں ۔۔۔ تمنّائے زریں و ارمان شیریں

ترا رخ ہے برقِ سحابِ بہاریں ۔۔۔ ترے لعل لب ہیں گلستانِ شیریں

دیکھ اے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں ۔۔۔ ذرہ ذرہ سے مچلتی ہے بہارِ شیریں

خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شان و عظمت ۔۔۔ اختر اِس خاک میں روشن ہے وقارِ شیریں

یہاں میں ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اختر عورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور سلمیٰ کی مہجوری کے بعد وہ خاص طور سے بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے۔ جب بھی کوئی حسین صورت دیکھتے خود سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین صورت کا سامنا ہو جانا اُن کے لیے مصیبت تھا۔ جس کا اظہار اُن کے چہرے سے ہونے لگتا تھا۔ ایک دن میں مزنگ میں اُن سے ملنے گیا۔ پتہ چلا کہ ایک حُسنِ رہگزر کی جستجو میں سڑکوں پر اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن کا پیچھا کیا اور جب مل گئے تو پوچھا کہ آخر اِس آوارہ گردی سے مقصد؟۔۔۔۔ فرمانے لگے: ''زندگی کا اِس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔'' اکثر ایسا ہوتا کہ یوں ہی کوئی صورت دیکھ کر اپنا ٹانگہ کسی ٹانگہ کے پیچھے دوڑانا شروع کر دیتے

تھے۔ایک بار لاہور سے گزرتے ہوئے سندھ کی شوخ کمسن نے گنڈیریاں کھا کے جب چھلکے پلیٹ فارم پر پھینکے تو وہ چھلکے سمیٹ کے سٹیشن سے گھر رومال میں باندھ لائے۔

خطوں کے معاملے میں یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی حسین خط آتا بار بار پڑھتے، جھومتے اور کئی کئی دن تک خاص خاص دوستوں کو دِکھلاتے اور سُناتے تھے۔مرنے سے کچھ دن پہلے ان مہکتے ہوئے ہوئے خطوط کی نسبت اِرشاد فرمایا:

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر — آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کی زندگی کے تین دَور ہیں۔ پہلا دَور سلمیٰ سے معاشقہ سے پہلے کا دَور ہے، اس زمانے میں اختر نے ''جوگن''، ''تیتری'' اور ''نغمۂ سحر'' وغیرہ عنوانوں سے دلکش نظمیں لکھیں۔دوسرا دَور سلمیٰ سے معاشقہ کے زمانے کا ہے۔اِس دَور کا تقریباً تمام سرمایۂ شعر و ادب سلمیٰ کے عشق کی حکایت لِذیذ و دراز پر مشتمل ہے۔اختر کی مشہور نظمیں ''آج کی رات''، ''گجرات کی رات''، ''اے سرزمین گجرات''، ''اے عشق کہیں لے چل''، ''انگوٹھی''، ''آہ وہ راتیں''، ''اعترافِ محبّت''، ''بستی کی لڑکیوں میں''، ''بعض رومانی لمحات کی یاد''، ''ایک تصویر دیکھ کر''، ''سلمیٰ نورجہاں کے مزار پر'' اور ''مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں'' اسی دَورِ بہار سے متعلق ہیں۔

تیسرا دَور سلمیٰ سے مہجوری کا زمانہ ہے۔اس میں اختر نے ابتداءً دنیا سے تنگ آ کر ہر مہکتے دروازے پر دستک دی ہے اور ہر لہکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔''عذرا، ناہید، سندھ کی شوخ کمسن، شیریں'' اور دوسرے حسین عنوان اسی دَور سے متعلق ہیں اور اختر کی نظم ''میری داستانِ حیات'' جو ''لالۂ طور'' میں درج ہے اس دَور کی زندہ تصویر ہے۔اس دور کا آخری حصّہ تمام تر نالہ وشیون اور آہ و بکا پر مشتمل ہے جس میں اختر نے ''بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ'' اور ''رُخصتِ دائمی'' جیسی المیہ شاعری یادگار چھوڑی ہے۔

اختؔر کا ہر شعر کسی نہ کسی سانحہ سے وابستہ ہے اور اُن کی زندگی جن حالات وسوانح سے گزرتی گئی اُن ہی کے سانچے میں اُن کی شاعری بھی ڈھلتی گئی۔آخری دور ارمانوں کی پامالی پر مشتمل ہے۔اس عہد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ے شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو کتنے ہی ابر باغ پہ چھا کر چلے گئے
ے بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں برسوں کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں برسوں
ے پلادے جتنی چاہے اب تو مہماں ہیں کوئی دن کے جرس کا شور گونجا کارواں تیار ہے ساقی
ے قرار چھین لیا، بے قرار چھوڑ گئے بہار لے گئے، یادِ بہار چھوڑ گئے
ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا وہ عمر بھر کے لیے اشکبار چھوڑ گئے
نگاہِ درد کی عرضِ حزیں قبول نہ کی ہمیں وہ غم زدہ و دل فگار چھوڑ گئے
اُمید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل اُمید و شوق کہاں، اِک مزار چھوڑ گئے

اختر کو اپنی زندگی میں پانچ عظیم حوادث سے سابقہ پڑا۔ سلمیٰ کی جدائی، اپنے چھوٹے بچّہ کی موت، شیون کی خودکُشی، والد کی وفات اور سب سے آخر میں اُن کے عزیز داماد نظیر الدّین کی ٹونک میں رود بناس میں غرقابی جس پر اُنھوں نے حسبِ ذیل قطعہ کہا: ے

ہے غرق ظلمتِ یاس آسماں آج مہِ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے اجل ڈوبا نظیر الدین جواں آج

۱۳۲۲ھ

اِن تمام حوادث پر گھر والوں کا عتاب، دوستوں کی سرد مہری اور لاہور کی جدائی مستزاد تھی۔ یہ تھے اختر کے مصائب اور اِن سب کا علاج آپ نے شراب تجویز کر رکھا تھا۔

تقسیم سے کچھ مُدت پہلے اختر کے والدِ محترم حافظ محمود شیرانی اپنی مدتِ ملازمت ختم کر کے اہل وعیال کو ہمراہ لے کر ٹونک روانہ ہوئے تو اختر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ لاہور کی یاد میں ہمیشہ بے قرار رہے۔ ہر خط جو ٹونک سے آتا اس میں لاہور کی جدائی کا مرثیہ ہوتا۔ وہ لاہور آنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اور اِس اثناء میں جو خطوط اُنھوں نے دوستوں کو لکھے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک میں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لاہور آنے سے پہلے کئی بار ان کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے ''نگار'' کے ''غزل گو شعراء'' نمبر میں لکھا کہ:

’’ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شائع کرنے کا موقع ملے گا۔‘‘

مرنے سے چھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک لاہور آ گئے اور فرمانے لگے کہ بس اب لاہور ہی میں رہوں گا۔ میں نے نیرّ منزل کے نیچے کا کمرہ اُن کے لیے کھلوا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اس میں باقاعدہ مقیم ہو گئے۔

اِس بار بھی اُن کے بسر اوقات کا عالم وہی تھا یعنی رات دن پینا۔ دن کو بالعموم غائب رہنا آدھی رات کو آنا۔ خود جاگنا اور دوسروں کو جگانا:

خاقانی راد گرشب آمد

اِس اثناء میں گاہے ایسا بھی ہوا کہ عالم نشہ و کیف میں باہر نکلتے اور سلمیٰ کے محلّہ کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آجاتے۔ اس مرتبہ اختر مصائبِ حیات سے کچھ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس قدر رقیق القلب ہو چکے تھے کہ اکثر بات بات پر رو دیتے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اکثر بیوی بچّوں کو یاد کرتے اور اپنی بے اعتنائیوں کا گلہ کرتے۔

پھر اِس اثناء میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اپنی تصویریں بہت زیادہ کھنچواتے اور سب میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ میں اِس بار اپنی تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔ ان چیزوں کے علاوہ اُس دور میں ایک خاص چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ پر عشقِ رسولؐ کا غلبہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں آپ نے بہت سی نعتیں لکھیں جو آپ کے آخری مجموعہ کلام ’’شہرود‘‘ میں درج ہیں

لیل و نہار اِسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن آپ پر ردِّ عمل کی کیفیت زیادہ طاری ہو گئی جس کے نتیجے میں نسیان و تہوع کی حالت بڑھ گئی۔ قبض شدید ہو گیا۔ جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردی چھا گئی۔ مجبوراً میں نے اُنھیں میو ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو چند روز ٹھیک رہے۔ لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔۔۔ اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر ہی میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو

آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دُشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر لیا۔۔۔۔آہ

مَیں مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرع تھا: ؎ ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش

شاعر نے یہ کہا اور بزمِ میکدہ سُونی ہو گئی۔ ۱۱ ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے نیّر منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لیے گورستان لے جا رہا تھا کہ اختر کی بھولنے والی کو اختر یاد آیا۔ راستہ میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اُس کا آخری دیدار کیا۔۔۔۔اور اس کے بعد شہرستانِ علم و اَدب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لیے سپردِ خاک کر دی گئی۔

(نقوش شخصیات نمبر جلد دوم، اکتوبر 1956ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁

کتابیات

1 احمد ندیم قاسمی،''میرے ہم قدم''لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2007ء

2 ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی،''اُردو اَدب، ماحولیاتی تناظر''لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2022ء

3 جاوید اختر بھٹی،''20 معروف ادبی شخصیات''لاہور، برائٹ بُکس،2006ء

4 حزیں کاشمیری،''کہاں گئے وہ لوگ''لاہور، اِدارہ کتاب گھر،2005ء

5 خادم حسین بٹالوی،''اختر وسلمیٰ کے خطوط''،لاہور، آئینہ ادب،1957ء

6 رئیس احمد جعفری،''دید وشنید''، کراچی، رئیس احمد جعفری اکیڈمی، اشاعت دوم،1987ء

7 سعادت حسن منٹو،''گنجے فرشتے''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،2009ء

8 شورش کاشمیری،''قلمی چہرے''، کراچی، مجلسِ یادگار شورش کاشمیری،1999ء

9 شوکت تھانوی،''شیش محل''، لاہور، اُردو بُک سٹال،1944ء

10 صادق الخیری،''آسماں کیسے کیسے''، کراچی، شہناز بُک کلب،1987ء

11 صادق الخیری،''نایاب ہیں ہم''، کراچی، شہناز بُک کلب،1983ء

12 ضیا ساجد مرتب،''منتخب شاہکار شخصی خاکے''، لاہور، مکتبہ القریش،1992ء

13 محمد طفیل،''جناب''، لاہور، ادارہ فروغِ اُردو،1961ء

14 عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں، چند اَثرات''، لاہور، آئینہ ادب،1969ء

15 ڈاکٹر عبدالسلام خورشید،''وے صورتیں الٰہی''لاہور، قومی کتب خانہ،1976ء

16 فخر بخاری،''مجموعہ گلہائے تاریخ''لاہور، اظہار سنز،2019ء

17 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب،1966ء

18 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی مرتب،''مکاتیب حافظ محمود شیرانی''، مجلسِ یادگارِ حافظ محمود شیرانی،1981ء

19 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،
1993ء

20 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی مرتب،''جادۂ نسیاں''از حکیم سید محمود احمد برکاتی، لاہور، کتاب سرائے،2009ء

21 ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،لاہور،القا پبلی کیشنز،لاہور،2011ء

22 میرزا ادیب،''ناخن کا قرض''،لاہور،امتزاج پبلی کیشنز،1981ء

23 نصراللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،کراچی،مکتبہ تہذیب وفن،1984ء

24 حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ واختر''،لاہور،کتاب خانہ نورس،1950ء

25 ڈاکٹر محمد یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،کراچی،انجمن ترقی اُردو،1976ء

26 ڈاکٹر محمد یونس حسنی مرتب،''کلیاتِ اختر شیرانی''،لاہور،الحمد پبلی کیشنز،2017ء

رسائل

1 ''ماہِ نو'' کراچی، جنوری 1949ء

2 ''نقوش''،مکاتیب نمبر،جلد دوم،نومبر 1957

3 ''نقوش''،شخصیات نمبر،جلد دوم،مدیر محمد طفیل،لاہور،اکتوبر 1956ء

4 ''نقوش''،آپ بیتی نمبر، مدیر محمد طفیل،جون 1964ء

5 ''مرغزار''،گورنمنٹ کالج شیخوپورہ،اپریل 1975ء

6 سہ ماہی''سورج''،لاہور،مدیر تسلیم احمد تصور،سالنامہ،اکتوبر تا دسمبر،جلد 35،شمارہ 2،2008ء

7 ''مرغزار''ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نمبر،شیخوپورہ گورنمنٹ کالج(2020-2021ء)

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اگر اے نسیمِ سحر ترا ہو گزر دیارِ حجاز میں
مری چشمِ تر کا سلام کہنا حضورِ بندہ نواز میں

تمہیں حدِ عقل نہ پا سکی فقط اتنا حال بتا سکی
کہ تم ایک جلوہء راز تھے جو نہاں ہے رنگِ مجاز میں

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی، نہ متاعِ امن و اماں ملی
جو دوائے دردِ نہاں ملی، تو ملی بہشتِ حجاز میں

عجب اک سُرور سا چھا گیا مری روح و دل میں سما گیا
ترا نام ناز سے آ گیا مرے لب پہ جب بھی نماز میں

کروں نذر نغمہء جاں فزا میں کہاں سے اخترِ بے نوا
کہ سوائے نالہء دل نہیں مرے دل کے غمزدہ ساز میں

اختر شیرانی

غزل

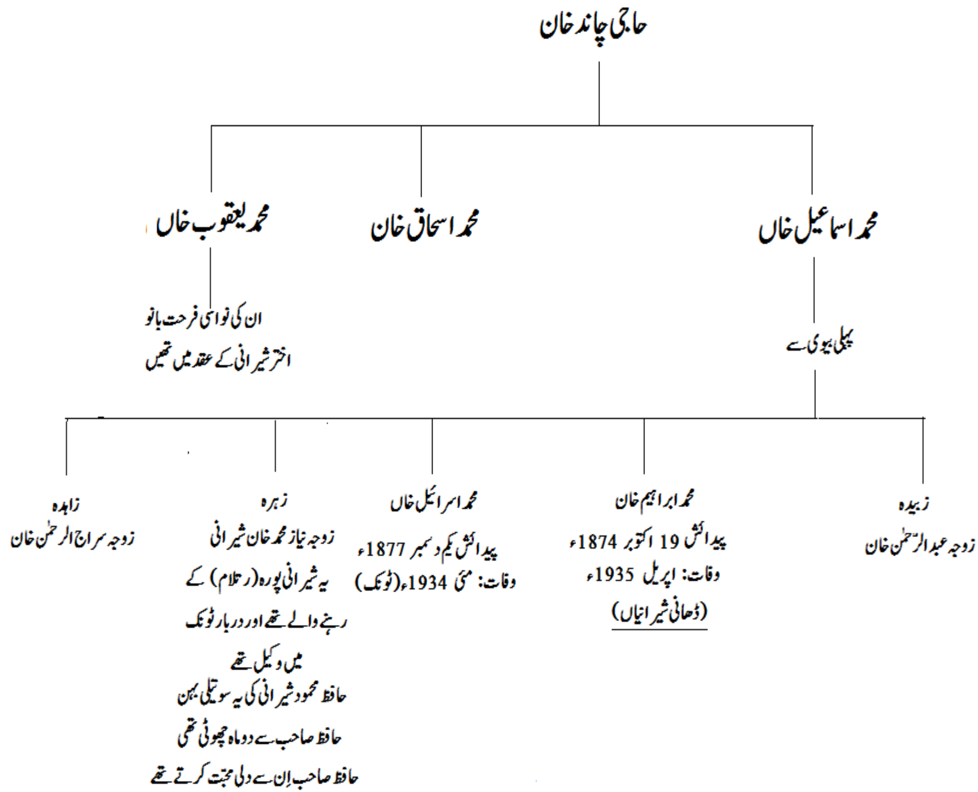
اختر شیرانی

کیا کہہ گئی کسی کی نظر کچھ نہ پوچھئے
کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر کچھ نہ پوچھئے

وہ دیکھنا کسی کا کنکھیوں سے بار بار
وہ بار بار اس کا اثر کچھ نہ پوچھئے

رو رو کے کس طرح سے کٹی رات کیا کہیں
مر مر کے کیسے کی ہے سحر کچھ نہ پوچھئے

اخترؔ دیارِ حسن میں پہنچے ہیں مر کے ہم
کیوں کر ہوا ہے طے یہ سفر کچھ نہ پوچھئے


حاجی چاند خان
محمد اسماعیل خاں
محمد اسحاق خان
محمد یعقوب خاں
ان کی نواسی فرحت بانو
اختر شیرانی کے عقد میں تھیں
پہلی بیوی سے
زبیدہ
زوجہ عبدالرحمٰن خان
محمد ابراہیم خان
پیدائش 19 اکتوبر 1874ء
وفات: اپریل 1935ء
(ڈھانی شیرانیاں)
محمد اسرائیل خاں
پیدائش یکم دسمبر 1877ء
وفات: مئی 1934ء (ٹونک)
زہرہ
زوجہ نیاز محمد خان شیرانی
یہ شیرانی پورہ (رتلام) کے
رہنے والے تھے اور دربار ٹونک
میں وکیل تھے
حافظ محمود شیرانی کی یہ سوتیلی بہن
حافظ صاحب سے دو ماہ چھوٹی تھی
حافظ صاحب اِن سے دلی محبت کرتے تھے
زاہدہ
زوجہ سراج الرحمٰن خان

D 5/17/2024 12:11 AM PAGE 285 (1,1)

محمد اسماعیل خان

دوسری بیوی سے

- محمد محمودخاں (حافظ محمود شیرانی)
  ان کا پہلا نام محمد میکائیل خان
  پیدائش : 5 اکتوبر 1880ء
  وفات: 15 فروری 1946ء ٹونک
- محمد مسعود خان
  پیدائش: 3 نومبر 1883ء
  وفات: مئی 1956ء
  نواب شاہ (سندھ)
- محمد مودود خاں
  پیدائش: 25 دسمبر 1886ء
  وفات: اکتوبر 1956ء (ٹونک)
  - علی گوہر خاں شیرانی
    داداجان نوید محمود شیرانی
    (سُسر پروین اختر)
- محمد مقصود خاں
  پیدائش: 3 نومبر 1891ء
  وفات: اکتوبر 1940ء
  (ٹونک)
- محمد داؤد خاں
  پیدائش: 18 جولائی 1895ء
  وفات: یکم اکتوبر 1900ء (ٹونک
- محمد مشہود خاں
  پیدائش:
  15 جولائی 1899ء
  وفات: ـــــ؟

حافظ محمود شیرانی

حافظ صاحب نے بھی دو شادیاں کیں

- زوجہ اوّل حمیدہ
  وفات: 6 جولائی 1957ء
  بمطابق ۸ ذوالحجہ ۱۳۷۶ھ
  دورانِ حج منیٰ کے مقام پر انتقال ہوا
  - محمد داؤد خان
    (اختر شیرانی)
    تاریخی نام: مسعود خسرو
    پیدائش: 4 مئی 1905ء (ٹونک)
    وفات: 9 ستمبر 1948ء لاہور
  - محمد حامد خان
    پیدائش: 22 دسمبر 1914ء
    وفات: 28 مارچ 1915ء
  - بیٹی
    پیدائش: 16 دسمبر 1918ء
    وفات: 25 مارچ 1928ء
  - بیٹی
    پیدائش: 1919ء
    چندماہ کی عمر میں وفات پائی
- زوجہ دوم خدیجہ بیگم
  ان سے کوئی اولاد نہیں
  وفات: 16 اکتوبر 1984ء
  شیخوپورہ

محمد داؤد خاں (اختر شیرانی)

زوجہ: حرمت بانو (شادی دسمبر 1926ء
حرمت بانو کا انتقال یکم دسمبر 2004ء شیخوپورہ

پروین اختر
زوجہ علی گوہر خان شیرانی
اختر شیرانی کے حقیقی چچا محمد مودود خان
کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ حافظ محمود شیرانی
پروین اختر کو قمر کہہ کر پکارتے تھے۔
وفات: 27 جنوری 2006ء
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے تاریخ کہی
چوں خواہر بزرگم پروین بنتِ اختر
رفت از جہاں بحکمِ ربِ بزرگ و برتر
با اشک و آہ مظہر سالِ وفات گفتہ
ابدالآباد ماند اندر جناں خوشتر
2006ء

مشمولہ: مجموعہ گلہائے تاریخ صفحہ 75

جاوید محمود (زبور اختر)
پیدائش: 13 نومبر 1931ء
بچپن میں انتقال ہوا

نسرین اختر
پیدائش: یکم جولائی 1933ء
نسرین کو حافظ صاحب "حسن" کہا کرتے
تھے۔ نسرین اختر کی پہلی شادی نظیر الدین
خان شیرانی سے 22 اگست 1947ء کو
ہوئی، مگر شادی کا چالیس روز گزرے تھے کہ
29 ستمبر 1947ء کو نظیر الدین دریائے بناس
میں ڈوب کر وفات پاگئے۔ اختر شیرانی نے قطعۂ تاریخ کہا

ہے غرقِ ظلمت و یاس آسماں آج
مہ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
"اجل ڈوبا نظیر الدین جواں آج"
۱۳۶۶ھ
مشمولہ مجموعہ گلہائے تاریخ۔ صفحہ 22

نسرین اختر کا عقدِ ثانی خورشید احمد خاں
یوسفی سے ہوا جو مکتبہ حسن سہیل لاہور
کے مالک تھے۔ اُن کا انتقال ۲۰ فروری
۱۹۹۷ء کو لاہور میں ہوا۔

مظہر محمود شیرانی
تفصیل اگلے صفحے پر

مرغزار مظہر محمود شیرانی نمبر
گورنمنٹ کالج شیخوپورہ
(2020–2021)

تاثیر محمود

مظہر محمود شیرانی (محمد خوشنود خان)

پیدائش: 9 اکتوبر 1935ء (تحصیل شیرانی آباد)

وفات: 12 جون 2020ء تدفین: چک نمبر ۱۰، شرق پور روڈ، ضلع شیخوپورہ

تاریخی نام: بختیار عالم (۱۳۵۴ھ)

شادی 16 جون 1964ء کو لاڑکانہ میں عظمت اللہ قریشی کی دختر نرگس سے ہوئی۔ اللہ نے چار بیٹیاں عطا فرمائیں۔ نرینہ اولاد نہیں ہے۔

ڈاکٹر خضر نوشاہی، پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی، تنویر پھول اور نجم رضوی نے قطعاتِ تاریخِ وفات لکھے۔

زیب فضا مظہر محمود

1441ھ

حضرتِ مظہر شیرانی بھی — چل دیے سوئے دیارِ جنت

سالِ ترحیل یہ نکلا کہ ہوا — آج محبوب غریقِ رحمت

2020ء

مشمولہ "مرغزار" گورنمنٹ کالج شیخوپورہ۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نمبر، 2021-2020ء، ص 356

جلیس عقلا مظہر شیرانی

2020ء

معدنِ علم مظہر شیرانی

2020ء

تاثیر محمود خان (محمد بہبود خان)

پیدائش: 9 اکتوبر 1943ء

وفات: 9 جنوری 1980ء

تاریخی نام: اختیار سلطان

۱۳۶۲ھ

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے تاریخ کہی

طبع یہاں بے فراغ، قلب یہاں ناصبور

عقل یہاں بے فروغ، عقل یہاں بے حضور

بندہ ہے زار و زبوں، خاک ہے دُنیائے دوں

اس کا مزہ بے ثبات، اس کا نشہ بے سرور

عالمِ بے رنگ میں دل نہ ترا لگ سکا

تجھ کو لبھا لے گئے جنت و حور و قصور

ترا مقدر رضا، میرا مقدر رضا

کیا ہے حیاتِ جہاں "اِلّا متاع الغرور" 1980ء

مشمولہ مجموعہ گلہائے تاریخ، ص 39

شجرہ کی تکمیل کے لیے محترم نوید شیرانی، نواسہ اختر شیرانی کا شکر گزار ہوں (مرتب)